قدیم رشتہ
محی الدین نواب

اگر آپ اس راستے سے حسبِ معمول گزرتے ہیں یا آپ کوئی بھولے بھٹکے مسافر ہیں اور اس عمارت کی کھڑکی کے نیچے سے گزرتے وقت آپ نے اس پلاسٹک کے تھیلے کو اٹھا لیا ہے اور اس میں سے میری اس تحریر کو نکال کر پڑھنا شروع کر دیا ہے تو آپ سے درخواست ہے کہ اس داستان کو آخری صفحے تک ضرور پڑھیں۔ کیونکہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، اسے آپ کی عقل تسلیم نہیں کرے گی البتہ اسے پڑھنے کے بعد جب آپ کے دل و دماغ میں تجسس پیدا ہوگا اور آپ سچ کی نقاب کشائی کے لئے اس عمارت کے اندر تشریف لائیں گے تو مجھے دیکھتے ہی میری داستان کی سچائی کو تسلیم کر لیں گے۔

اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ میں کون ہوں؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں تو خواہ مخواہ اس داستان میں غیر ضروری طوالت آجائے گی۔ بس آپ اتنا سمجھ لیں کہ ہر انسان کی طرح میرے بھی ماں باپ تھے، اعلیٰ خاندان تھا۔ اب میں بالکل تنہا ہوں۔ ہر فکر و غم سے آزاد ہوں۔ نہ کسی کا ہمدرد ہوں نہ کسی کی ہمدردی کا محتاج ہوں، روزگار کی فکر نہیں ہے۔ ضرورت کے مطابق کوئی سا بھی دھندا کر لیتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت ہو تو کسی ضرورتمند سے معقول معاوضہ لے کر اُس کے دشمن کو ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔ اس شہر کے بدمعاش مجھے ٹائیگر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہماری دنیا کا دستور ہے کہ جتنا بڑا بدمعاش ہو، وہ اتنا ہی زیادہ شریف آدمی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی میں میری بڑی عزت ہے۔ میں اس عزت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ کسی شدید ضرورت سے مجبور ہو کر جرائم پر آمادہ ہو جاتا ہوں ورنہ اونچی سوسائٹی کی دل پھینک حسینائیں مجھ پر مہربان ہوتی رہتی ہیں اور میرے اخراجات برداشت کرتی ہیں۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔ یہ تو دل والیوں کے فیصلے ہیں کہ مجھ میں ایسا مردانہ حسن ہے، جو مقناطیس کی طرح ان کے نازک دلوں کو کھینچ لیتا ہے۔

جس مرد کے اطراف عورتیں رنگین تتلیوں کی طرح اُڑتی ہوں، وہ کبھی عاشقِ صادق

نہیں ہوتا۔ کسی ایک کے لئے ٹھنڈی آہیں نہیں بھرتا لیکن میں خلافِ قاعدہ عشق میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اچانک ہی میری زندگی میں آ گئی۔ میں اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس عمارت میں آنے سے پہلے میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے مجبور کر دیا کہ میں اس سے محبت کروں، اس کی تمنا کروں اور اس کی جستجو میں اس مقام تک پہنچ جاؤں۔

آپ نے شاید ایسی عجیب و غریب محبت کی داستان کبھی پڑھی ہو گی نہ کسی سے سنی ہو گی اور نہ ہی آپ کا سابقہ ایسی پُراسرار حسینہ سے پڑا ہو گا جو ایک سو سال سے اپنے عاشق کا انتظار کر رہی ہو۔

میں ایسے واقعات پر یقین نہیں کرتا جو عقلی دلائل سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں نانیوں اور دادیوں کی کہانیوں تک محدود ہوں تو اچھی لگتی ہیں لیکن میں ایسی باتیں لکھنے پر اس لئے مجبور ہو گیا ہوں کہ سوئے اتفاق بذاتِ خود ایسی ہی ایک کہانی کا کردار بن چکا ہوں۔ وہ حسینہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ایک صدی سے میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔

میری داستان کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہی ہے کہ میری محبوبہ سو سال پہلے پیدا ہو گئی تھی اور میرے پیدا ہونے اور جوان ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں پیدا ہوا تو کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سو سالہ ایک بوڑھی عورت سے میری تقدیر منسوب ہو جائے گی۔ نہیں، ذرا ٹھہریئے! میں نے یہ غلط کہا کہ وہ بوڑھی ہے۔ اگر وہ بوڑھی ہوتی تو ایک صدی تک اپنی سانسوں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ موت کا ایک اصول ہے کہ وہ کہاں، کس وقت اور کس پر اپنے پنجے مارتی ہے۔ جس طرح مکھیوں کا دستور ہے کہ وہ مٹھاس پر منڈلاتی ہیں یا غلاظت پر بیٹھتی ہیں، اسی طرح موت بوڑھوں پر منڈلاتی ہے یا ایسے بچوں اور جوانوں پر آتی ہے جو جسمانی لحاظ سے بیمار اور کمزور ہوتے ہیں۔ اس دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حسینہ بوڑھی نہیں ہے۔ اسی لئے موت اس کے قریب نہیں آئی۔ وہ جوان ہے اور صحت مند ہے اسی لئے اب تک زندہ سلامت ہے۔ اس کے دل میں جوان آرزوئیں ہیں اور وہ سالہا سال سے میری محبت کی آگ میں سلگ رہی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پندرہ برس کا تھا۔ اس دنیا کو اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے لگا تھا اس وقت اس نادیدہ ہستی نے بذریعہ ڈاک پہلی بار مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ گرمی کی ایک دوپہر تھی میں تیزی سے گردش کرتے ہوئے سیلنگ فین کے سائے میں لیٹا ہوا تھا۔ اتنے میں ڈاکیے نے میرا نام لے کر ایک لفافہ بند دروازے کے نیچے سے کمرے کے

اندر پھینک دیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آج تک کسی نے مجھے خط نہیں لکھا تھا۔ کسی سے اتنے گہرے مراسم نہیں تھے کہ وہ حروف سے مجھے یاد کرتا۔ لہٰذا وہ لفافہ میرے لئے گہرے تجسس کا باعث بن گیا۔ میں اسے فرش سے اٹھا کر اوپر لکھے ہوئے اپنے نام اور پتے کو پڑھنے لگا۔ چونکہ میں تحریر شناسی کا ماہر نہیں ہوں اس لئے لفافہ دیکھ کر مضمون نہ بھانپ سکا۔ میں نے اسے چاک کر کے اندر سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ کسی لڑکی نے اپنے دستِ نازک سے لکھا تھا۔

''میرے جانباز سپاہی!

پوری ایک صدی گزارنے کے بعد اب جدائی کا عذاب ختم ہونے والا ہے اور ہمارے ملن کی گھڑیاں قریب آ رہی ہیں۔ تم حیرانی سے سوچو گے کہ میں کون ہوں اور یہ کیا لکھ رہی ہوں۔ شاید کسی اور کے دھوکے میں تمہیں مخاطب کر رہی ہوں۔

نہیں، میں دھوکہ نہیں کھا سکتی۔ میں تمہیں اپنی سانسوں کی طرح پہچانتی ہوں۔ موجودہ زمانے میں تمہارا نام اور کردار بدل گیا ہے لیکن تمہاری صورت نہیں بدلی اور جب تم مجھ سے ملو گے تو پھر تمہارا کردار بھی بدل جائے گا اور تم میری محبت میں ایسے عاشق کا کردار ادا کرو گے جس کی مثال رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

فی الحال تمہیں یقین دلانے کے لئے یہ لکھ دوں کہ آج کل تمہارا نام شہزاد ہے۔ یہ خط ٹھیک اسی پتہ پر پہنچے گا، جہاں تم رہتے ہو۔ اب تم پندرہ برس کے ہو چکے ہو۔ مگر عشق و محبت کے معاملے میں تمہارا ذہن ابھی کچا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسی کچی عمر میں کوئی ایسی ویسی لڑکی تمہارے قریب آئے، تمہیں محبت کا فریب دے اور اس کے نتیجے میں تم محبت سے بیزار ہو جاؤ۔ بیزاری کا مطلب یہ ہو گا کہ تمہیں میری وفاؤں کا بھی یقین نہیں آئے گا۔

محبت ایک ایسی نعمت ہے جس سے صرف بدنصیب بیزار ہوتے ہیں۔ وقتی طور پر جذبات میں بہہ جانے کا نام محبت نہیں ہے۔ میری محبت وقتی نہیں ہے، پوری ایک صدی کا احاطہ کرتی ہوئی اس تحریر کی صورت میں تمہارے پاس آ پہنچی ہے۔

آج تم اپنے ہاتھوں میں یہ تحریر دیکھ رہے ہو، کل اپنے بازوؤں میں مجھے دیکھو گے لیکن ابھی وہ کل ذرا دور ہے۔ تمہاری موجودہ عمر کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی کمسن ہے بالم، جواں ہونے دے۔ تمہیں کمسن کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بوڑھی ہوں۔ نہیں، اگر مجھ پر بڑھاپا آتا تو بڑھاپے کے بعد موت بھی آ جاتی۔ عمر کے آگے بڑھتے رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان موت کی طرف بڑھتا رہتا ہے لیکن میں تمہارے بغیر مرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے عمر کی ایسی منزل پر ٹھہر گئی ہوں، جہاں کوئی مجھے بوڑھی نہیں کہہ سکتا۔ تم بھی مجھ سے ملنے اور مجھے دیکھنے کے بعد میری صحیح عمر کا تعین نہیں کر سکو گے۔

میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ میں ابھی تمہارے پاس آ جاؤں مگر کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ اپنی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ مجھے دیکھنے سے پہلے تمہارے دل میں میرے لئے وہی شدید محبت پیدا ہو جائے، جس محبت کی خاطر تم سو سال پہلے اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔

میرے جانباز سپاہی! اُس گزرے ہوئے وقت کو یاد کرو۔ اپنی سوچ کو اُس دور میں لے جاؤ، جہاں ہم وصال و فرقت کے کتنے ہی پیار بھرے اور درد بھرے لمحات گزار چکے ہیں۔ چشمِ تصور میں میرا دھندلا سا خاکہ بھی آئے تو شوقِ دید سے میری تصویر مکمل کر لو۔ اسے دیکھو اور دیکھتے رہو اور میری تمنا کرتے رہو۔ فقط

تمہاری ایک تاریخی محبت

سُوسن رابرٹ عرف مہ لقا''

میں خط پڑھ کر سوچنے لگا کہ وہ کون لڑکی ہے جو مجھ سے ایسا مذاق کر سکتی ہے۔ اس وقت وہ خط میرے لئے ایک مذاق ہی تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات تھی کہ کوئی عورت سو سال سے میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے میری صحیح عمر بتائی تھی۔ ان دنوں میں پندرہ برس کا تھا لیکن اس کے خیال کے مطابق کچے ذہن کا لڑکا نہیں تھا۔ اتنی سی عمر میں، میں دو بار جیل خانے میں سرکاری مہمان رہ کر آ گیا تھا۔ رات کو گشت کرنے والا سپاہی کھڑکی سے جھانک کر میری حاضری لیا کرتا تھا اور مطمئن ہو کر چلا جاتا تھا کہ میں کسی واردات کے

لئے اپنے مکان سے غیر حاضر نہیں ہوں۔

میں نے اس خط کو بار بار پڑھا اور یہ پڑھ کر بار بار غصہ آیا کہ وہ مجھے کمسن بچہ سمجھتی ہے۔ اس کی ایسی کی تیسی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو میں اسے اچھی طرح بتا دیتا کہ میں بچہ ہوں یا وقت سے پہلے جوان ہو چکا ہوں۔ ویسے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس نے ایسی آفاقی و تاریخی محبت کا خط لکھ کر مجھ پر نفسیاتی اثر ڈالا تھا۔ میری کچی جوانی کے دھندلے دھندلے سے جذبات کو رومانس کی طرف موڑ دیا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اسے دل و دماغ سے نکال دینے کے باوجود بے خیالی میں بے اختیار اس کے متعلق سوچتا چلا گیا۔ اکثر نیند کی حالت میں یوں لگتا تھا جیسے صدیوں پرانی بھٹکنے والی محبت کی پیاسی روح سفید ریشمی لباس پہنے میری خوابگاہ میں آ گئی ہے اور مجھے محبت کے آداب سکھا رہی ہے۔

میں کچھ عرصے تک خیالی محبت میں کھویا رہا۔ کئی بار میں نے سوچا، کیا واقعی سو سال پہلے میں سوسن نامی کسی انگریز لڑکی کا محبوب تھا جس کا نام مہ لقا بھی تھا؟ لیکن میرے ذہن نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ چشمِ تصور میں کتنی ہی حسین لڑکیوں کے چہرے آئے۔ ہر چہرے پر یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ سوسن کا حسین مکھڑا ہے مگر اس مکھڑے کی جگہ جلد ہی کسی دوسرے چہرے کا گلاب کھل جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھ پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔ میں ہر روز اس کے دوسرے خط کا انتظار کرتا تھا لیکن خط نہیں آیا۔ راہ چلتے ہر نوجوان اور حسین لڑکی مجھے سوسن نظر آتی۔ میں سوچتا یہی ہے وہ اور ابھی وہ میرے قریب آئے گی مگر وہ قریب سے گزر کر چلی جاتی اور میں اپنی دیوانگی پر جھلا کر رہ جاتا۔

پھر ایک دن میں نے اس پُراسرار حسینہ کے خط کو کھول کر پڑھا تو اس میں لکھی ہوئی تاریخ پڑھ کر اپنی حماقت پر اور جھنجھلا گیا۔ خط میں پہلی اپریل کی تاریخ تھی۔ کسی نے اپریل فول منانے کی خاطر مجھے بے وقوف بنایا تھا۔

میں نے غصے سے اس خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر رومانس کے لئے جو چاہت جاگی تھی، اس کی کمی پوری کرنے کے لئے میں دوسری عورتوں سے دلچسپی لینے لگا۔ ایک سال بعد پھر اسی طرح ایک لفافہ موصول ہوا۔ لفافے پر لکھا ہوا نام اور پتہ پڑھ کر میں نے پہچان لیا کہ یہ اسی عیار حسینہ کا فراڈ نامہ ہے۔ میں نے فوراً ہی ماچس کی تیلی سلگا کر اسے پڑھے بغیر نذرِ آتش کر دیا۔ کیونکہ وہ دوسرا خط دوسرے سال کی پہلی اپریل کو آیا تھا۔

تیسرے سال بھی اسی ماہ، اسی تاریخ کو تیسرا خط آیا۔ اس بار میں نے ڈاک خانہ کی مہر کو پڑھا تو پتہ چلا کہ وہ اسی شہر سے آتا ہے۔ میں نے اسے بھی جلا ڈالا اور یہ ارادہ کرلیا کہ اس اپریل فول منانے والی کو ضرور تلاش کروں گا۔ وہ یقیناً مجھے اچھی طرح جانتی ہوگی، کہیں نہ کہیں مجھ سے ملتی ہوگی یا میرے سامنے سے گزرتی ہوگی۔ میں اس کی کسی حرکت سے یا اس کی کسی غلطی سے اسے پکڑنے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ ہتھے چڑھ گئی تو اُس فول بنانے والی کو پھول بنا کر مسل ڈالوں گا۔

میں ان عورتوں کی حرکات کا بغور جائزہ لینے لگا جو میری تنہائیوں میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ انہیں بھی بارہا آزمایا جو محبوبانہ انداز میں مجھ سے لفٹ لینے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں لیکن میری کوششیں رائیگاں گئیں۔ میں اس اپریل فول منانے والی کی پرچھائیں تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شرارت کرنے والی سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ جو چیز حاصل نہ ہوسکے، انسان اس کے لئے زیادہ تڑپتا ہے۔ وہ جلوہ جو اسراریت کے پردے میں چھپا ہوا ہو، اسے بے نقاب کرنے کی ضد بڑھتی جاتی ہے۔ میری بھی ضد بڑھتی گئی تو بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس طرح وہ میرے خیالوں کا مرکز بن گئی ہے۔ میری ہر سوچ گھوم پھر کر اسی کی خیالی تصویر پر آ کے ٹھہر جاتی تھی۔ چالاک عورت ہمیشہ چور راستوں سے اپنا جادو جگاتی ہے۔

اس وقت تو میں پچیس برس کا گبھرو جوان بن چکا تھا اور وہ خیالی محبوبہ میرے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔ اس سال پہلی اپریل کو اس کا خط آیا تو میں نے اسے نذرِ آتش نہیں کیا بلکہ ایک عرصے کے بعد اسے کھول کر بڑی چاہت سے پڑھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میرے محبوب!

یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں تمہیں بلا رہی ہوں اور تم نہیں آ رہے ہو۔ پچھلے خط میں، میں نے اپنا نام اور پتہ لکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم میری موجودہ رہائش گاہ کا علم ہوتے ہی میرے پاس دوڑے چلے آؤ گے لیکن تم نہیں آئے اور میری آنکھیں انتظار کرتے کرتے آنسوؤں سے بھیگتی رہیں۔

اس بار بھی قوی امید ہے کہ تم آؤ گے۔ اگر میرا پچھلا خط تمہیں موصول

نہیں ہوا ہے یا وہ ضائع ہو چکا ہے اور تمہاری یادداشت میں میرا پتہ محفوظ نہیں ہے تو میں دوبارہ اپنا پتہ لکھ رہی ہوں تم یہ خط پڑھتے ہی فوراً چلے آؤ۔ اب نہ آئے تو میں مرجاؤں گی۔

میرے مکان کا نمبر ۴۲۱ ہے۔ یہ مکان محسن روڈ کے بائیں طرف رام گلی میں ہے لیکن یہاں آنے سے پہلے چند ضروری باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔ ان دنوں میں ایک شریف گھرانے میں پرورش پا رہی ہوں۔ میرے موجودہ والدین صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے پردے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تم یہاں آ کر براہِ راست مجھ سے ملاقات نہیں کرسکو گے۔ میرے والدین یہ کبھی پسند نہیں کریں گے کہ میں کسی نامحرم کے سامنے جاؤں یا پردے میں رہ کر گفتگو کروں۔

اتنی پابندیوں کے باوجود میں کوشش کروں گی کہ تم مجھے ایک بار ضرور دیکھ لو۔ تم مکان کے سامنے آؤ گے تو میں دروازے یا کھڑکی تک آنے کا کوئی بہانہ تلاش کروں گی۔ اگر کوئی بہانہ کام نہ آیا تو تم آدھی رات سے پہلے مکان کے پچھلے دروازے پر آنا۔ وہ دروازہ کھلا رہے گا اور میں تمہاری منتظر رہوں گی۔

میں ہر سال مارچ کی اکتیس تاریخ کو خط لکھتی ہوں تا کہ پہلی اپریل کو تمہیں خط مل جایا کرے۔ اس وقت جبکہ یہ خط تمہارے ہاتھوں میں ہوگا تو اپریل کی پہلی تاریخ ہوگی اور یہ میری پیدائش کا دن ہے۔ اگر تم آدھی رات سے پہلے اس پتہ پر نہ پہنچ سکے تو پھر آئندہ سال کی پہلی اپریل سے پہلے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ تم میرے موجودہ پتہ پر مجھے کبھی نہیں پاؤ گے۔

میری دعا ہے کہ یہ خط تمہیں آج ہی مل جائے اور تم آج ہی آدھی رات سے پہلے ملنے چلے آؤ۔

آجاؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔''

تمہاری بھولی ہوئی محبت

سوسن را برف عرف مہ لقا

موجودہ نام بلقیس بیگم"

خط پڑھنے کے بعد میں نے مکان کے نمبر، سڑک اور گلی کے نام کو دوبارہ توجہ سے پڑھا۔ پھر اسے تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ اب میں جلد سے جلد اس پتے پر پہنچنا چاہتا تھا اگرچہ اس وقت دوپہر تھی۔ سوسن عرف مہ لقا یا موجودہ بلقیس کے دیدار کی توقع نہیں تھی۔ پھر بھی میں وہ مکان دیکھ لینا چاہتا تھا تاکہ آدھی رات سے پہلے پچھلے دروازے تک پہنچنے کا راستہ معلوم کرسکوں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر آئینہ دیکھا تو میرا حلیہ بالکل لوفروں کی طرح تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے شیو بڑھا ہوا تھا گلے میں چھینٹ کا مفلر بندھا ہوا تھا جسم پر قمیض اور پتلون بھی بس یونہی سی تھی۔ ایسی حالت میں اپنی تاریخی محبوبہ کو بھلا کیسے متاثر کرسکتا تھا؟

میں فوراً ہی غلسخانے میں جا کر شیو کرنے لگا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا رکھا تھا تاکہ کمرے میں میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس پر نظر پڑتی رہے۔ اس وقت تین بج چکے تھے۔ جب میں نے غسل کر کے لباس بدلنے کے بعد وقت دیکھا تو چار بج رہے تھے۔ موجودہ بلقیس کے خط کے مطابق سوسن سے ملاقات کرنے کے لئے ابھی آٹھ گھنٹے کی مہلت تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر میں آدھی رات تک وہاں نہ پہنچ سکا تو پھر آئندہ سال کی اپریل تک ملاقات نہیں ہوسکے گی۔

ساڑھے چار بجے میں رام گلی میں مکان نمبر ۴۲۱ کے سامنے پہنچ گیا۔ مکان کے سامنے ایک مسجد تھی مسجد کے ساتھ ہی چائے کی دکان تھی۔ میں وہاں چائے پینے کے بہانے بیٹھ گیا اور مکان کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ دروازے پر بانس کی تیلیوں سے بنی ہوئی چلمن پڑی ہوئی تھی۔ اس کے آر پار نظر نہیں آتا تھا کہ دروازہ کھلا ہے یا بند ہے۔ کھڑکیوں میں دودھیا شیشے لگے ہوئے تھے۔ گھر کے لوگ ان شیشوں کے باہر نہیں دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی باہر والے اندر جھانک سکتے تھے۔ میں دو گھنٹے تک دروازہ یا کھڑکی کھلنے کا انتظار کرتا رہا اور وقفے وقفے سے چائے منگوا کر پیتا رہا۔ اس عرصے میں ایک بار کھڑکی ذرا سی کھلی تھی۔ ایک نازک سا ہاتھ کھڑکی کھولتے وقت نظر آیا لیکن اسی وقت مکان کے کسی دور افتادہ حصے سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔

"بلقیس! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ جلد اِدھر آؤ۔"

"ابھی آئی امی!"

میں نے بلقیس کی مترنم سی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی بند ہوگئی اور میں دیدار کا پیاسا رہ گیا۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ میں پھر اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ وہ دوبارہ دروازے یا کھڑکی تک آنے کا بہانہ تلاش کرے گی لیکن اس دوران اس محلے کے بدمعاشوں تک یہ خبر پہنچ گئی کہ ٹائیگر آیا ہے اور ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے آس پاس چور، بدمعاش، جیب کترے، نقب زن، لاک بریکر اور معاوضے پر قتل کرانے والے کتنے ہی شریف آدمیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سب ہی میرے سامنے بڑھ بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

کسی نے کہا۔ "استاد! آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں اٹھائی۔ آپ حکم دیتے تو بندہ خود ہی حاضر ہوجاتا۔" ایک نے چپکے سے پوچھا۔ "معاملہ کیا ہے؟ اگر آپ نے کسی مالدار اسامی کو تاڑ لیا ہے تو مجھے بتایئے میں اس کے گھر میں جھاڑو پھیر دوں گا۔" ایک بوڑھے اور شاطر بدمعاش نے کہا۔ "سب اپنی اپنی بولے جارہے ہیں، ٹائیگر کو بھی تو کچھ بولنے دو۔ ہاں بھئی ٹائیگر! بتاؤ، اس محلے سے تمہاری کوئی ضرورت پوری ہو اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، یہ ناممکن ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو، بول دو۔ ہم یہاں اسی وقت حاضر کردیں گے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "اس سامنے والے مکان نمبر ۴۲۱ میں کون رہتا ہے؟"

میرا سوال سنتے ہی سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ذرا دیر کے لئے ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو۔ پھر اس بوڑھے نے کہا۔

"ٹائیگر! معلوم ہوتا ہے تم کسی اور کے دھوکے میں یہاں آگئے ہو۔ چار دن پہلے اس مکان میں دوسرا کرایہ دار تھا۔ تم پولیس انسپکٹر شہباز خان کو جانتے ہی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "انسپکٹر شہباز خان اس محلے کی گلی نمبر ۲ میں رہتا ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔ اب انسپکٹر اسی مکان میں منتقل ہوگیا ہے جس پر تم نظریں جمائے بیٹھے ہو۔"

یہ سنتے ہی پھر مجھے یوں لگا کہ کسی لڑکی نے مجھے بیوقوف بنایا ہے وہ محبت بھرے خط لکھتے لکھتے مجھے پولیس انسپکٹر کے مکان تک پہنچانا چاہتی تھی تاکہ میں اس کے گھر کی کسی لڑکی سے (اپنی سو سالہ محبوبہ سمجھ کر) عشق کروں، اس کے گھر کے چکر لگاؤں اور انسپکٹر مجھے

حوالات پہنچادے۔''

اوراس روز اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔اس نے یقیناً اپریل فول منانے کے لئے مجھے بیوقوف بنایا تھا۔فرضی عشق کا چکر چلا کر مجھے پولیس انسپکٹر کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔

میں اندر ہی اندر غصے سے تلملانے لگا۔میں ان بدمعاشوں کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک لڑکی ہر سال مجھے خط لکھ کر اپریل فول مناتی ہے اور مجھ جیسا شاطر بیوقوف بن جاتا ہے۔میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔''ہاں، مجھے غلط اطلاع ملی ہے۔دراصل مجھے اطلاع دینے والے نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔اس نے چار دن پہلے بتایا تھا کہ رام گلی کے مکان نمبر ۴۲۱ میں ایک کنجوس بوڑھی عورت رہتی ہے جس کے پاس اصلی موتیوں کا ہار ہے۔بہرحال میں نے یہاں آنے میں دیر کردی۔''

میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا باتیں بناتا رہا۔پھر کسی طرح ان لوگوں سے پیچھا چھڑا کر وہاں سے چلا آیا۔اس وقت رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا شراب خانے کھل چکے تھے۔میں ایک بار میں آکر بیٹھ گیا۔پھر وہسکی کا آرڈر دینے کے بعد اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔وہ مجھے پچھلے دس سال سے ہر برس پہلی اپریل کو بیوقوف بناتی آرہی تھی۔یہ تو اچھا ہی ہوا کہ پچھلے کئی برس تک میں نے اس کے خطوط نہیں پڑھے۔انہیں جلا کر راکھ کر دیتا تھا۔اس بار پتہ نہیں کیسے مجھ پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا تھا کہ میں اس کے فریب میں آگیا۔

اب میں وہسکی کا ایک ایک گھونٹ لیتا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ کمبخت کون ہے؟ واقعی کوئی لڑکی ہے یا میرا کوئی دشمن جو بڑی خوبصورتی سے محبت میں مبتلا کر کے مجھے جانی یا مالی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔

خط کی تحریر اور تحریر کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے واقعی کوئی لڑکی مجھے خط لکھتی ہے لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی دشمن کسی لڑکی سے لکھواتا ہو۔ایسا ممکن تھا میں نے قسم کھالی کہ اب عشق و محبت کے چکر میں نہیں پڑوں گا اور بڑی خاموشی سے اس پُراسرار ہستی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔وہ ہستی مرد ہو یا عورت، اگر وہ ہاتھ آگئی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

پینے کے دوران بار کی ایک لڑکی میری میز پر آئی لیکن میں نے اسے انگیج نہیں کیا۔اس وقت ہر لڑکی مجھے اپنی دشمن نظر آرہی تھی۔پہلے تو جی میں آیا کہ اس لڑکی کو انگیج کر کے کسی ویرانے میں لے جاؤں اور وہاں اس کے کپڑے اتار کر اتنے ڈنڈے جماؤں کہ وہ ہاتھ جوڑ کر اپریل فول منانے کا اقرار کرلے اور معافی مانگنے لگے لیکن اب اسے کسی ویرانے میں

لے جانے کا وقت نہیں تھا۔رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔مجھے بارہ بجے تک اپنے مکان میں پہنچنا ضروری تھا کیونکہ میرے علاقے کے تھانے سے ایک سپاہی رول کال کے لئے آدھی رات کو آیا کرتا تھا۔اس لئے میں بار سے اٹھ کر باہر آگیا۔

چونکہ ایک لڑکی طویل عرصے سے مجھے بیوقوف بنا رہی تھی اور میں تلاشِ بسیار کے باوجود اس کی گرد کو بھی نہ پاسکا تھا اس لئے شرمندگی مٹانے کی خاطر میں نے بہت زیادہ پی لی تھی لیکن میں اس قدر پینے کا عادی ہوں۔لڑکھڑاتے ہوئے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے اپنے مکان کے احاطے میں پہنچ گیا۔ٹھیک اسی وقت تھانے سے ایک سپاہی میری حاضری لینے آگیا۔اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شہزاد صاحب! معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ پی لی ہے؟''

وہ مجھ جیسے مجرم کو صاحب اس لئے کہتا تھا کہ میں اس کی جیب ہمیشہ گرم رکھتا تھا۔میں نے جیب سے ایک دس کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔''ہاں، اسی لئے پی لی ہے کہ آج رات کہیں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔میں صبح تک ٹھاٹ سے سوتا رہوں گا۔''

اس نے دس کا نوٹ لیتے ہوئے بتیسی نکال کر مجھے سلام کیا۔پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ بارہ بج کر دس منٹ ہوچکے ہیں۔اب وہ تھانے میں میری حاضری لگانے جا رہا ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے پر آیا۔دروازہ ایک ذرا سا کھلا ہوا تھا۔میں وہیں کھڑے ہوکر سوچنے لگا کہ وہ دروازہ کیسے کھل گیا۔میں تالا لگا کر گیا تھا۔یہ روز کا دستور تھا۔میں باہر جاتے وقت دروازے پر تالا ڈال دیتا تھا لیکن اس وقت کنڈی کھلی ہوئی تھی اور تالا غائب تھا۔مجھے خطرے کا احساس ہوا تو میں اپنا چاقو نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالنے لگا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نشہ کی زیادتی کے باعث میرا ہاتھ جیب میں نہیں جا رہا تھا بلکہ جیب کے آس پاس پھسل رہا تھا۔بڑی مشکل سے چاقو نکال کر میں نے دروازے پر سے للکارا۔

''اے اندر کون ہے؟ باہر آؤ''

اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔کمرے میں روشنی تھی۔وہ میرا ڈرائنگ روم تھا۔وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔میں پھر ایک بار للکارتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں آیا۔دروازے پر پہنچتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔

وہاں میرے بستر پر ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ آنکھیں بند کئے سو رہی تھی۔میں

حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اب تک چشمِ تصور میں ایک سو سالہ خیالی دوشیزہ کو دیکھتا آیا تھا۔ اس وقت بھی یہی لگ رہا تھا کہ میں کسی خیالی حسینہ کو اپنے بستر پر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہیں، ایک حقیقت ہے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بستر کے قریب آیا۔ پھر ہولے سے اسے مخاطب کیا۔

''کون ہو تم؟''

وہ بڑے سکون سے سوتی رہی۔ میں نے پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ تاکہ اسے جھنجھوڑ کر اٹھاؤں لیکن میں اسے چھوتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چشمِ تصور میں سارا نشہ ہرن ہو گیا اور میرے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ وہ مر چکی تھی۔

زندہ ہو یا مُردہ میں دور سے ہی پہچان لیتا ہوں کیونکہ میں قاتل ہوں، لاش کی شناخت کر لیتا ہوں لیکن اس وقت نشے میں تھا اس لئے دور سے نہ پہچان سکا۔ قریب آ کر اسے ہاتھ لگاتے ہی سمجھ گیا کہ وہ میرے گھر میں میری شامت بن کر آئی ہے۔

اب تک میں نے اپنے بہت سے جرائم چھپائے ہیں۔ اب تک جتنے قتل کئے ہیں، ان پر بڑی ذہانت سے پردہ ڈالتا آیا ہوں لیکن اس وقت میرا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس لڑکی کی لاش مجھے ایک ناکردہ جرم میں پھانسنے کے لئے وہاں لا کر رکھی گئی تھی۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس لاش کو اپنے گھر سے دور لے جا کر پھینک سکتا ہوں؟

میں نے اس حسینہ کو سر سے پاؤں تک چھو کر دیکھا۔ اس کے جسم پر کہیں زخم نہیں تھا۔ وہ قتل نہیں کی گئی تھی۔ جسم کی رنگت سے بھی پتہ چل رہا تھا کہ اس نے زہر کھا کر خودکشی نہیں کی ہے اور نہ ہی اس کا گلا گھونٹ کر اسے مارا گیا تھا۔ خودکشی یا قتل کے جو اثرات یا نشانیاں مُردہ جسم میں رہ جاتی ہیں۔ میں انہیں بخوبی جان لیتا ہوں۔ اس وقت اس حسینہ کا مُردہ جسم بتا رہا تھا کہ وہ طبعی موت مری ہے۔

مجھے اس حد تک یقین ہو گیا کہ اس حسینہ کے پوسٹ مارٹم کے بعد مجھ پر قتل کا الزام عائد نہیں ہو گا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی یہی کہے گی کہ طبعی موت واقع ہوئی ہے۔ اب جو الزام مجھ پر عائد ہونے والا تھا، وہ یہ کہ میں اس حسینہ کو اغوا کر کے لے آیا تھا۔ پولیس والے کہیں گے کہ میں نے اس لڑکی کو نہ جانے کتنے دنوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ آج اس لڑکی کا انتقال ہو گیا ہے، پھر تفتیش ہو گی۔ لڑکی کے ورثاء کو تلاش کیا جائے گا اور میں خواہ مخواہ

مقدمے بازی میں الجھتا جاؤں گا۔ اس مقدمے کا نتیجہ بھی مجھے معلوم تھا۔ کم از کم دو سال تک جیل کی چار دیواری میں میری زندگی کے قیمتی لمحات ضائع ہوتے رہیں گے۔

میں نے سب سے پہلے گھر کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر دیا تاکہ کوئی اچانک ہی اندر نہ آ جائے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد واپس آیا تو صوفوں کی ایک درمیانی میز پر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اور قلم نظر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ وہ قلم میرا تھا۔ کاغذ میرے لیٹر پیڈ سے نکالا گیا تھا لیکن تحریر سوسن عرف مہ لقا کی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''میرے جنم جنم کے ساتھی!

میں گھر والوں کی آنکھ بچا کر بھاگ آئی ہوں۔ یہاں آ کر دیکھا تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ تم موجود نہیں تھے۔ میں واپس بھی نہیں جانا چاہتی تھی جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں۔ میرا موجودہ نام بلقیس ہے۔ میرے موجودہ والد پولیس انسپکٹر ہیں۔ اتنی سی دیر میں شہر کے تمام تھانوں تک میری گمشدگی کی خبر پہنچ چکی ہو گی اور پولیس والے مجھے تلاش کر رہے ہوں گے میری بلا سے وہ تلاش کرتے رہیں۔ میں تم سے ملنے آئی ہوں اور تمہیں ساتھ لے کر ایسی جگہ جاؤں گی جہاں میں تمام سال چھپی رہتی ہوں۔ آج میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی اسی لئے میں تالا توڑ کر اندر آ گئی ہوں اور دو گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں..........''

اتنا پڑھ کر میں ذرا دیر کے لئے رک گیا۔ مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتی تھی۔ میرے تو یہ پڑھ کر ہوش اُڑ گئے تھے کہ میرے گھر میں پولیس انسپکٹر شہباز خان کی اکلوتی بیٹی بلقیس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اب تو عدالت مجھے جو سزا دیتی، وہ ایک الگ سی بات ہوتی۔ شہباز خان مجھے ایسی ایسی اذیتیں پہنچاتا کہ مجھے زندگی سے موت بہتر نظر آتی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا بیڈ روم میں آیا اور سہمی ہوئی نظروں سے بلقیس کی لاش دیکھنے لگا۔

اس وقت وہ میرے لئے بلقیس ہی تھی۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ سوسن رابرٹ مجھ سے ملاقات کرنے بلقیس کے روپ میں آئی تھی۔ وہ نہیں، کوئی دشمن آیا تھا اور بلقیس کی لاش چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

مجھ پر ہر لمحے بدحواسی طاری ہو رہی تھی۔ حالانکہ قتل و غارت کے سنگین اوقات میں

میرے ہوش و حواس پوری طرح کام کرتے تھے۔ میں اپنی حاضر دماغی سے بڑے سے بڑے جرم پر پردہ ڈال دیا کرتا تھا مگر اس وقت میری کھوپڑی میں برف جم گئی تھی۔ میں لاش کو ٹھکانے لگانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے دل میں یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ شہباز خان مجھ جیسے بدنام مجرم کے مکان کی تلاشی لینے نہ پہنچ جائے۔

ایک خیال آیا کہ گڑھا کھود کر اس کی لاش کو چھپا دوں۔ مکان کے سامنے جو چھوٹا سا لان تھا، وہیں کھدائی ہو سکتی تھی لیکن سامنے سڑک تھی۔ اتنی رات کو وہاں سے کوئی بھی گزرنے والا یہ ضرور سوچتا کہ میں مٹی کیوں کھود رہا ہوں، یا پڑوس والے میری اس حرکت کو نوٹ کر سکتے تھے۔

میں محلے پڑوس والوں کو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بلقیس میری کزن یا کوئی عزیز تھی کیونکہ میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ یہ بات محلے والے بھی جانتے ہیں اور تھانے کچہری والے بھی میرے اگلوں پچھلوں کا پورا ریکارڈ رکھتے ہیں۔

میرے اپنے حالات میرے سامنے تھے اور ان حالات کے پیشِ نظر میں اس لاش کو اپنے مکان کی چار دیواری سے باہر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اگر میں اپنے کمروں کے کسی فرش کو کھود کر اسے دفن کرنا چاہتا تو پختہ فرش کھودنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک سنائی دیتی۔ میں تھک ہار کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوسن رابرٹ کا خط اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں یہ سوچ کر اسے پڑھنے لگا کہ شاید لکھنے والے کی تحریری لغزش سے دشمن کا پتہ چلا سکے۔ میں نے اسے کھول کر جہاں تک پڑھا تھا اس سے آگے پڑھنے لگا آگے لکھا تھا۔

''اب ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں، نہ جانے تم کب آؤ گے۔ میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ آدھی رات کے بعد مجھ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ بارہ بجتے ہی میری روح واپس چلی جائے گی اور بلقیس کا یہ جسم مُردہ ہو جائے گا۔ میں خدا سے دعا مانگ رہی ہوں کہ تم ابھی اور اسی وقت چلے آؤ۔ نہیں آؤ گے تو پھر پورے ایک سال کے بعد پہلی اپریل کو ملاقات ہو گی۔

دراصل مجھ سے ایک زبردست غلطی ہو گئی۔ میں نے تم سے ملاقات کرنے کے لئے بلقیس جیسی پردہ نشین لڑکی کا روپ اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ سے میں پردے سے باہر نہیں آ سکی۔ تمہاری آمد کا انتظار کرتی رہی۔ مجھے

کیا معلوم تھا کہ اس بار بھی میرا خط تمہیں نہیں ملے گا یا ملے گا بھی تو اسے پڑھ کر تم مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے۔ تم کتنے سنگدل ہو۔ آخر میں ہی بلقیس کے والدین کو دھوکا دے کر ان کے گھر سے نکل آئی ہوں۔ آہ! اب پونے بارہ کا وقت ہے اور تم ابھی تک نہیں آئے ہو۔ آ جاؤ میرے محبوب! یہ وقت وصال اور جدائی کے لمحات کی اہمیت کو نہیں سمجھتا۔ یہ وقت گزرتا ہی جاتا ہے اور گزرتا ہی جا رہا ہے۔ میرے ہاتھ سے امید کا دامن چھوٹتا ہی جا رہا ہے اب میں تمہاری خوابگاہ میں جا رہی ہوں۔ وہاں جا کر آرام سے لیٹ جاؤں گی۔ اگر تم ایک منٹ پہلے بھی آ گئے تو تم سے دو باتیں کر لوں گی ورنہ ہمارے نصیب میں سال بھر کی طویل جدائی ہے۔ میں اپنی آئندہ سالگرہ کے دن تم سے ضرور ملوں گی۔

میرے سنگدل شہزادے! آنا ہے تو اب بھی آ جاؤ۔ ورنہ خدا حافظ۔

تمہاری بچھڑی ہوئی محبت

سوسن رابرٹ عرف مہ لقا''

خط پڑھنے کے بعد میں نے اس نادیدہ سوسن رابرٹ کو ہزاروں گالیاں دیں۔ وہ اُلو کی پٹھی ابھی تک خطوط کے ذریعے سو سالہ محبوبہ کا کردار ادا کر رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ میں بیوقوف ہوں اور اس کے ڈرامائی انداز کے خطوط پڑھ کر عشق میں مبتلا ہوتا رہوں گا۔ میرے دل و دماغ میں اب دور دور تک عشق و محبت کا پتہ نہیں تھا۔ میں نے اس خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ دوسرے لفظوں میں سوسن رابرٹ کے خیالی وجود کے ٹکڑے کر دیئے۔

اس کے بعد میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے لئے دماغ سے تمام پریشانیوں کو جھٹک کر سکون سے اس پر غور کرتا رہا۔ پھر میں مستعد ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میری الماری میں ایک تیزاب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے الماری سے نکال کر غسل خانے میں رکھ دیا۔ پھر بلقیس کی لاش کو اٹھا کر وہاں لے آیا۔ اسے غسل خانے کے فرش پر لٹا کر میں نے اپنے منہ اور ناک پر اچھی طرح کپڑا باندھا تاکہ بدبو سے محفوظ رہوں۔ پھر میں بوتل کھول کر اس پر تیزاب ڈالنے لگا۔

تھوڑی دیر میں بوتل خالی ہو گئی۔ لاش کا بیشتر حصہ گل رہا تھا۔ خون اور گوشت پانی کی طرح بہہ کر گٹر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ گوشت کے چھوٹے بڑے قتلے اور ریشے

بھی بہہ رہے تھے۔ اب مجھے حماقت کا احساس ہوا کہ ان کی وجہ سے گٹر بند ہو جائے گا۔ انہیں گلانے کے لئے مزید تیزاب کی ضرورت تھی۔ میں فوراً ہی غسل خانے سے نکل آیا۔ شاور کھلا ہوا تھا میں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ مکان سے باہر آ کر میں نے بیرونی دروازے پر تالا ڈالا، برآمدے سے اپنی موٹر سائیکل نکالی اور دو چار بوتل تیزاب کا انتظام کرنے چل پڑا۔

فضل اسٹریٹ میں میرا ایک واقف کار رہتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کی سائنس لیبارٹری میں مال سپلائی کرتا تھا۔ وہ لیبارٹری کی ضرورت کے مطابق جو مال سپلائی کرتا تھا اس میں سے کچھ بچا کر اپنے گھر رکھ لیتا تھا اور اونے پونے دام لے کر دوسری جگہ چوری کا مال فروخت کر دیتا۔ چوری کا مال اکثر رات کی تاریکی میں فروخت ہوتا ہے اس لئے مجھے تیزاب کی بوتلیں حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

ایک گھنٹے کے بعد میں اپنے مکان سے ذرا دور آ کر رک گیا۔ وہاں اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے میں نے مکان کے آس پاس کے دور دور تک دیکھا کہ میرا کوئی دشمن یا پولیس والے میری تاک میں ہیں یا نہیں؟ ویسے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی میں نے مطمئن ہو کر گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنے مکان تک پہنچ گیا۔

جب میں تالا ڈال کر باہر جاتا ہوں تو اس تالے کو اوپر کی طرف الٹ کر جاتا ہوں۔ اگر میری واپسی تک وہ تالا اسی طرح الٹا اپنی جگہ پر قائم رہے تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ دروازے تک کوئی نہیں آیا تھا کیونکہ کوئی بھی آنے والا تالے کو سیدھا ضرور کر کے دیکھتا ہے کہ واقعی تالا لگا ہوا ہے یا یونہی دروازے کی کنڈی میں پھنسایا گیا ہے۔ میرا کوئی دشمن یا پولیس والے تو میری عدم موجودگی میں تالا توڑ کر بھی اندر جا سکتے تھے لیکن اس وقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تالا محفوظ تھا۔ کوئی میرے دروازے تک نہیں آیا تھا۔

میں نے اندر آ کر دروازے کو بند کر دیا۔ غسل خانے میں جانے سے پہلے پھر میں نے اپنے منہ اور ناک پر اچھی طرح کپڑا باندھ لیا۔ پھر تیزاب کی بوتلیں لے کر اندر چلا گیا۔ وہاں لاش کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ گل گیا تھا، صرف ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ باقی حصے پر کھال سمیت گوشت جوں کا توں رہ گیا تھا۔ گٹر بند ہونے کے باعث فرش پر پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے شاور کو بند کر دیا۔ لوہے کی پتلی سی سلاخ لے کر سب سے پہلے گٹر میں پھنسے ہوئے مواد کو صاف کیا۔ نکاسی کا راستہ ملتے ہی فرش کا پانی تیزی سے گٹر میں جانے

لگا۔ اس کے بعد میں نے تیزاب کی دوسری بوتل کھولی اور لاش کے باقی حصے کو گلانے کا کام شروع کر دیا۔

لاش کو چھپانے کے سلسلے میں، میں نے اتنی محنت کبھی نہیں کی تھی۔ مجھے کس قدر پریشانیاں اٹھانا پڑیں، اس کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ صبح ہونے تک غسل خانہ تمام آلائشوں سے پاک ہو گیا۔ وہاں کسی بلقیس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ صرف انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ کسی ڈھانچے کو دیکھ کر آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ ڈھانچہ اپنی زندگی میں مرد تھا یا عورت؟ عالم الابدان شاید کہہ دیں مگر ہم اور آپ شناخت نہیں کر سکتے۔ چند گھنٹے پہلے وہ ڈھانچہ بلقیس کے روپ میں کتنا حسین تھا۔ عشق و محبت کے ہزاروں فتنے جگاتا تھا مگر اب ایسا بھیانک نظر آ رہا تھا کہ کمزور دل کے لوگ اسے دیکھ کر ڈر جاتے۔

میں بلقیس کو اغوا کرنے کے الزام سے بچ گیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ یہاں آئی تھی یا لائی گئی تھی کہنے والے کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے۔ بس میرا کام اتنا رہ گیا تھا کہ میں اس ڈھانچے کو کہیں اور پھینک آتا پھر سارے خدشات ختم ہو جاتے اور میں قانون سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل ہو جاتا لیکن اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ میں اس انسانی ڈھانچے کو مکان سے باہر نہیں نکال سکتا تھا اس لئے میں اسے اچھی طرح کپڑے سے صاف کر کے اپنی خوابگاہ میں لے آیا اور اسے پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ اس کے بعد میں نے دونوں کمروں کے سیلنگ فین پوری رفتار سے کھول دیئے اور غسل خانے سے لے کر خوابگاہ تک شنیل کی خوشبو چھڑک دی تا کہ رہی سہی بدبو بھی ختم ہو جائے۔

جب مجھے ہر طرح سے اطمینان ہو گیا کہ میں خطرے سے باہر ہوں تو پھر میں آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔ یعنی پلنگ کے نیچے بلقیس کا ڈھانچہ تھا اور اوپر میں لیٹا ہوا تھا چونکہ میں نے بڑی محنت کی تھی اور تھکن غالب آ رہی تھی اس لئے میں ذرا سی دیر میں گہری نیند سو گیا.......... اس دنیا سے غافل ہو کر میں کسی اور دنیا کی سیر کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت بار بار اپنا روپ بدل کر میرے پاس آتی ہے۔ کبھی وہ بوڑھی ہوتی ہے، کبھی جوان ہوتی ہے، کبھی ایک لڑکی کا چہرہ لے کر آتی ہے، کبھی دوسری لڑکی کا چہرہ اپنا لیتی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”آخر یہ تماشہ کیا ہے اور اس تماشے کا انجام کیا ہے؟“

میرے سوال کے جواب میں وہ موم کی طرح پگھلنے لگی۔ اس کی کھال اور گوشت پانی بن کر بہنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ اُف! چند لمحے پہلے وہ کتنی حسین تھی، اسے

دیکھ کر پیار سے دل دھڑکتا تھا۔ اب اس کے استخوانی وجود کو دیکھ کر خوف سے کلیجہ کانپ رہا تھا۔

وہ ڈھانچہ کہنے لگا۔ ''اس تماشے کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ آؤ، مجھ سے محبت کرو، ان ہڈیوں کو دیکھو اور سوچو کہ ان ہڈیوں پر گوشت چڑھنے اور کھال منڈھنے کے بعد میں کتنی حسین ہوگئی تھی۔ ہم تمام انسانوں کی بنیاد ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ تعجب ہے کہ تم بنیاد سے محبت نہیں کرتے ہو، صرف اس پر چڑھے ہوئے گوشت سے عشق کرتے ہو۔

دیکھا جائے تو جب سے دنیا آباد ہوئی ہے، ہم گوشت پر شاعری کر رہے ہیں اور گوشت سے محبت کر رہے ہیں اور محبت کے نام پر ایک دوسرے کے گوشت سے کھیل رہے ہیں۔ جب یہ گوشت گل جاتا ہے، پانی بن کر بہہ جاتا ہے اور صرف بنیاد رہ جاتی ہے تو پھر شاعری یاد نہیں رہتی، محبت کی بجائے نفرت بیزاری اور دہشت رہ جاتی ہے۔

لیکن تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گے۔ میں صدیوں سے تمہاری منتظر رہی ہوں۔ وقت کا ایک طویل فاصلہ طے کیا ہے۔ نئے نئے روپ میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ اب تمہارے سامنے یہ بنیادی روپ ہے۔ اس کے بعد انسان کوئی دوسرا روپ اختیار نہیں کر سکتا۔ آؤ، آگے بڑھو۔ مجھے پیار کرو۔ یہ ہماری بے مثال محبت کا آخری سٹیج ہے۔ آؤ میرے محبوب! اور زیادہ نہ تڑپاؤ۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی استخوانی بانہیں پھیلا کر میرے قریب آنے لگی۔ میں پیچھے ہٹنے لگا۔ میں اس سے خائف نہیں تھا، نہ ہی اس سے نفرت تھی مگر ہڈیوں کے کسی ڈھانچے کو بھلا کون پیار کرتا ہے؟ میرا دماغ نہیں چل گیا تھا کہ میں اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں چلا جاتا لہٰذا اس سے کتراتے ہوئے میں ایک لکڑی کے تخت کے نیچے آیا اور وہیں اس سے چھپ کر لیٹ گیا لیکن میں اس سے چھپ نہ سکا۔ وہ ڈھانچہ تخت کے نیچے آ کر لیٹ گیا اور میری گردن میں بانہیں ڈال کر مجھے پیار کرنے لگا۔ اف! اس کے منہ سے تیزاب اور سڑے گلے گوشت کی ایسی بدبو آ رہی تھی کہ گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلنے کے بعد میں بستر پر نہیں تھا۔ بلکہ پلنگ کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ بلقیس کی استخوانی بانہیں میری گردن میں حمائل تھیں۔ اس کا منہ میرے منہ کے قریب تھا اور اسی جانی پہچانی بدبو سے مجھے وحشت سی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے پرے ہٹا دیا اور لڑھکتا ہوا پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔

وہ ڈھانچہ پلنگ کے نیچے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں اس کی جانب گھورتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ مجھ سے کیسے لپٹ گیا تھا؟ دوسرے لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ڈھانچہ تو اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں ہی نہ جانے کیسے پلنگ پر سے اٹھ کر پلنگ کے نیچے چلا گیا تھا اور ہم دونوں ہم آغوش ہوگئے تھے۔

ہاں۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ میرے ذہن پر زیادہ بوجھ ہو تو میں نیند کی حالت میں اٹھ کر چلتا ہوں اور خواب کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اس وقت بھی میں تخت کے نیچے جانے کے عمل میں پلنگ کے نیچے چلا گیا تھا۔ بہرحال یہ صاف ظاہر تھا کہ ڈھانچہ میرے پاس نہیں آیا تھا، میں ڈھانچے کے پاس گیا تھا۔

میں نے میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی جانب دیکھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میرے دماغ میں یہ تدبیر تھی کہ رات ہوتے ہی بلقیس کے ڈھانچے کو ایک سوٹ کیس میں پیک کر کے یہاں سے لے جاؤں گا اور کسی ویرانے میں ہڈیاں لے جا کر پھینک آؤں گا۔ اس تدبیر پر میں نے دوبارہ غور کیا۔ پھر فرش پر سے اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد غسل سے تازہ دم ہو کر لباس بدلنے کے بعد میں اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں پیٹ بھرنے کے لئے آ گیا۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں ان واقعات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگا جن سے میں گزر چکا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرانی تھی کہ سوسن رابرٹ بن کر دشمنی کرنے والی لڑکی یا لڑکے نے بلقیس کی لاش میرے گھر تک پہنچانے کے بعد مزید انتقامی کارروائی نہیں کی تھی۔ دشمن چاہتا تو تھانے میں اطلاع پہنچا سکتا تھا کہ انسپکٹر شہباز خان کی لڑکی میری خوابگاہ میں مُردہ پڑی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ پولیس والے بلقیس کو نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتے پھر رہے تھے، مگر میرے دروازے تک نہیں آئے تھے۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی مجھ سے دشمنی نہیں کر رہا ہے۔ مجھے کسی انجانے دشمن کے متعلق نہیں سوچنا چاہئے۔

کسی دشمن کو اپنے دماغ سے نکالنے کے بعد صرف وہ لڑکی رہ جاتی تھی جو سوسن عرف مہ لقا بن کر ہر سال پہلی اپریل کو خط لکھا کرتی تھی۔ اب بھی لکھتی ہے اور شائد آئندہ بھی لکھے گی اور اسی طرح آئندہ بھی لاشوں کے تحفے بھیجتی رہے گی کچھ بھی ہو، وہ بڑے ہی بھیانک انداز میں اپریل فول منا رہی تھی۔ پتہ نہیں اس شہر کے کس علاقے اور کس مکان میں چھپی بیٹھی تھی۔ اگر اس نے سنجیدگی سے خط لکھا تھا تو اس خط کے مطابق اب اس سے آئندہ سال

کی پہلی اپریل کو ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے ملاقات کی توقع فضول تھی۔ وہ عجیب عورت تھی سال بھر تک بالکل خاموش رہتی تھی اور پہلی اپریل کو میرا سکون برباد کر دیتی تھی۔ میں جتنا اس کے متعلق سوچتا جاتا تھا اتنا ہی الجھتا جاتا تھا اور رفتہ رفتہ پھر قائل ہوتا جا رہا تھا کہ وہ سچ مچ سو سال سے میرا انتظار کر رہی ہے اور آئندہ سال مجھ سے ضرور ملاقات کرے گی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے مکان میں واپس آ گیا۔ وہاں میں نے ان خطوط کا مطالعہ کیا جو بلقیس کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ مگر ان خطوط میں سوسن رابرٹ عرف مہ لقا کا نام لکھا ہوا تھا۔ میری نادیدہ محبوبہ نے پچھلے روز یعنی پہلی اپریل کو بلقیس کا روپ اختیار کیا تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

میں ایک سوٹ کیس نکال کر فرش پر بیٹھ گیا اور پلنگ کے نیچے سے بلقیس کا ڈھانچہ کھینچ کر اسے توڑ مروڑ کر سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس ڈھانچے کو کہیں چھپانے تک کوئی مصیبت نہ آئی، کسی نے دشمنی نہیں کی اور کوئی پولیس والا دروازے پر نہ آیا تو میں تسلیم کر لوں گا کہ جو کچھ بھی مجھ پر گزر رہی ہے یہ سب میری سو سالہ محبوبہ کا کارنامہ ہے۔

سوٹ کیس میں ہڈیاں رکھنے کے بعد میں نے اسے ایک چادر سے ڈھانپ دیا پھر اس چادر پر اپنے پہننے کے چند جوڑے رکھنے لگا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں یکبارگی اچھل پڑا۔ وہ دستک خطرہ کی گھنٹی تھی۔ میں نے فوراً ہی سوٹ کیس کو الماری کے اوپر رکھ دیا تا کہ وہ نظر آتا رہے۔ جو چیز نگاہوں کے سامنے ہو، اس پر کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ اسی دوران دوبارہ دستک ہوئی۔ میں نے دوسرے کمرے میں آ کر دروازہ کھول دیا۔

باہر انسپکٹر شہباز خاں دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی شہباز خاں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے سے مجھے پرے دھکیلتے ہوئے اندر آ کر کہا۔

''مجھے بہت دیر سے اطلاع ملی ہے کہ کل تم میرے علاقے میں آئے تھے اور میرے مکان کے سامنے والے ہوٹل میں بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو سچ سچ بتا دو کہ میری لڑکی کہاں ہے۔ جلدی بتاؤ کہاں ہے؟''

وہ طیش میں آ کر میرے گریبان کو پکڑ کے جھنجھوڑنے لگا۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

''جناب! میں نے آج تک آپ کی صاحبزادی کی پرچھائیں تک نہیں دیکھی ہے۔

میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں..........''

یہ کہہ کر میں بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا لیکن اس نے اعتبار نہیں کیا۔ مجھ پر تابڑ توڑ گھونسے برساتا ہوا مجھے ایک صوفے پر لا کر گرا دیا۔ میں اس سے کمزور نہیں ہوں۔ اگر میرا ایک ہاتھ پڑ جاتا تو وہ زمین سے نہ اٹھ سکتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں قانون کی طاقت تھی اس لئے میں نے مجبوراً مار کھا لی لیکن پھر مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ مجھے مارنے کے بعد خود ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جوان بیٹی گھر سے چلی گئی تھی یا اغوا کر لی گئی تھی۔ اس کے ساتھ برسوں کی عزت خاک میں مل رہی تھی۔ وہ کل سے تلاش کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس لئے اب مزید پولیس انسپکٹر کی طرح سنگدل نہ بن سکا۔ ایک کمزور باپ کی طرح صوفے پر گر کر رونے لگا۔

اتنی دیر میں دونوں سپاہی میرے مکان کے گوشے گوشے میں جھانک آئے تھے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جس لڑکی کو وہ تلاش کر رہے ہیں وہ خوابگاہ کی الماری کے اوپر سوٹ کیس کے اندر بند ہے اور اگر وہ سوٹ کیس کھول بھی لیں تو انسپکٹر شہباز خاں ایک باپ ہو کر بھی اپنی بیٹی کو نہیں پہچان سکے گا۔

وہ ایک سالم جیتی جاگتی لڑکی کو تلاش کرنے آئے تھے۔ ان کا دھیان ایک چھوٹے سے سوٹ کیس کی طرف نہیں گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور مجھے ڈرا دھمکا کر اور مار پیٹ کر بلقیس کے متعلق پوچھنے لگے۔ وہاں میرے علاوہ شہر کے اور بھی چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ ان پر بھی یہی ظلم ہوتا رہا لیکن مجھے آدھی رات کے بعد چھوڑ دیا گیا کیونکہ میری ہسٹری شیٹ میں یہ داغ نہیں لگا تھا کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے مجھے وارننگ دے کر جانے کی اجازت دے دی۔

گھر آ کر میں نے سوچا کہ خطرہ اب بھی سر پر منڈلا رہا ہے۔ مجھے فوراً ہی بلقیس کی ہڈیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں نے وہ سوٹ کیس اٹھایا۔ برآمدے میں آ کر اسے موٹر سائیکل کے کیریئر پر باندھ دیا۔ پھر دروازے پر تالا لگا کر میں وہاں سے چل پڑا۔

لیکن وہ زیادہ دور نہ جا سکا۔ پولیس کی ایک جماعت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میری طرح دوسرے بدمعاشوں کو بھی محض وارننگ دے کر چھوڑ دیا گیا تھا اور ان کے پیچھے پولیس کے آدمی لگ گئے تھے۔ دوسروں کا حشر کیا ہوا میں نہیں جانتا۔

مگر میرے سوٹ کیس سے انسانی ہڈیاں برآمد ہو گئیں۔

مختصر یہ کہ تھانے سے عدالت تک مجھ سے یہی سوالات کئے گئے کہ وہ ہڈیاں کس کی ہیں؟ میں انہیں کہاں سے لایا ہوں اور.........سوٹ کیس میں رکھ کر کہاں لے جا رہا تھا؟

میں یہی جواب دیتا رہا کہ وہ ہڈیاں میں نے ایک شکستہ قبر سے حاصل کی ہیں۔ ان دنوں میں کالا علم سیکھ رہا ہوں۔ اس مقصد کے لئے میں ان ہڈیوں کو سوٹ کیس میں رکھ کر قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔

قانون کالا علم سیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی میں مجرم تھا لیکن بلقیس کے کسی سلسلے میں مجھ پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ میں سزائے موت سے بچ گیا۔ کالا علم سیکھنے کے جرم میں اتنی سزا ملی کہ مقدمہ بازی کے دوران چھ ماہ تک جیل میں رہا۔ پھر عدالت کے فیصلے کے مطابق پانچ سو روپے جرمانہ ادا کر کے بری ہو گیا۔

چھ ماہ تک میری آمدنی کے ذرائع ختم ہو گئے تھے اور اخراجات بڑھ گئے تھے۔ جیل سے آتے ہی میں ایسا کوئی دھندا نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے پھر جیل واپس جانا پڑتا۔ اس لئے میں شکار کی طرف مائل ہو گیا۔ اونچی سوسائٹی میں کوئی سونے کی چڑیا تلاش کرنے لگا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ اونچی سوسائٹی میں لڑکیاں کیلے کے چھلکے پر چلتی ہیں۔ اسی لئے نہایت آسانی سے کم از کم مجھ پر پھسل جاتی ہیں۔ اتنی آسانی کے باوجود اونچی کوالٹی کا شکار کھیلتے کھیلتے تین ماہ گزر گئے۔ تین ماہ کے بعد جب وہ میرے دام میں آئی تو مجھے احساس ہوا کہ دراصل میں اس پر ڈورے نہیں ڈال رہا تھا بلکہ وہ بڑی خاموشی سے مجھے پھانس رہی تھی۔ اس وقت میں نے اس عورت کی شکار کھیلنے والی خاموش اداؤں کو نہیں سمجھا تھا۔

بہرحال چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر گرے، بات ایک ہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے۔ وہ ٹیکسٹائل ملز کے مالک کی اکلوتی بیٹی تھی۔ سوسائٹی میں صرف اس کے حسن و شباب کے ہی نہیں، رئیسانہ شان و شوکت کے بھی چرچے تھے۔ ہر روز اس کے متعلق ایک نیا اسکینڈل تیار ہوتا کہ شہناز کل فلاں مل اونر کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ یا فلاں پرنس کے ساتھ ان دنوں مصروف ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں ہی بناتے رہے اور میں نے اس حسینہ کو ہتھیا لیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ کوئی مجھ سے بڑا گلفام اسے اپنی طرف مائل نہ کر لے۔ میں نے فوراً ہی شہر سے دور کسی پُر فضا پہاڑی مقام پر وقت گزارنے کا پروگرام بنا لیا۔ میں اپنے رومانس کی تفصیل پیش نہیں کرنا چاہتا۔ جلد از جلد اپنی داستان کے اس حصے

میں آنا چاہتا ہوں جہاں شہناز کا اصلی روپ میرے سامنے آیا تھا۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ ہم ایک پہاڑی ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شہناز بستر پر اوندھی لیٹی ہوئی بیڈ لیمپ کی روشنی میں اپنے ڈیڈی کو خط لکھ رہی تھی خط میں میرا ذکر تھا۔ وہ میری تعریف کرتے ہوئے اپنی پسند کا اظہار کر رہی تھی کہ وہ مجھے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی ہے۔ بڑے لوگوں کو اپنی لڑکیوں پر بڑا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی بیٹی جس کے ساتھ وقت گزار رہی ہے اسے داماد بنانے کے لئے ہر قیمت پر خرید لیا جائے گا۔ اگر وہ فریبی ثابت ہوا تو اپنے اثر و رسوخ سے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا جائے گا۔ بڑے لوگ چاہیں تو بڑی بڑی اذیتوں میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ بہرحال اس وقت شہناز جو کچھ لکھ رہی تھی۔ اسے میں نے سرسری طور سے پڑھا لیکن ایک بات کھٹک گئی، اس کی تحریر کچھ جانی پہچانی سی نظر آئی۔ پچھلے سال جو خطوط سوسن رابرٹ نے لکھے تھے وہ چشمِ تصور میں سامنے آ گئے۔ شہناز کا خط تقریباً ویسا ہی تھا۔

میں تعجب سے کبھی اس تحریر کو اور کبھی شہناز کے حسین مکھڑے کو دیکھنے لگا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی اپریل فول منانے والی لڑکی ہے۔ میں بہت دیر تک اسے خاموشی سے دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ اس سے کس طرح حقیقت معلوم کروں۔ اگر وہ مجھے بیوقوف بناتی رہی تھی تو کبھی اپنی غلطیوں کا اعتراف نہیں کرے گی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے میں ایک قتل کے الزام میں ملوث ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

جب اس نے خط لکھ کر بیڈ لیمپ کے قریب رکھ دیا اور لائٹ آف کرنے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''بتی نہ بجھاؤ، تمہارے حسن و شباب کی حشر سامانیاں اندھیرے میں ڈوب جاتی ہیں۔''

یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور ہولے ہولے محبت سے اسے چومنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس پر نشہ طاری ہونے لگا تو میں نے کہا۔

''شہناز! تمہیں آغوش میں لے کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم جنم جنم سے میرے ساتھ ہو۔ ہم دونوں تقریباً ایک سو سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

''ہاں!'' اس نے جذباتی انداز میں جواب دیا۔ ''کبھی کبھی مختصر سی ملاقات صدیوں پرانی ملاقات معلوم ہوتی ہے۔ یہ کتنا رومانٹک آئیڈیا ہے کہ ہم سو سال سے ایک دوسرے کو

چاہتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ایک صدی سے خوابوں میں تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔''

میں نے کہا۔''خط و کتابت کے ذریعے بھی تلاش کیا جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم خوابوں میں مجھے خط لکھتی رہی ہو۔''

''ہاں۔ کیوں نہیں ہوسکتا۔ میرا فیملی ڈاکٹر کہتا ہے کہ بعض لڑکیاں نیند کی حالت میں چلتی ہوئی لکھنے کی میز پر جاتی ہیں اور کئی کئی صفحات کے خطوط لکھ ڈالتی ہیں۔''

''کیا تمہارے متعلق ڈاکٹر نے یہ نہیں بتایا کہ تم شہزاد نامی کسی اجنبی کو خط لکھتی ہو۔''

''نہیں۔ ڈاکٹر نے میرے متعلق ایسی رائے قائم نہیں کی لیکن میں نیند کی حالت میں خط لکھنے کے خوبصورت مرض میں مبتلا ہونا چاہتی تھی۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر میں نیند کی حالت میں اپنی لاعلمی میں اپنے انجانے محبوب کو خط لکھوں اور اسے پوسٹ کردوں اور پھر زندگی کے کسی موڑ پر سچ مچ اس انجانے محبوب سے ملاقات ہوجائے تو زندگی ایک رومانی تصوراتی داستان کی طرح خوبصورت ہوجائے گی۔

اب میں سوچ رہی ہوں کہ میرے ساتھ ایسے ہی رنگین اور دلچسپ واقعات پیش آرہے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں خط لکھا کرتی تھی اور تمہارے نام پوسٹ کردیتی تھی۔ تم انہی خطوط کی زنجیروں میں بندھے ہوئے میرے پاس آگئے ہو۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟''

میں اسے باتوں سے بہلا کر پوچھ رہا تھا لیکن وہ ایسے جواب دے رہی تھی جیسے مجھے باتوں سے بہلا رہی ہو۔ وہ کس طرح انجان بن کر کہہ رہی تھی کہ میں خطوط کی زنجیروں سے بندھا ہوا اس کے پاس آگیا ہوں۔

بہرحال اتنا سمجھ میں آگیا کہ وہ مجھ سے اپنی اصلیت چھپا رہی ہے۔ میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ کبھی تسلیم نہ کرتی کہ اس کی وجہ سے میں کتنی ہی مصیبتوں سے گزر چکا ہوں۔ اب میں یہ سوچنے لگا کہ مجھے اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے۔ ابھی تو وہ اپنی دولت سے مجھے فیض پہنچا رہی تھی اور صبح و شام اپنی جوانی کی سوغات پیش کرتی رہتی تھی۔ ابھی اس کی مہربانیوں سے ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ میں اسے کوئی نقصان پہنچا کر خود کو مالی اعتبار سے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت مصلحت سے کام لینا ضروری تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور ہر لمحہ محتاط رہنا چاہئے۔ اگر میں اس پر کڑی نظر رکھوں گا تو وہ جو چال بھی چلے گی، اس کا علم مجھے ہو جائے گا۔

اس وقت وہ میری دوست بھی تھی اور دشمن بھی۔ میں اس کے بدن کی تفریح گاہ میں رنگین لمحات بھی گزار رہا تھا اور اس سے محتاط بھی تھا۔ تقریباً ساڑھے دس بجے میں اپنے بیڈ پر چلا آیا اور وہ اپنے بیڈ پر آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کن انکھیوں سے میری جانب دیکھا پھر بیڈ لیمپ کو بجھا دیا۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی، کھڑکی کے راستے برآمدے کی دھیمی دھیمی روشنی آرہی تھی۔ ذرا دیر بعد آنکھیں اس دھیمی روشنی کے سہارے کمرے کی تاریکی میں دیکھنے لگیں۔

وہ بستر پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ میں بہت دیر تک نیم تاریکی میں اسے گھور کر دیکھتا رہا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ میری نظریں بھٹکتی ہوئی دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر پر گئیں۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی سیدھی کیلنڈر پر جارہی تھی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ اس روز مارچ کی اکتیس تاریخ تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اکتیس تاریخ ختم ہونے والی تھی اور اپریل کی پہلی تاریخ شروع ہونے والی تھی۔

میں یک بیک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یاد آگیا کہ سوسن نے آخری خط میں میرا انتظار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہوئی تو آئندہ سال کی پہلی اپریل کو آکر ملاقات کرے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا تھا۔ اب پہلی اپریل کے لئے صرف بیس منٹ رہ گئے تھے۔

میں نے اس بار شہناز کی جانب دیکھا تو مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں چشم تصور میں ایک سال پیچھے چلا گیا۔ میرے سامنے بستر پر بلقیس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح شہناز میرے سامنے ایک لاش کی طرح نظر آرہی تھی میں اپنے بیڈ سے اتر کر اس کے بیڈ پر آیا۔ قریب سے دیکھنے پر واقعی وہ بے جان نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہاتھ زندگی کی حرارت سے خالی تھا۔ شہناز مرچکی تھی۔

آہ! میں پھر بری طرح پھنس گیا تھا، مجھ پر ایک بار پھر ایک ناکردہ قتل کا الزام عائد ہونے والا تھا۔ شہناز بہت بڑے دولتمند کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہ چھوڑتا، جتنی آسانی سے میں نے شہباز خاں سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔

نہ جانے میرے پیچھے کیسی مصیبت پڑ گئی تھی۔ محبت کا دوسرا نام مصیبت ہے۔ سو سالہ زنگ خوردہ عشق میری عقل کو بھی زنگ لگا رہا تھا۔ میں نے تو مدت ہوئی سوسن کا خیال دل

سے نکال دیا تھا۔ وہی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں۔ فی الحال شہناز کی لاش سے پیچھا چھڑانا تھا لیکن میں اسے کہیں چھپا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ ڈاک بنگلے کے دوسرے کمروں میں جو لوگ تھے میں ان سے شہناز کو چھپا کر کہیں دفن نہیں کر سکتا تھا۔ بلقیس کے وقت تیزاب کام آ گیا تھا مگر وہاں ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی میں ڈاک بنگلے میں ایسی چیزیں استعمال کر سکتا تھا۔ میری بھلائی اسی میں تھی کہ میں وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ شہناز کے سوٹ کیس میں پندرہ ہزار روپے نقد اور پچیس ہزار کے زیورات تھے۔ اس ملک سے باہر جانے کے لئے اتنی دولت کافی تھی۔

میں تیزی سے چلتا ہوا سوٹ کیس کے پاس آیا۔ وہاں میرا سوٹ کیس بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نقد روپے اور زیورات اپنے سوٹ کیس میں منتقل کرنے لگا۔ تمام مال سمیٹنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ شہناز کی انگلی میں ہیرے کی ایک انگوٹھی ہے۔ میں نے سوٹ کیس کو بند کیا اور اس کی انگلی سے انگوٹھی اتارنے کے لئے اس کے پاس آ گیا۔ اس کی موت کا مجھے یقین ہو چکا تھا۔ مجھ جیسا قاتل زندہ اور مُردہ انسان کو دور سے پہچان لیتا ہے۔ پھر میں نے تو اسے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ مُردہ تھی لیکن جب میں اس کی انگلی سے انگوٹھی اتارنے لگا تو اس نے اچانک ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

☆======☆======☆

میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ میں عین وقت پر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ وہ کمبخت مُردہ بن کر مجھے دھوکہ دے رہی تھی۔ مجھ جیسا تجربہ کار قاتل بھی دھوکہ کھا گیا تھا ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا کہوں۔ وہ بڑی محبت سے مجھے پکارتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

''او گاڈ! میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ برسوں کی جدائی کے بعد آج میں نے تمہیں پا لیا۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہم تو تقریباً تین ماہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ آج تم نے مجھے پا لیا ہے۔''

وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ ''میں وہ نہیں ہوں جس کے ساتھ تم نے تین ماہ گزارے ہیں۔ میں تمہاری سو سالہ محبت ہوں۔ میں تمہاری سوسن ہوں۔ مجھے تم مہ لقا کہا کرتے تھے۔''

میں ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو گیا۔ وہ دوبارہ میری طرف بڑھنے لگی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''رک جاؤ۔ میرے قریب نہ آنا، شہناز! تم اب تک سوسن یا مہ لقا بن کر مجھے دھوکہ دیتی رہی ہو۔ تم نے مجھے ایک ناکردہ قتل کا مجرم بنا دیا۔ تمہاری وجہ سے میں نے چھ ماہ جیل میں گزارے، جرمانہ بھی ادا کیا، تم نے مجھے کتنا نقصان پہنچایا ہے، یہ صرف میں ہی جانتا ہوں، تمہاری جیسی اپریل فول منانے والی بڑے باپ کی بیٹی میرے نقصان کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ آخر تم نے مجھے ہی کیوں نشانہ بنایا ہے؟ دنیا میں اور بھی لوگ ہیں۔ پھر یہ کہ ہم تین ماہ سے ایک ساتھ ہیں۔ اب تو تمہیں سوسن رابرٹ والا مذاق ختم کر دینا چاہئے۔ تعجب ہے کہ تم اب بھی وہی ڈرامہ کھیل رہی ہو۔''

''میرے شہزاد! یہ ڈرامہ نہیں ہے۔ میں شہناز نہیں ہوں۔ کچھ دیر پہلے جو شہناز تمہارے ساتھ تھی وہ مر چکی ہے۔ میں تمہاری وہی سوسن ہوں جو تمہیں ہمیشہ خط لکھتی رہی

ہے۔''

''تمہیں نیند کی حالت میں خط لکھنے کی بیماری ہے۔تمہارے فیملی ڈاکٹر نے تمہارے ہی متعلق یہ بات کہی تھی۔تم دماغی طور پر ایک مریضہ ہو،اور تمہارا یہ مرض مجھے نقصان پہنچا رہا ہے۔خدا کے لئے اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تم سے عشق کر سکوں۔''

یہ کہہ کر میں اپنے سوٹ کیس کے پاس آیا اور اسے اٹھا کر لے جانے لگا۔وہ بستر سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

''رک جاؤ شہزاد! تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔میں تمہاری غلط فہمی دور کردوں گی۔میری وجہ سے تمہیں جو نقصان پہنچا ہے، میں اس کی تلافی کروں گی۔تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں ہیرے جواہرات کے انبار میں لے جا کر بٹھادوں گی۔تم یقین کرو، میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گی جہاں تمہارے چاروں طرف دولت ہی دولت ہوگی،تم اسے ساری زندگی دونوں ہاتھوں سے لٹاتے رہوگے۔تب بھی اس میں بال برابر کمی محسوس نہیں ہوگی۔''

محبت میں اتنی مٹھاس نہیں ہوتی، جتنی کہ دولت میں ہوتی ہے۔وہ اپنی سو سالہ طویل محبت کا حوالہ دے کر مجھے نہیں روک سکتی تھی لیکن اتنی ساری دولت کا چارہ ڈال کر میرے قدم روک لئے۔میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس کے دولت مند باپ نے بلیک منی کو ہیرے جواہرات کی صورت میں کہیں چھپا رکھا ہے اور اس کی اکلوتی بیٹی مجھے اس خفیہ مقام تک لے جانا چاہتی ہے۔پھر بھی میں نے احتیاطاً پوچھا۔

''کیا تم مجھے دولت کا لالچ دے کر پھر کسی مصیبت میں پھنسانے کے لئے لے جارہی ہو؟ میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ تمہارے فریب میں آجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے جیب سے چاقو نکالا اور اسے کھول کر شہناز کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔''چلو تم مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو۔اگر جہنم میں لے جاؤ گی تو تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

وہ چپ چاپ میرے آگے چلنے لگی۔کمرے کے باہر برآمدے میں آکر میں نے محتاط نظروں سے آس پاس دیکھا۔دوسرے کمروں کے دروازے بند تھے۔کوئی یہ دیکھنے والا نہیں تھا کہ میں ایک لڑکی کو چاقو کے اشارے پر لئے جارہا ہوں۔

کار کے قریب آکر میں نے اسے ڈرائیو کرنے کے لئے کہا۔وہ جواب میں عاجزی سے کہنے لگی۔

''شہزاد! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں شہناز نہیں ہوں۔میں گاڑی چلانا نہیں جانتی ہوں۔وہ شہناز جس کی یہ گاڑی ہے اور جو اسے چلانا جانتی تھی، وہ مرچکی ہے۔کیا تم نے بارہ بجنے سے چند منٹ پہلے شہناز کے اس جسم کو مُردہ نہیں پایا تھا۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔میں نے بارہ بجے سے پہلے اسے مُردہ پایا تھا لیکن ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ حبسِ دم کی ماہر ہو۔سانس روک کر مُردہ بن گئی ہو۔جس شہناز کو میں نے سر سے پاؤں تک چوما تھا، وہ ہو بہو میرے سامنے کھڑی تھی۔میں کیسے یقین کرلیتا کہ وہ کوئی سوسن رابرٹ ہے۔میرے لئے تو وہ سو فیصد شہناز تھی۔نہ جانے وہ کیوں ڈرائیونگ سے انکار کررہی تھی۔میں خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا۔تاکہ وہ میرے چاقو کی نوک سے قریب رہے۔میں نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے اسے سمجھا دیا کہ اگر اس کی طرف سے ذرا بھی خطرہ محسوس ہوا تو میں چاقو کے ایک ہی وار سے اسکا کام تمام کردوں گا۔میری باتیں سن کر وہ کہنے لگی۔

''تم خواہ مخواہ مجھ پر شبہ کررہے ہو۔دیکھو یوں تو میں پچھلے دس برس سے تمہیں ہر سال خط لکھتی آئی ہوں لیکن کبھی تم سے ملنے کی خواہش نہیں کی تھی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تم جسمانی طور سے جوان تو ہوگئے تھے لیکن ذہنی طور پر بچے تھے۔اب سے دو برس پہلے میں نے تمہاری عمر کا حساب لگایا تو تم تیئیس برس کے تھے۔تب میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں تمہاری آغوش میں چلی آؤں مگر میں اپنے اصلی روپ میں نہیں آسکتی تھی۔''

میں نے پوچھا۔''تم اپنے اصلی روپ میں کیوں نہیں آسکتی تھیں؟''

اس نے جواب دیا۔''یہ میں رنگ محل میں پہنچ کر بتاؤں گی۔وہ خفیہ خزانہ جس کا میں ذکر کرچکی ہوں وہ اسی رنگ محل میں ہے۔''

اس کی بات سن کر میری آنکھوں کے سامنے ایک نہایت ہی پرانی عمارت کا نقشہ ابھر آیا۔وہ عمارت اب بھی ہمارے شہر میں ہے اور اسی کا نام رنگ محل ہے۔وہ عمارت ایک بار نیلام میں فروخت ہوئی اور کئی بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ فروخت ہوتی رہی لیکن کوئی خریدار وہاں چند ماہ سے زیادہ نہ رہ سکا۔ہر خریدار اس عمارت کے نئے خریدار سے یہ بات چھپاتا رہا کہ وہ جگہ آسیب زدہ ہے لیکن یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔اب برسوں سے وہ ویران پڑی ہوئی تھی اور وہ ایک صدی سے محبت کا دعویٰ کرنے والی مجھے اسی ویران رنگ محل میں لے جانا چاہتی تھی۔میں جن بھوت اور آسیبی بلاؤں کا قائل نہیں تھا لہٰذا میں اس عورت کے

ساتھ بس یونہی جا رہا تھا۔ ورنہ حقیقتاً مجھے خفیہ خزانے کی کشش ادھر لے جا رہی تھی۔ بہرحال اس نے کہا۔

''میں اپنے اصلی روپ میں نہیں آ سکتی، اس لئے کہ میں کسی حسین لڑکی کا جسم حاصل کر کے تمہارے پاس آنا چاہتی تھی۔ میں تمہیں کسی خط میں لکھ چکی ہوں کہ پہلی اپریل میری پیدائش کی تاریخ ہے۔ اپریل کی دو تاریخ شروع ہونے سے پہلے چوبیس گھنٹے کے لئے میں اپنی زندگی کی سانسیں حاصل کرتی ہوں۔ اس کے بعد پھر ایک سال تک مُردوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ دو سال پہلے تم سے ملاقات کرنے کے لئے میں نے حسینہ نامی ایک نہایت ہی حسین لڑکی کا جسم حاصل کیا۔ وہ چوک بازار کی پندرہویں گلی میں رہتی تھی۔ آدھی رات کو وہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔ میں سانسوں کے ذریعہ اس کی ناک کے راستے اس کے جسم میں داخل ہوئی تو وہ پہلی حسینہ مر گئی اور اس کے بدن میں چوبیس گھنٹے کے لئے میں زندہ ہو گئی۔''

میں نے پوچھا۔ ''میں کیسے یقین کروں کہ تم ایک سال میں صرف چوبیس گھنٹے کے لئے زندگی حاصل کرتی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ذرا صبر کرو، تمہیں یقین آ جائے گا۔ میرے لئے چوبیس گھنٹے کی کوئی قید نہیں ہے۔ میں جب تک چاہوں زندگی کی سانسیں حاصل کر سکتی ہوں۔ اب سے پہلے میں نے جب بھی تمہیں خط لکھا ہے تو ہمیشہ پہلی اپریل سے پہلے سانسیں حاصل کی ہیں۔ میں اپنے جنم دن سے ایک دن پہلے کسی لڑکی کا جسم حاصل کر لیتی تھی تا کہ میرا خط تمہیں پہلی اپریل کو مل جایا کرے۔''

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''لیکن تم زندگی کی سانسیں کہاں سے اور کیسے حاصل کرتی ہو؟''

''سانسوں کے بینک سے.........''

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر ونڈ اسکرین کے پار نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سانسوں کا بینک کیا ہوتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جیسے تمہاری دنیا میں روپے پیسے کا بینک ہوتا ہے ویسے ہی

ہماری دنیا میں سانسوں کا بینک ہے۔ وہاں میں نے اپنے اکاؤنٹ میں اتنی سانسیں جمع کرائی ہیں کہ اب اپنی موت کے معینہ وقت کے بعد بھی جب چاہتی ہوں، چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے کے لئے اپنے اکاؤنٹ سے سانسیں نکال کر زندہ ہو جاتی ہوں۔''

''مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ایسا کوئی بینک ہو سکتا ہے۔''

''کالے علم کی بہت سی باتوں پر لوگوں کو یقین نہیں آتا، مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں سانسوں کے بینک کی تفصیل نہیں بتا سکتی کیونکہ میں خود کالے علم کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میرے ڈیڈی کالے علم کے بہت بڑے عالم ہیں۔ وہ سانسوں کے بینک کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ وہی میرے نام سانسیں جاری کرتے ہیں اور ہر سال تمہیں خط لکھنے کے لئے جب دوسری لڑکیوں کی سانسیں روک کر ان کا جسم حاصل کرتی ہوں تو ان لڑکیوں کی زندگی کی بقیہ سانسیں میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''دوسری لڑکیوں کی زندگی کی بقیہ سانسیں تمہارے حصے میں کیسے آ سکتی ہیں؟''

''کیوں نہیں آ سکتیں؟'' اس نے جواب دیا۔ ''دیکھو! دنیا کے ہر مذہب میں یہ کہا جاتا ہے کہ خداوند مقدر میں جتنی سانسیں لکھ دیتا ہے انسان اس سے زیادہ سانسیں نہیں لے سکتا۔''

''ہاں! میرا بھی یہی عقیدہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور تمہارا یہ بھی عقیدہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کی جتنی نعمتیں جس کے نام لکھ دیتا ہے اس سے زیادہ اسے نہیں ملتا ہے۔''

''بے شک!'' میں نے اعتراف کیا۔

''لیکن یہ بھی تو ہوتا ہے کہ انسان شاکر نہیں ہوتا وہ دوسروں سے چھین کر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کوٹے سے زیادہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس دنیا کے پچاسی فیصد انسان ایک دوسرے سے چھیننے اور جھپٹنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ جب دوسروں کی چیزیں چھین کر اپنے استعمال میں لائی جاتی ہیں تو پھر دوسروں کی سانسیں چھین کر ہم اپنی زندگی کی معیاد کیوں نہیں بڑھا سکتے؟ کالا علم جاننے والوں کی ایک خفیہ تنظیم نے اسی نظریئے کی بنیاد پر برسوں سانسوں کی آمد و رفت پر ریسرچ کیا ہے اور بالآخر اپنی دن رات کی محنتوں سے سانسوں کا ایک بینک قائم کیا ہے۔ شہزاد! جو باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہیں انہیں خواہ

مخواہ سمجھنے میں اپنا وقت ضائع کیوں کرتے ہو۔ کیا ثبوت کے لئے اتنا کافی نہیں ہے کہ میں ایک سو سال سے زندہ ہوں اور سانسوں کے بینک سے وقتِ ضرورت سانسیں حاصل کرتی رہتی ہوں۔“

”تم مکمل ثبوت نہیں ہو۔ ابھی تو مجھے اسی بات کا یقین نہیں ہوا ہے کہ تم ایک صدی سے زندہ ہو۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم ایک بہت بڑے مل اونر کی اکلوتی بیٹی شہناز ہو۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”رنگ محل پہنچ کر تمہیں یقین آ جائے گا کہ میں شہناز نہیں، سوسن رابرٹ ہوں۔ دو سال پہلے تم مجھے حسینہ کے روپ میں دیکھتے، تب بھی یقین نہ کرتے کہ میں سوسن ہوں، خود حسینہ کے والدین یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کی بیٹی مر چکی ہے اور اس کے جسم میں میں زندگی کی سانسیں لے رہی ہوں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں یہی کہہ رہی تھی کہ حسینہ کا جسم حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے میں نے تمہیں خط لکھا۔ اس خط میں میں نے حسینہ کا پتہ بھی درج کیا۔ تاکہ تم اس پتہ پر آ کر ملاقات کر سکو مگر تم نہیں آئے میں چھتیس گھنٹے کی سانسیں لے کر آئی تھی۔ وہ چھتیس گھنٹے تمہارے انتظار میں گزر گئے۔“

”دو سال پہلے تمہارا جو خط آیا تھا میں نے اسے پڑھے بغیر جلا دیا تھا یہی وجہ ہے میں تم سے ملنے نہیں گیا تھا لیکن تم تو مجھ سے ملاقات کے لئے آ سکتی تھیں۔ یہ کیا بات ہے کہ میرا پتہ جانتی ہو۔ اس پتہ پر خط بھیجتی ہو مگر خود نہیں آتیں۔“

”خود کیوں نہیں آ سکتی۔ یہ دیکھو اس بار خود ہی تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں نے کہا نا کہ حسینہ کے جسم میں آ کر پہلی بار تم سے ملنے کی خواہش کی اور تمہارے انتظار میں سارا وقت گزار دیا۔ پچھلے سال میں نے بلقیس کا جسم حاصل کیا بعد میں پتہ چلا کہ وہ پردے میں رہنے والی لڑکی ہے۔ پھر بھی ہزار پابندیوں کے باوجود میں رات کے وقت تمہارے مکان میں آ گئی تھی۔ تم وہاں موجود نہیں تھے۔ میرے پاس اتنی ہی سانسیں تھیں کہ میں صرف بارہ بجے تک تمہارا انتظار کر سکتی تھی۔ میں نے احتیاطاً تمہارے کمرے میں بیٹھ کر ایک خط لکھ دیا تھا۔ وہ تم نے پڑھا ہو گا۔ بہرحال اس سال میں سیدھی تمہارے پاس چلی آئی۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارے آس پاس کسی مکان میں کوئی لڑکی ہو گی تو میں اس کا جسم حاصل کر لوں گی۔ اتفاق سے تمہارے ہی کمرے میں یہ حسین جسم نظر آ گیا جسے تم شہناز کہتے ہو۔ ہاں تم اپنی دانست میں غلط نہیں کہتے ہو۔ تم تو مجھے شہناز ہی سمجھو گے لیکن میں بہت جلد تمہاری غلط فہمی

دور کر دوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ صبح ہونے سے پہلے ہم رنگ محل کے احاطے میں پہنچ گئے۔ میں نے عمارت کے بیرونی دروازے کے سامنے کار روکی۔ کار سے اترتے وقت بھی میں نے اسے چاقو کی زد پر رکھا۔ وہ آگے تھی، میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نہ جانے دروازے کے کس حصے کو ہاتھ لگایا کہ وہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ اس نے مجھ سے دیا سلائی طلب کی۔ میں نے ماچس کی ڈبیہ ایک ہاتھ سے اس کی جانب بڑھا دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ننھا سا شعلہ لپکا اور ایک شمع دان میں لگی ہوئی دو مومی شمعیں روشن ہونے لگیں۔ اس روشنی میں ایک بڑے سے ہال کی شکستہ دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ ان دیواروں میں ایک آدھ جگہ شگاف پڑ گئے تھے اور کئی جگہ سے پلستر ادھڑا ہوا تھا۔ ان کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ وہ عمارت سوسن کے عشق کی طرح سو سال پرانی ہے۔

وہ ایک ہاتھ سے شمع دان اٹھائے میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ بڑا سا ہال ضروریاتِ زندگی کے تمام سامان سے خالی تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں آئے۔ پھر دوسرے سے تیسرے کمرے میں پہنچے۔ تمام کمروں کی ویرانی بتا رہی تھی کہ وہاں برسوں سے کسی انسان نے قدم نہیں رکھا ہے۔ اس عمارت کے گرد آلود فرش پر صرف ہم دونوں کے پیروں کے نشانات منقش ہوتے جا رہے تھے۔

عمارت کے ایک دور افتادہ کمرے میں پہنچ کر وہ ایک دیوار کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے ایک چھوٹی سی محراب کے اندر ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحہ ایک کھٹکا سا سنائی دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کمرے کے فرش کا ایک چوکور حصہ ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ سے سرک رہا تھا۔ وہ محراب کے پاس سے گھوم کر اس طرف جانے لگی جہاں فرش میں خلا پیدا ہو گیا تھا میرے چاقو کی نوک اس کی پشت سے لگی ہوئی تھی۔ فرش کی وہ خالی جگہ تہہ خانے کا راستہ تھی۔ وہ ہاتھ میں شمع دان لئے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کی زرد روشنی سے وہ تہہ خانہ روشن ہونے لگا۔ تہہ خانے کے فرش پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے میں مغلیہ دور کے کسی شاہی محل کے ایک کمرے میں پہنچ گیا ہوں۔ وہ دوسرے چراغ روشن کر رہی تھی اور میری نظروں کے سامنے تاریخ کا ایک گمشدہ باب روشن ہو رہا تھا۔

میرے پاؤں تلے ملائم قالین بچھا ہوا تھا۔ تہہ خانے کی چھت پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور مثلث کی صورت میں نقرئی اور بلوریں فانوس لٹک رہے تھے۔ وہ فانوس فی الوقت

روشنی کے محتاج تھے۔ شہناز یا سوسن نے جا بجا چاندی کے چراغ روشن کئے تھے جن سے ہلکی اور خنک روشنی کے علاوہ بڑی خوشگوار مہک نکل رہی تھی۔ میں چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگا دیواروں پر قد آدم روغنی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں شمع دان اٹھائے ایک تصویر کے پاس آ کر رک گئی۔ اس تصویر میں ایک انگریز دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے کھڑا ہوا تھا۔

''یہ میرے ڈیڈی رابرٹ ہیومن کی تصویر ہے۔ ذرا اس کے نیچے دیکھو کیا لکھا ہوا ہے؟''

میں نے تصویر کے نیچے دیکھا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ''سر رابرٹ ہیومن۔ تاریخ پیدائش، جنوری 1815ء۔ عارضی موت، جنوری 1875ء۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ عارضی موت کا کیا مطلب ہوا؟''

''اس کا مطلب ہوا کہ میرے ڈیڈی دنیا والوں کے لئے مر چکے ہیں لیکن کالا علم جاننے والوں کی کالی دنیا میں اب تک زندہ ہیں اور جب تک سانسوں کا بینک قائم رہے گا وہ اسی طرح زندہ رہیں گے۔''

''یہ سانسوں کا بینک کہاں ہے؟''

''ایسی جگہ ہے، جہاں ہمیں کچھ نظر نہیں آتا اور جو جگہ ہمیں نظر نہیں آتی، اسے ہم کالی دنیا کہتے ہیں۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں کالا علم نہیں جانتی نہ ہی ڈیڈی نے کبھی مجھے اپنی کالی تنظیم کے متعلق کچھ بتایا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ ان کی کالی دنیا کہاں ہے؟''

''تم ان سے کس طرح رابطہ قائم کرتی ہو؟''

''وہ خود ہی سال میں ایک بار پہلی اپریل سے ایک دن پہلے میرے پاس آتے ہیں۔ بینک سے مختصر سی سانسیں جاری کر کے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اب کے برس میں کتنے گھنٹے کی زندگی چاہتی ہوں۔ میری خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ میں مسلسل زندہ رہوں اور زندگی کا لطف اٹھاتی رہوں لیکن ڈیڈی نصیحت کرتے ہیں کہ مجھے بچت کی عادت ڈالنی چاہئے۔ وہ کہتے ہیں، جو سانسیں ہم بچاتے ہیں وہ آئندہ کام آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سال میں ایک بار چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے کے لئے زندگی حاصل کرتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی میں اس کے ساتھ چلتا ہوا ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ کی تصویر کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ اس حسینہ کا چہرہ اور اس کی نیلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک

انگریز لڑکی ہے لیکن لباس مشرقی تھا۔ مشرق اور مغرب کے امتزاج سے اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

''سوسن رابرٹ عرف مہ لقا۔ تاریخ پیدائش پہلی اپریل 1845ء عارضی موت پہلی جنوری 1870ء......''

یہ پڑھنے کے بعد میں کبھی شہناز کو اور کبھی سوسن کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ شہناز بلا شبہ حسین تھی لیکن سوسن کے حسن کے آگے ذرا ماند پڑ گئی تھی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اگر تم واقعی سوسن ہو، اور اس تصویر کی طرح حسین ہو تو پھر حسینہ بلقیس اور شہناز کے جسموں کی محتاج کیوں ہو۔ تم اپنے اس جسم میں میرے سامنے کیوں نہیں آتیں جو تصویر میں نظر آ رہا ہے۔''

اس نے اپنی تصویر کی جانب دیکھتے ہوئے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔

''مجھے اپنے اس جسم سے بہت محبت ہے۔ ایک صدی پہلے تم بھی میرے اس حسن و شباب پر مر مٹے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ تم میرے پرانے جسم کو دیکھنا پسند نہیں کرو گے۔''

''حسن کبھی پرانا نہیں ہوتا مجھے تمہارا وہ حسن پسند آ رہا ہے جو تصویر میں ہے۔ تم شہناز کے اس جسم کو چھوڑ کر اپنے اصلی روپ میں آ جاؤ۔ پھر میں تمہاری صد سالہ محبت کو دل و جان سے تسلیم کر لوں گا۔''

''اچھی بات ہے۔ اگر تم مجھے میرے اصلی روپ میں دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔''

وہ بدستور شمع دان اٹھائے میرے آگے آگے چلنے لگی۔ ہم ایک دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے کا سامان اور اس کی آرائش بتا رہی تھی کہ وہ کسی عورت کی خوابگاہ ہے۔ اس خوابگاہ کی مسہری جتنی آرام دہ اور خوبصورت تھی اتنی ہی دہشت انگیز تھی۔ کیونکہ اس نرم و گرم اور آرام دہ بستر پر انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہوا تھا۔

اُس ڈھانچے کو دیکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میرے دماغ نے فوراً ہی کہا کہ وہ بلقیس ہے، جسے میں نے تیزاب سے گلا دیا تھا۔ میں ایک مجرم تھا، اس لئے سہم گیا۔ بلقیس کا وہ ڈھانچہ مجھے میرے جرم کی سزا دینے وہاں موجود تھا۔ میں نے سہم کر پوچھا۔

''یہ کس کا ڈھانچہ ہے؟''

وہ مسکراتی ہوئی ڈھانچے کے پاس گئی۔ اس نے شمعدان کو سرہانے کی میز پر رکھ دیا۔ پھر بڑی محبت سے ڈھانچے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

''تمام انسانی ڈھانچے تقریباً ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں وہ کسی عورت کا ڈھانچہ ہے یا مرد کا؟ اس طرح کم از کم ستر پوشی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جہاں عورت اور مرد کی تشخیص نہ ہو سکے وہاں لباس غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

یہ کہہ کر وہ ڈھانچے کے ساتھ لیٹ گئی۔ میں نے کہا۔

''جو سوال میں نے کیا تھا، تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مجھے بتاؤ یہ کس کا ڈھانچہ ہے؟''

میرے سوال کا فوراً ہی جواب نہیں ملا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر اس ڈھانچے میں جنبش پیدا ہوئی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ڈھانچہ کروٹ بدل کر اٹھ رہا تھا۔ اس کی ہڈیاں آپس میں ٹکرا کر بج رہی تھیں۔ اس نے بستر کے سرے پر بیٹھ کر مجھے دیکھا پھر اپنے پاس لیٹی ہوئی شہناز کی جانب ہاتھ بڑھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری شہناز بہت پہلے مر چکی تھی۔ میں اس کا جسم حاصل کر کے تمہارے ساتھ یہاں آئی ہوں۔ اب میں نے اس کا جسم بھی چھوڑ دیا ہے اور تمہارے سامنے اپنے اصلی روپ میں آ گئی ہوں۔ تم یہی دیکھنا چاہتے تھے! اچھی طرح دیکھو۔ میں تمہاری سوسن یا تمہاری مہ لقا ہوں..........''

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے۔ ناک کی جگہ ایک سوراخ تھا اور دونوں جبڑوں تک بتیسی نکلی ہوئی تھی۔ اس کے سراپا میں کتنی ہڈیاں تھیں، یہ میں گن کر بتا سکتا تھا لیکن اس وقت اپنی صد سالہ محبوبہ کو دیکھ کر میں گنتی بھول گیا تھا۔ کہاں وہ تصویر جس کے نیچے سوسن رابرٹ عرف مہ لقا لکھا ہوا تھا اور کہاں یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ کوئی بڑے سے بڑا بدذوق بھی اس ڈھانچے کو مہ لقا نہیں کہہ سکتا تھا۔

وہ ڈھانچہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا (بلکہ کہنے لگی)

''تم مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہو۔ حالانکہ یہ کوئی عجیب سی بات نہیں ہے ہر انسان کی بنیاد یہی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ عجیب سی بات یہ ہے کہ ہر انسان اپنی بنیاد سے گھبراتا ہے

اور اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں کہ تم میرے اصلی روپ کو پسند نہیں کر رہے ہو۔

لیکن شہزاد! میں کیا کر سکتی ہوں؟ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے بدن کے گوشت پوست کو صدیوں تک تمہارے لئے سنبھال کر رکھتی مگر افسوس! ہڈیوں کی حفاظت کی جائے تو وہ صدیوں تک سلامت رہتی ہیں لیکن گوشت جلد ہی سڑ جاتا ہے۔ گل جاتا ہے۔ میرے ڈیڈی کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے علم سے ہڈیاں محفوظ کر لیں اور انہیں زندگی کی سانسیں بھی سپلائی کرتے ہیں لیکن وہ گوشت پوست کی حفاظت نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں ان کا علم کام نہ آیا اور وقت کے تیزاب نے ہم سب کو گلا کر رکھ دیا۔

جو کچھ بھی ہوا، مگر یہ تو دیکھو کہ میں کسی نہ کسی طرح تمہارے انتظار میں اب تک زندہ رہی اور آئندہ بھی اسی طرح زندہ رہوں گی۔ محبت میں مرنے والوں کی داستانیں تو بہت ہیں لیکن محبت میں صدیوں تک زندہ رہنے والے صرف ہم دونوں ہیں۔ کوئی دوسرا ہماری مثال پیش نہیں کر سکتا۔ آؤ اس دنیا کے سب سے انوکھے پیار کی کامیابی پر میرے گلے لگ جاؤ۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لو۔''

وہ آگے بڑھنے لگی۔ مرمریں بانہوں کی بجائے دو استخوانی بانہیں میری جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ میں ایسا احمق عاشق نہیں تھا کہ کٹا کٹ بجنے والی ہڈیوں کو اپنے سینے سے لگا کر چومتا۔ نہ جانے یہ کیا چکر تھا۔ ایک ڈھانچہ حرکت کر رہا تھا۔ بول رہا تھا اور میرے سینے سے لگ جانے کی آرزو کر رہا تھا۔ (کر رہی تھی)

اس ڈھانچے کی سریلی آواز بتا رہی تھی کہ وہ عورت ہے اور اپنے کہنے کے مطابق سوسن رابرٹ ہے۔ میری بلا سے وہ جو کوئی بھی تھی۔ ہڈیوں کی محبوبہ سے نہ کبھی کسی نے رومانس کیا اور نہ ہی میں اسے ہاتھ لگانا گوارا کر سکتا تھا اس لئے جیسے ہی وہ میرے قریب آنے لگی۔ میں وہاں سے پلٹ کر بھاگنے لگا اس نے مجھے آواز دی۔

''شہزاد! رک جاؤ۔ میرے پیار کی قدر کرو۔ کیا ہڈیوں سے گوشت چھوٹ جائے تو محبت ختم ہو جاتی ہے؟ کیا عاشق اسی طرح بھاگتے ہیں؟''

☆======☆======☆

میں بھاگتا ہوا خوابگاہ سے نکل گیا۔ اس کی آواز میرا پیچھا کرتی رہی۔ میں اسی کمرے میں آ گیا جہاں تہہ خانے سے اوپر جانے کی سیڑھیاں تھیں۔ میرے لئے راستہ صاف تھا۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ رنگ محل کے بیرونی دروازے کا راستہ مجھے یاد تھا۔ میں بے تحاشا بھاگتا چلا گیا ایک آدھ بار پلٹ کر دیکھا۔ وہ پیچھے نہیں آ رہی تھی اور اب اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں مختلف کمروں سے گزرتا ہوا بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔

دروازہ بند تھا میں نے اس بھاری بھرکم دروازے کو پوری قوت سے ہلا ہلا کر کھولنے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہاں تالا نہیں پڑا تھا۔ نہ ہی اندر سے کھٹکا لگا ہوا تھا۔ پھر بھی میری انتہائی کوششوں کے باوجود وہ نہ کھلا۔ میں مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور چاروں طرف گھوم کر فرار کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ وہاں جتنی کھڑکیاں تھیں وہ بھی اندر سے بند تھیں۔ میں نے وہاں بھی زور آزمائی کی لیکن میری کوششیں رائیگاں گئیں۔ ایک کھڑکی کا اندھا شیشہ ذرا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ باہر آفتاب کی روشنی اتنی تیز تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کھڑکی کے نیچے سے جو راستہ گزرتا تھا وہاں لوگوں اور موٹر گاڑیوں کی اچھی خاصی آمد ورفت تھی۔ میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرف منہ کر کے چیخنے لگا۔

''خدا کے لئے میری مدد کرو۔ اس عمارت کے دروازے کو کھول دو۔ یا توڑ دو۔ کسی طرح مجھے باہر نکالو۔ ایک بلا میرے پیچھے پڑ گئی ہے......''

میری چیخ و پکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذرا دیر کے لئے ٹریفک رک گئی۔ راستہ چلنے والے کھڑے ہو گئے اور سر اٹھا اٹھا کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''سنو! وہاں اس کھڑکی سے کیسی آوازیں آ رہی ہیں۔''

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کتا بھونک رہا ہے۔'' دوسرے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

تیسرے نے کہا۔ ''ایسی آوازیں تو روز ہی سنائی دیتی ہیں۔ عورتوں اور بچوں نے

خوفزدہ ہو کر اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا ہے۔ پتہ نہیں اس عمارت میں کیسی بلا ہے جو کتے کی طرح بھونکتی رہتی ہے۔''

ان کی باتیں سن کر میں نے فوراً ہی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے حصے میں اپنا ہاتھ ڈال کر باہر کی طرف نکالا اور چیخ کر کہا۔

''میں کتا نہیں ہوں۔ تم لوگوں کی طرح ایک انسان ہوں۔ میرے اس ہاتھ کو دیکھو۔ مجھے پہچانو۔ ایک انسان کو کتا نہ سمجھو۔''

میں اپنا ہاتھ کھڑکی کے باہر لہرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگ سہم کر ذرا پیچھے چلے گئے۔ کچھ کمزور دل والے بھاگنے لگے۔ ایک نے چیخ کر کہا۔

''وہ دیکھو۔ وہ کوئی انسانی ہاتھ ہے۔ مگر گوشت پوست کا نہیں ہے۔ صرف ہڈیاں ہیں۔''

میں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا وہ بدستور گوشت پوست کا تھا لیکن ان احمقوں کو وہ کسی ڈھانچے کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ وہ سب بری طرح سہمے ہوئے تھے اور کھڑکی سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اس کھڑکی سے نکلا ہوا ہاتھ ان کے لئے عجیب تماشا بن گیا تھا۔ وہ سب بہت دور راستے کے دوسری طرف جا کر کھڑے ہو گئے تھے اور میری حالت یہ تھی کہ چیختے چیختے میرے حلق میں خراشیں پڑ گئی تھیں میں بار بار کھانس رہا تھا۔ پھر میں تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے۔ لہٰذا وہ میری آواز کو کتے کی آواز سمجھیں گے اور میرے ہاتھ کو کسی مُردہ انسان کے ڈھانچے کا ہاتھ سمجھ کر تماشا دیکھتے رہیں گے۔

میں کھڑکی سے پلٹ کر دوسرے کمروں میں گھومتے ہوئے فرار کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ آخر اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں سے سیڑھیاں تہہ خانے میں جاتی تھیں وہیں زینے کے اوپر سچے موتیوں کا ایک ہار جگمگا رہا تھا۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ہار کتنی مالیت کا ہے۔ میرے قدم اس کی طرف یوں گئے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف جاتا ہے۔ میں نے اسے جھک کر اٹھایا تو میری نظریں آگے دور تک گئیں۔ تہہ خانے کی سیڑھیوں پر نیچے تک سونے کی اشرفیاں، چاندی کے سکے اور بیش قیمت ہیرے جواہرات بکھرے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اتنی دولت میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ جانے تہہ خانے کے اندر کتنی دولت ہوگی۔ میں بے اختیار اس دولت کو سمیٹتا ہوا دوبارہ تہہ خانے کے فرش پر آ گیا۔ سوسن نے شاید اسی

خفیہ خزانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ فرش پر بکھرا ہوا خزانہ مسند تک چلا گیا تھا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ ڈھانچہ گاؤ تکیے پر ٹیک لگائے مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔

تب میری سمجھ میں آیا کہ دولت کا چارہ ڈال کر مجھے دوبارہ تہہ خانے میں بلایا گیا ہے۔ اتنی ساری دولت دیکھ کر میں وقتی طور پر بھول گیا تھا کہ فی الحال یہ عمارت میرے لئے قید خانہ ہے اور یہ جگہ میرا مدفن بن سکتی ہے۔ جب تک کہ یہاں سے آزادی نہ ملے یا فرار کا راستہ نہ ملے، اس وقت تک یہ ساری دولت بیکار تھی۔ میں انہیں دیکھ سکتا تھا، گن سکتا تھا لیکن خرچ نہیں کرسکتا تھا۔

وہ ڈھانچہ اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر ایک شانِ بے نیازی سے رکھتے ہوئے بولا۔

''میں سو سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اتنے عرصے کے بعد ملاقات ہوتے ہی تم مجھے چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہو۔ آخر تم کس لئے جانا چاہتے ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ مجھ میں کیا عیب ہے؟ ایسی کون سی خرابی ہے کہ تم نفرت سے منہ پھیر رہے ہو؟''

''خرابی؟'' میں نے چڑ کر کہا۔ ''تم تو سراپا خرابی ہو۔ تم نے اپنے خطوط میں سوسن عرف مہ لقا کا نام لکھ کر میرے تصور میں ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ کی تصویر بنا دی یہاں جس سوسن کی تصویر دکھائی، وہ بھی بلا کی حسین ہے لیکن تم خود کیا ہو۔ یہ آئینہ اٹھا کر دیکھو۔ میں تمہارے ہڈیوں کے ڈھانچے سے کس طرح محبت کرسکتا ہوں؟ نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ میں ایک ڈھانچے کے ساتھ اپنی جوانی برباد نہیں کرسکتا۔''

''تم احمق ہو۔'' ڈھانچے نے کہا۔ ''تم یہ نہیں سوچتے کہ مجھے گلے سے لگا کر دنیا کی تمام مسرتوں کو گلے سے لگا سکتے ہو۔ تم صرف یہ کیوں دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں ہمیشہ اس ڈھانچے میں نہیں رہوں گی۔ حسینہ بلقیس اور شہناز جیسی کتنی ہی دوشیزاؤں کے جسم حاصل کر کے تمہاری آغوش میں آتی رہوں گی۔''

اس کی یہ بات سن کر مجھے عقل آ گئی۔ میں بھول گیا تھا کہ وہ جب چاہے ایک نئی دوشیزہ کا جسم لے کر میرے پہلو میں آسکتی ہے۔ مجھے اس سے کسی طرح کا نقصان نہیں تھا۔ میں خواہ مخواہ اس سے پیچھا چھڑا رہا تھا۔ میں اس لحاظ سے بہت ہی خوش نصیب تھا کہ میری سو سالہ دلہن اپنے ساتھ شاہی خزانے لے کر آئی تھی۔ اس کے پاس دولت کی بھی ورائیٹز

تھیں اور دوشیزاؤں کی بھی۔ میں نے مطمئن ہو کر کہا۔

''ہاں۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ تم نت نئی دوشیزاؤں کے روپ میں آسکتی ہو۔ دیکھو میں دولت کا لالچی نہیں ہوں اور نہ ہی حسن و شباب کا رسیا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری محبوبہ گوشت پوست کی ہو اور میں اس کے ساتھ اپنا ایک گھر بساؤں۔''

''آہ!'' اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''ایک صدی پہلے ہم نے اپنا گھر بسایا تھا۔ اس گھر میں، میں نے تمہارے لئے ایک بیٹا پیدا کیا تھا۔ تمہیں تو کچھ بھی یاد نہ رہا لیکن ایک باپ کی حیثیت سے تمہیں اپنے بیٹے کو نہیں بھولنا چاہئے۔''

''یہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے کہ تم نے ایک صدی پہلے مجھ سے شادی کی تھی اور میرے لئے ایک بیٹا پیدا کیا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم سے غلطی ہو رہی ہو۔ تم اپنے محبوب یا خاوند کے دھوکے میں مجھے پکڑ لائی ہو۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے محبوب کو نہیں پہچانتی ہوں۔''

''اگر پہچانتی ہو تو بولو کیا اس کی صورت شکل میرے جیسی تھی۔ اس کی کوئی تصویر ہو تو دکھاؤ۔''

''اوں ہونہہ۔ اس کی ایک بھی تصویر میرے پاس نہیں ہے۔ میں جھوٹ نہیں کہوں گی۔ تمہاری صورت میرے محبوب جیسی نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم میرے وہی صد سالہ محبوب ہو۔ ان دنوں تمہارا نام دلاور خاں تھا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ میں تمہارے محبوب کا ہم نام نہیں ہوں۔ ہم شکل بھی نہیں ہوں۔ پھر تم کیسے کہتی ہو کہ میں تمہارا محبوب ہوں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نام اور شکل سے کیا ہوتا ہے؟ سو سال میں صرف چہرہ نہیں بلکہ سراپا بھی بدل جاتا ہے۔ جیسے کہ میں بدل گئی ہوں۔ پہلے ایک حسین دوشیزہ تھی اب ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں۔ اسی طرح پہلے تمہاری شکل کچھ تھی اب کچھ اور ہے۔ وقت اور زمانے کے ساتھ جو چیز نہیں بدلتی وہ انسان کے بدن کی مہک ہے۔ میں تمہارے پسینے کی مہک سے تمہیں پہچانتی ہوں۔ یہ مہک مجھے بتا دیتی ہے کہ تم کس وقت کس جگہ موجود ہو اور میں اسی جگہ پہنچ جاتی ہوں۔''

''کتنے ہی مردوں کے پسینے کی بو ایک جیسی ہوتی ہے۔ تم بو کی یکسانیت سے دھوکہ کھا رہی ہو۔''

''نہیں۔ بو کے متعلق تمہاری معلومات محدود ہیں۔ ہر انسان کی ایک مخصوص بو ہوتی ہے۔ شکاری کتے اس بو کی تمیز کرتے ہیں۔ جو لوگ سونگھنے کی غیر معمولی حس رکھتے ہیں وہی اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ میری حس بہت تیز ہے میں اس دنیا کے اربوں انسانوں کے درمیان تمہاری بو کو پالیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اس سلسلے میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ تم مجھے دلاور خاں کے متعلق کچھ بتاؤ۔ یعنی میرے ماضی کے متعلق بتاؤ کہ میں کون تھا اور تم سے میری شادی کیسے ہوئی تھی؟''

ڈھانچے کا سر جھک گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ ماضی کی یادوں کو ترتیب وار جمع کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''یہ 1840ء کی بات ہے۔ برطانیہ میں کالا علم جاننے والوں کو سزائے موت دی جاتی تھی یا انہیں ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔ میرے ڈیڈی بھی اس قانون کی زد میں آ گئے لیکن ان ہی دنوں حکومت برطانیہ کو ماہر جادوگروں کی ضرورت پیش آئی۔ بات یہ ہوئی کہ ہندوستان میں جتنے انگریز آباد ہو گئے تھے ان میں سے بعض اعلیٰ افسر عجیب و غریب بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے تھے۔ کبھی ان پر جنون طاری ہو جاتا تھا۔ کبھی ان کے بدن میں سوئیاں سی چبھتی رہتی تھیں اور کبھی وہ مردانہ اور زنانہ آوازوں میں مختلف بولیاں بولتے تھے۔ ان واقعات سے صاف ظاہر تھا کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں سے لڑتے وقت صرف اپنی طاقت اور ہتھیار استعمال نہیں کر رہے تھے بلکہ جادو ٹونے سے بھی ان کے قدم اس زمین سے اکھاڑنا چاہتے تھے۔

دشمنوں کو اپنے ملک سے بھگانے کے لئے جتنی جنگیں لڑی جاتی ہیں ان میں جادو ٹونے کی جنگ بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے لیکن تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں مؤرخین بعض اہم حقیقتوں کو نظر انداز کیوں کر دیتے ہیں اور حکومتِ وقت بھی عام حالات میں کالے علم کو غیر قانونی قرار دیتی ہے اور جب جان پر بن آتی ہے تو پھر اس علم کے جاننے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ سرکارِ برطانیہ نے بھی میرے ڈیڈی کو عزت و احترام کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا۔

یہاں آ کر ڈیڈی نے کتنے ہی انگریز افسروں کا کامیابی سے علاج کیا۔ اس سلسلے میں وہ یہاں کے خطرناک جادوگروں سے ٹکراتے رہے۔ ڈیڈی میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ

دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتے ہیں۔ یہاں پانچ سال کے عرصے میں انہوں نے کتنے ہی جادوگروں سے دوستی کر لی۔ میں اسی دیس میں پیدا ہوئی اور یہیں جوان ہوئی۔ اس دوران ڈیڈی یہاں کے علوم سیکھنے میں مصروف رہے۔ میں یہ نہیں جانتی کہ انہوں نے کس طرح ماہر جادوگروں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر کالی تنظیم کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ مجھے ان چیزوں سے دور رکھتے تھے۔ میری ممی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ڈیڈی نے کبھی ممتا کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ میں اپنے ڈیڈی سے زیادہ اس دنیا میں کسی کو نہیں چاہتی تھی لیکن ایک رات بڑے ہی ڈرامائی انداز میں تم میری زندگی میں آ گئے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے، بغاوتیں سرد پڑ چکی تھیں، صرف آزاد علاقے کے پٹھان ان کے لئے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ وہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں اکثر انگریز افسروں کے بنگلوں اور فوجی ٹھکانوں پر چھاپے مارتے تھے۔ ایسے ہی ایک حملے کے دوران تمہارے ایک پاؤں میں گولی لگ گئی۔ تم کسی طرح لنگڑاتے اور چھپتے چھپاتے ہمارے بنگلے میں آ گئے۔ میں بنگلے کے برآمدے میں ایک ایزی چیئر پر بیٹھی گنگنا رہی تھی۔ تم اچانک ہی نہ جانے کتنی آہستگی سے میرے پیچھے پہنچ گئے تھے کہ مجھے اس وقت علم ہوا جب تم نے پستول کی نالی میری کنپٹی سے لگا دی اور دوسرا ہاتھ میرے منہ پر رکھ کر کہا۔

''خبردار! اگر شور مچاؤ گی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

میں سہمی ہوئی نظروں سے تمہیں دیکھنے لگی۔ ہائے! تم کتنے خوبرو تھے، مگر کتنے خوفناک بن کر آئے تھے۔ کچھ دیر پہلے میں چاند کو تک رہی تھی۔ اپنے آئیڈیل کا تصور کرتی ہوں گنگنا رہی تھی۔ تصور میں جس گبھرو نوجوان کی تصویر بنائی تھی وہ ہو بہو تم ہی تھے مگر میں نے تمہارے ہاتھ میں ایک پھول دیکھا تھا اور تم پستول لے کر آئے تھے۔

اسی وقت میرے ڈیڈی برآمدے میں آ گئے۔ مجھے خطرے میں دیکھ کر انہوں نے شور نہیں مچایا۔ انہوں نے میری سلامتی کی خاطر تم سے وعدہ کیا کہ وہ تمہاری زخمی ٹانگ کا علاج کریں گے اور تمہیں پناہ بھی دیں گے۔ اس وقت تمہاری حالت غیر ہو رہی تھی۔ جہاں گولی لگی تھی، وہاں سے کافی خون بہہ چکا تھا اور تکلیف کی شدت سے تمہارا چہرہ تمتما رہا تھا۔ تمہاری حالت سے صاف ظاہر تھا کہ تم اب تب میں گرنے ہی والے ہو اور یہی ہوا بنگلے کے اندر ایک کمرے میں پہنچتے ہی تم گر کر بے ہوش ہو گئے۔

میں نے ڈیڈی سے کہا کہ ابھی میں ایسے ہی ایک شخص کا تصور کر رہی تھی اور ایسے ہی وقت پر یہ چلا آیا ہے۔آپ اسے بچا لیجئے۔ میں اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔

ڈیڈی بہت سمجھدار ہیں۔انہیں ایک تیر سے دو شکار کھیلنے کا موقع مل گیا۔انہوں نے مجھ سے کہا۔

''تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں حکومتِ برطانیہ کا وفادار ہوں۔ میں اپنے علم سے اس پٹھان کو تمہاری طرف مائل کر دوں گا۔اس کے بعد تمہارا یہ فرض ہوگا کہ تم اس سے حریت پسند پٹھانوں کے خفیہ اڈوں کا پتہ معلوم کرو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ یہ ہمیشہ تمہارا جیون ساتھی بنا رہے تو اسے ہماری حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش کرو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے تمہاری طرف دیکھا۔تم فرش پر بیہوش پڑے تھے۔ وہ تمہارے دونوں ہاتھ پکڑ کر تمہیں فرش پر گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئے ہیں۔ سمجھ گئی کہ وہ کسی عمل سے تمہارے زخم کو اچھا کریں گے۔ وہ مجھے انتظار کرنے کے لئے کہہ گئے تھے۔ اس لئے میں پھر برآمدے میں آ کر ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیڈی ایک کتے کو لے کر باہر آئے۔ کتا لنگڑا رہا تھا اور تکلیف سے کراہ رہا تھا۔انہوں نے بتایا کہ انہوں نے تمہاری ٹانگ کا آدھا زخم کتے کی ٹانگ میں منتقل کر دیا ہے۔باقی آدھا زخم تمہاری ٹانگ میں اس لئے رہنے دیا تھا کہ کہیں تم بھاگ نہ جاؤ۔''

ان کی ہدایت کے مطابق میں کمرے میں تمہارے پاس آئی۔تم ہوش میں آ گئے تھے اور اٹھ کر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میز پر ایک گلاس میں سرخ رنگ کا شربت رکھا ہوا تھا۔ڈیڈی نے کہا تھا کہ وہ شربت میں اپنے ہاتھ سے تمہیں پلاؤں گی تو تمہارا دل و دماغ میری طرف مائل ہو جائے گا۔

میں نے تمہیں بستر پر آرام سے لیٹنے کے لئے کہا مگر تم بھاگنے کی فکر میں تھے۔ ڈیڈی نے دانشمندی سے کام لیا تھا۔ تمہیں اس قابل نہیں رکھا تھا کہ وہاں سے جا سکو۔ میں نے کہا۔

''اگر تم جانا چاہتے ہو تو یہ شربت پی لو، تمہارے بدن میں توانائی آئے گی زخم اچھا ہو جائے گا پھر تم یہاں سے چلے جانا۔''

میری باتوں کا تم پر کسی حد تک اثر ہوا۔تم بستر کے سرے پر بیٹھ گئے۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے شربت پلانے لگی۔ شربت مزیدار تھا اور تم پیاسے تھے اس لئے غٹا غٹ پی

گئے۔ پھر گلاس خالی ہوتے ہی تم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔تمہاری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور تم جبراً آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے۔

''یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ہر طرف تم ہی تم نظر آ رہی ہو۔ یہاں بھی تم ہو، وہاں بھی تم ہو، حتیٰ کہ میرے دل اور دماغ میں بھی تم ہی ہو۔ کیا میں تم سے محبت۔ محبت............''

یہ کہتے کہتے تم بستر پر گر پڑے۔ تمہاری آنکھیں بند ہو گئیں۔تم پھر اس دنیا سے غافل ہو گئے۔ میں نے ڈیڈی کے پاس آ کر تمہارے متعلق بتایا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

''رات زیادہ ہو گئی ہے تم آرام کرو۔ وہ تمہیں چھوڑ کر اب کہیں نہیں جائے گا۔''

میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تمہاری صورت میری آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو تم دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔تم نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تم کون ہو؟ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک صدی سے تمہیں جانتا ہوں۔تم میرے سامنے نہیں تھے۔ پھر بھی تمہاری یہ نیلی آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ میں تمہیں سر کی چوٹی سے پاؤں کے انگوٹھے تک جانتا ہوں کیا تمہیں یاد ہے کہ ہم سو سال پہلے بھی ایک دوسرے سے مل چکے ہیں؟''

تم وہی باتیں کر رہے تھے جو آج کل میں تم سے کرتی ہوں۔ میں بھی تو یہی کہتی ہوں کہ میں تمہیں ایک صدی سے جانتی ہوں، لیکن تم یقین نہیں کرتے۔ میں نے اس وقت تمہاری باتوں کا یقین کر لیا۔ کیونکہ تم جو کچھ کہہ رہے تھے وہ سب طلسمی شربت کے زیر اثر کہہ رہے تھے۔

بہرحال اس شربت سے اتنا فائدہ پہنچا کہ پلک جھپکتے ہی ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔تم میرے ایسے دیوانے بن گئے تھے کہ اپنے آزاد علاقے کی طرف جانے کا راستہ ہی بھول گئے تھے لیکن اس شربت کی تاثیر محدود تھی۔ یعنی تم صرف میرے دیوانے تھے اور دیوانگی کے باوجود اپنے فرائض کو نہیں بھولے تھے۔ تم روزانہ ارادہ کرتے تھے کہ وہاں سے چلے جاؤ گے اور حریت پسندوں کے ساتھ مل کر پھر انگریزوں پر حملے کرو گے لیکن میری محبت تمہارا راستہ روک دیتی تھی۔ ویسے تمہاری محبت کچھ عجیب سی تھی تم مجھ سے عشق کرتے تھے لیکن تم نے مجھے کبھی سینے سے نہیں لگایا۔ نہ کبھی میرے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔تمہارے عقیدے کے مطابق میں تمہارے لئے حرام تھی، کیونکہ میں غیر مسلم تھی اور تمہاری منکوحہ نہیں

تھی۔ تم لوگ بھی عجیب مذہبی قسم کے ہوتے ہو۔ اپنے مذہبی احکامات سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تم ان احکامات کی پابندی کرتے تھے اس لئے میری قربت سے نہیں بہکتے تھے اور حریت پسندوں کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے انگریزوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا۔ تمہیں بہکانے کے لئے ضروری تھا کہ میں تمہیں اپنی جوانی کی شراب پیش کرتی اور تمہارے جیسا کٹر مسلمان نکاح کے بغیر مجھے ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتا تھا۔

آخر ڈیڈی نے یہی مناسب سمجھا کہ تمہارے ساتھ میری شادی کر دی جائے تم اپنی شرائط پر شادی کے لئے راضی ہو گئے۔ پہلے تم نے مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنایا۔ میرا نام سوسن رابرٹ کی بجائے مہ لقا رکھا پھر مجھ سے نکاح پڑھوایا۔ جب سہاگ رات آئی اور جب تم میرے جسم و جان کے مالک بن گئے تو میں اور زیادہ تمہیں دل و جان سے چاہنے لگی۔ مجھے یہ سوچ کر دکھ پہنچتا تھا کہ تم دانستہ مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو بلکہ طلسمی شربت کے زیر اثر مجھے چاہتے ہو۔

کالے علم کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس شخص پر زیادہ عرصہ تک جادو کا اثر نہیں رہتا جو صاحبِ ایمان ہوتا ہے۔ ہماری شادی کے بعد طلسمی شربت بھی پانی ہو گیا۔ تم اکثر تعجب سے سوچتے رہتے تھے کہ تم مجھ جیسی انگریز عورت کے قریب کیسے آ گئے تھے؟ کیسے ہمارے درمیان محبت ہوئی پھر شادی ہو گئی؟

بہرحال اس بات سے تمہیں تقویت حاصل ہوئی تھی کہ تم نے مجھے مسلمان بنا کر نیک کام کیا ہے اور اب میرے بطن سے جو بچے پیدا ہوں گے وہ مسلمان ہوں گے یہ درست ہے کہ میں مسلمان ہو گئی تھی مگر صرف تمہارا دل جیتنے کے لئے ورنہ تم مجھے جتنے عزیز تھے۔ اتنا ہی مجھے اپنا مذہب عزیز تھا۔ میں کبھی کبھی تم سے چھپ کر چرچ جایا کرتی تھی اور صلیب کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اعتراف کرتی تھی کہ میں نے دو مذہب اختیار کر رکھے ہیں۔ مگر میرے دل میں مسیح کی محبت ہے اور اسی دل میں تمہاری بھی محبت ہے۔ میں نے تمہاری محبت سے مجبور ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ جب میرے بچے ہوں گے تو میں انہیں عیسائی مذہب کی طرف رفتہ رفتہ مائل کروں گی۔

ایک سال کے بعد تم اچانک ہی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ تم مجھ سے قدرے بیزار رہنے لگے ہو اور اکثر بات بات پر جھنجھلاتے رہتے ہو لیکن میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم کچھ کہے سنے بغیر مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور پلٹ

کر کبھی خبر بھی نہ لو گے۔ تمہارے جانے کے چھ ماہ بعد میں نے تمہارے پیار کی نشانی کو جنم دیا۔ ڈیڈی نے مجھے سمجھایا کہ یہ مسلمان کی اولاد ہے اپنے باپ کی طرح ضدی ہو گی اور کبھی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ میں ابھی جوان ہوں۔ اگر اس بچے کو مار ڈالا جائے تو کسی انگریز سے میری شادی ہو جائے گی۔

میں نے اپنے ڈیڈی کو بری طرح ڈانٹ دیا کہ وہ میرے بچے کے متعلق ایسی باتیں نہ سوچیں۔ میں اس بچے کو اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی اور آخری سانس تک دلاور خاں کی واپسی کا انتظار کروں گی۔

سانسوں کا مسئلہ تو ڈیڈی نے حل کر دیا۔ انہوں نے مجھے اتنی طویل عمر دی ہے کہ میں خود نہیں جانتی کہ کتنی صدیوں کے بعد میری آخری سانس کا وقت آئے گا لیکن تمہارے بیٹے نے پندرہ برس کی عمر میں آخری سانس لے لی۔ کسی نے اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا تھا۔ اس کی لاش دیکھ کر میں نے ڈیڈی کی گردن دبوچ لی۔ میری دانست میں وہی میرے بچے کے دشمن تھے لیکن انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا کر کہا۔

”میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہاری خوشیوں کا دشمن نہیں ہوں۔ اگر تم میری بات تسلیم کر سکتی ہو تو کرو کہ تمہارے بچے کا قاتل تمہارا دلاور خان ہے جس کی واپسی کا تم فضول انتظار کر رہی ہو۔ اسی نے اپنے بیٹے کو قتل کیا ہے۔“

میں یقین نہیں کر سکتی تھی کہ تم اپنے بیٹے کے دشمن بن گئے تھے۔ مجھے دشمنی کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ڈیڈی نے کہا۔

”تمہیں یقین نہیں آتا ہے تو ذرا صبر کرو۔ میں نے تمہارے مقتول بیٹے کی زندگی کی بقیہ سانسیں بینک میں جمع کر لی ہیں جب بھی قاتل سامنے آئے گا تو میں تمہارے بیٹے کے نام سانسیں جاری کروں گا۔ وہ کسی پندرہ برس کے لڑکے کا جسم حاصل کر کے یہاں آئے گا اور اپنے ہاتھوں سے اپنے قاتل کا گریبان پکڑے گا۔“

”ڈیڈی!“ میں نے کہا۔ ”آپ مجھے بہلا رہے ہیں۔ کوئی باپ اپنی اولاد کا دشمن نہیں ہوتا۔ کیا آپ مجھ سے دشمنی کر سکتے ہیں؟ کبھی نہیں آپ مجھے نہیں مار سکتے۔ اسی طرح دلاور خان اپنے بیٹے کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کو اس پر شبہ ہے تو آپ اپنے کالے علم سے اس کا پتہ معلوم کریں، اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں۔ ابھی فیصلہ ہو جائے گا کہ قاتل کون ہے۔“

''میں اسے پکڑ کر نہیں لاسکتا۔ افسوس کہ میرے پاس کوئی ایسا علم نہیں ہے جو غیب کی باتیں بتادے۔ اگر میں کسی علم سے یہ معلوم کرسکتا کہ دلاور خان کہاں ہے تو یہ بھی معلوم کر لیتا کہ حریت پسندوں کے خفیہ اڈے کہاں کہاں ہیں۔ نہیں، میں ایسا کوئی علم نہیں جانتا۔''

''تو پھر آپ اسے تلاش کیجئے۔''

''میں تلاش بھی نہیں کرسکتا۔ تم دیکھ رہی ہو کہ ہم عارضی موت مر چکے ہیں اب ہم بینک سے سانسیں لے کر وقتی طور پر زندہ ہو سکتے ہیں۔ میں صرف دلاور خان جیسے ایک قاتل کو تلاش کرنے کے لئے اپنی سانسیں ضائع نہیں کرسکتا۔ ہمیں بچت کی عادت ڈالنی چاہئے۔ ہم جتنی سانسیں بچائیں گے آئندہ اتنی ہی صدیوں تک زندہ رہیں گے۔

اسے تلاش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ تم دعویٰ کرتی ہو کہ دلاور خان کے بدن کی مہک کو دور سے پہچان سکتی ہو۔ اگر تم چاہو تو ابھی کسی لڑکی کا جسم حاصل کر کے اپنے سونگھنے کی قوت سے کام لے سکتی ہو۔ تمہیں فوراً ہی پتہ چل جائے گا کہ دلاور خان اس وقت کہاں ہے؟''

☆======☆======☆

میں نے اسی وقت ڈیڈی کے مشورے پر عمل کیا۔ میں نے اپنے بیٹے کی لاش پر ماتم کرنے کے لئے اڑتالیس گھنٹے کی سانسیں حاصل کی تھیں۔ میرے دماغ میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں اپنے معصوم بچے کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کرسکتی تھی۔ خواہ وہ قاتل تم ہی کیوں نہ ہوتے۔ یہ درست ہے کہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ میری محبت کی انتہا یہ ہے کہ میں ایک صدی سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے بچے کے قاتل کو معاف کر دوں۔ تم مجھ سے بیزار ہو گئے تھے۔ میں نے تمہارا رویہ برداشت کرلیا۔ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ صدمہ بھی سہہ لیا لیکن تم میرے جگر کے ٹکڑے کو ہلاک کر دو۔ یہ ظلم میں برداشت نہیں کرسکتی۔ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں محض ڈیڈی کے بہکانے کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ ورنہ کوئی میرے دل سے پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ میرا دلاور اس بچے کا قاتل نہیں بن سکتا جو ہم دونوں کی مشترکہ محبت کی یادگار تھا۔

میں نے ڈیڈی کو تمہارے بے گناہی کا یقین دلانے کے لئے ایک نوجوان لڑکی کا جسم حاصل کیا اور تمہاری تلاش میں نکل گئی۔ میں نے سونگھنے کی قوت سے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب ہر سمت تمہارے بدن کی مخصوص مہک کو تلاش کیا لیکن وہ بو مجھے کہیں نہ ملی۔ میں نے یہاں آکر ڈیڈی کو بتایا کہ دلاور کی بو کہیں گم ہو گئی ہے۔''

ڈیڈی نے کہا۔''دلاور کی بو گم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دلاور مر گیا ہے۔ قبر میں سونے والے مردے کی بو منوں مٹی تلے دب کر رہ جاتی ہے اس لئے اب یقین کرلو کہ وہ مر چکا ہے اور اب وہ واپس نہیں آسکے گا اور نہ ہی تم اپنے بچے کے قتل کا بدلہ لے سکو گی۔''

میں نے غصے سے تلملا کر کہا۔''آپ مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں آپ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ دلاور خان مر چکا ہے۔ آپ میرے بیٹے کو ہلاک کر کے خواہ مخواہ دلاور خاں کو قاتل بنا رہے ہیں۔''

''بیٹی تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہارے بیٹے کا قاتل نہیں ہوں۔''

"تو پھر مائیکل نے اسے قتل کیا ہوگا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر یہ نہیں چاہتا
کہ ہمارے درمیان دلاور خان کا بیٹا پرورش پاتا رہے۔"
"تم مائیکل پر شبہ نہ کرو۔ وہ خون خرابہ پسند نہیں کرتا۔ اس نے تمہارے بیٹے کو ہلاک
نہیں کیا ہے۔"
"تو پھر حکومت کے کسی اعلیٰ افسر نے حکم دیا ہوگا کہ ایک باغی پٹھان کا بیٹا ایک انگریز
کے ہاں پرورش نہ پائے۔ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے قتل کرادیا گیا۔"
"نہیں۔ حکومت کے کسی افسر کی طرف سے ایسا حکم جاری نہیں ہوا تھا۔ دیکھو بیٹی، ہم
اپنی زندگی میں حکومتِ برطانیہ کے وفادار رہ چکے ہیں۔ اس لئے تم حکومت کو کوئی الزام نہ
دو۔ اصل بات یہ ہے کہ تم اس ضدی اور مغرور پٹھان کی محبت میں پاگل ہوگئی ہو، اسی لئے
اسے قاتل تسلیم کرنے سے انکار کر رہی ہو۔"
"میں کسی ثبوت کے بغیر اسے قاتل نہیں سمجھوں گی۔ آپ ایک ایسے شخص پر الزام
عائد کر رہے ہیں جو اپنی بے گناہی ثابت کرنے اب اس دنیا میں نہیں آئے گا۔"
"کیوں نہیں آئے گا؟" ڈیڈی نے کہا۔ "تمہارا دلاور خان پھر ایک بار اس دنیا میں
جنم لے گا۔ میری زندگی کا ایک بڑا حصہ ہندو جادوگروں کے ساتھ گزرا ہے۔ ہندو دھرم میں
یہ عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر کسی روپ میں جنم لیتا ہے یعنی بار بار مرتا ہے اور بار
بار جنم لیتا ہے۔ میں آواگون کے اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہوں۔"
"میں آواگون کے نظریہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ پھر میں کیسے یقین کروں کہ دلاور مرنے
کے بعد دوسری بار جنم لے گا؟"
"تمہیں یقین کرنا چاہئے۔ دیکھو نا! آخر ہم بھی بار بار مرتے ہیں اور بینک سے
سانسیں لے کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ جب ہم جیسے انسان کالے علم سے ایسا کرسکتے ہیں تو پھر
بھگوان یا ہمارا گاڈ انسانوں کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کیوں نہیں کرسکتا؟ تم یقین کرو۔
تمہارا دلاور خاں کبھی نہ کبھی دوبارہ جنم لے گا۔ وہ جب بھی جنم لے گا تمہیں اس کے بدن کی
مخصوص مہک سے پتہ چل جائے گا کہ وہ اس دنیا میں آگیا ہے۔"
ڈیڈی نے ہمارے بار بار مرنے اور زندہ ہونے کی ایسی مثال پیش کی تھی کہ میں نے
آواگون کے فلسفہ پر یقین کرلیا۔ دراصل اس طرح تمہیں دوبارہ دیکھنے اور پالینے کی
امیدیں روشن ہوگئی تھیں۔ میں نے سوچا۔ جب تم دوسری بار پیدا ہوگے اور مجھ سے ملاقات

کروگے تو پھر ہم دونوں مل کر اپنے بیٹے کے قاتل کو تلاش کریں گے.........."
یہ کہہ کر سوسن عرف مہ لقا خاموش ہوگئی۔ وہ میرے سامنے ہڈیوں کے ڈھانچے کی
صورت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک ڈھانچے کو بولتے دیکھ کر اور اس کے منہ سے تمام داستان
سن کر مجھے یقین آگیا کہ اس کی داستان میں کسی حد تک سچائی ہے لیکن جو بات قابلِ قبول
نہیں تھی اس کے متعلق میں نے کہا۔
"سوسن! میں مسلمان ہوں اس لئے آواگون کے مذہبی فلسفے کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم
مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے۔ اس لحاظ سے
تمہارا دلاور خان سو سال پہلے مرچکا ہے۔ اب وہ قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔ تم مجھے
خواہ مخواہ دلاور خان نہ سمجھو۔ نہ میں نے کبھی تم سے عشق کیا تھا نہ کبھی شادی کی تھی اور نہ ہی
میں تمہاری کوکھ سے جنم لینے والے کسی بچے کا باپ ہوں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ میرا
پیچھا چھوڑو اور مجھے یہاں سے جانے دو۔"
"میرے شہزادے! میرے دلاور! تم واقعی اپنے ماضی کو بھول چکے ہو تم مجھے پہچاننے
سے انکار کر رہے ہو۔ مگر میں تمہارے بدن کی مہک سے تمہیں پہچان رہی ہوں۔ ابھی ہمارا
بیٹا یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ وہ بھی تمہیں پہچان لے گا۔ تم نے مجھے گلے لگانے سے انکار کر
دیا تھا۔ کیا اپنے بیٹے کو بھی سینے سے نہیں لگاؤ گے۔"
میں پریشان ہو کر اس ڈھانچے کو دیکھنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس
طرح اس کی غلط فہمی دور کروں۔ پھر میری نظریں بیش قیمت ہیرے جواہرات کی طرف بھٹکنے
لگیں۔ یہ بات فوراً ہی میرے دماغ میں آئی کہ سوسن نے یہ بے شمار دولت صرف اپنے
محبوب دلاور خاں کے لئے جمع کی ہے۔ اگر میں نے دلاور خان بننے سے انکار کیا تو
زبردست نقصان اٹھاؤں گا۔ وہ دولت مجھے نہیں ملے گی اور نہ ہی سوسن مختلف دوشیزاؤں
کے روپ میں آکر میرا دل بہلائے گی اور اگر میں تسلیم کرلوں کہ میں دلاور خاں ہوں تو پھر
وہ مجھے اپنا محبوب اپنا خاوند سمجھ کر کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ رنگ محل سے باہر جانے کا
راستہ بھی کھول دے گی اور باہر کی کھلی دنیا میں دوسری لڑکیوں کے روپ میں مجھ سے ملتی
رہے گی اور میں دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت لٹاتا رہوں گا۔
یہ سب کچھ سوچ کر میں نے اس سے کہا۔ "اچھی بات ہے سوسن! تم ایک صدی سے
مجھے جانتی ہو اس لئے غلطی نہیں کرسکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں دلاور خان ہوں۔ مجھے

یاد نہیں ہے کہ میں سو سال پہلے تمہیں کس لئے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا مگر تمہارے صد سالہ انتظار نے یقین دلایا ہے کہ تم میری وفادار ہو اور میرے لئے جی رہی ہو۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ آؤ اب میں تمہیں گلے سے لگاؤں گا۔''

میں نے اسے آغوش میں بلانے کے لئے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ وہ خوش ہو کر مسند سے اٹھ گئی اور اپنے بدن کی ہڈیاں لچکاتی ہوئی میرے سینے سے آ کر لگ گئی آہ! آج تک کسی نے کسی ڈھانچے کو اتنی محبت سے اپنی آغوش میں نہیں لیا ہو گا لیکن میں مجبور تھا۔ اس وقت ڈھانچے کی صورت میں تمام دولت میرے بازوؤں میں سمٹ آئی تھی۔

اسی وقت تہہ خانے کے اوپر دور کہیں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ سوسن نے کہا۔

''رنگ محل کا بیرونی دروازہ کھل رہا ہے۔ ہمارا بیٹا یہاں پہنچ گیا ہے۔''

میں اس سے الگ ہو کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب دیکھنے لگا۔ سناٹے میں چھت کے اوپر قدموں کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ پھر یہ آواز زینے کی طرف آ گئی۔ چند لمحے بعد زینے سے اترنے والے پاؤں نظر آنے لگے۔

سب سے پہلے ایک معمر شخص تہہ خانے میں آیا۔ اس کے دانتوں میں ایک سگار دبا ہوا تھا۔ اس نے ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہیلو سوسن! مجھے پہچانو۔ ہم تو ہر بار نئے روپ میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''

ڈھانچے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اوہ ڈیڈی! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔''

اس نے اپنے استخوانی ہاتھ اپنے باپ رابرٹ ہومن کے شانوں پر رکھ دیئے رابرٹ نے ڈھانچے کے رخسار کو بوسہ دینے کے بعد کہا۔

''سوسن! یہ دیکھو تمہارا بیٹا بھی نئے روپ میں آیا ہے۔''

ایک پندرہ برس کا لڑکا زینے سے اترتا ہوا ڈھانچے کے پاس آیا اور اسے ممی کہتے ہوئے لپٹ گیا۔ رابرٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوں! تو یہی دلاور خان ہے۔''

میں نے آس پاس بکھری ہوئی دولت پر ایک نظر ڈالی پھر سینہ تان کر کہا۔ ''ہاں! میں دلاور خان ہوں۔''

میرا اعتراف سنتے ہی پندرہ برس کا لڑکا سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور میری طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

''ممی۔ یہی میرا قاتل ہے اسی نے میرا گلا دبوچ کر مجھے مار ڈالا تھا۔''

اس کی بات سن کر میں بوکھلا گیا۔ سوسن بھی پریشان ہو کر میرا منہ تکنے لگی وہ اب بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میں اس کے بیٹے کا قاتل ہوں۔ مگر قتل ہونے والا بیٹا خود اپنے قاتل کو پہچان رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ کر عاجزی سے بولی۔

''بیٹے! ذرا سوچ کر کہو۔ اگر تم نے دلاور خان کو قاتل کہا تو میری صد سالہ محبت ڈگمگا جائے گی۔''

بیٹے نے پوچھا۔ ''ممی! پہلے یہ بتایئے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ یہی میرا مسلمان باپ ہے؟''

سوسن نے جواب دیا۔ ''ہاں مجھے یقین ہے۔ میں دلاور کو اس کے بدن کی مہک سے پہچان لیتی ہوں۔ اب اس نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ یہ دلاور خان ہے۔''

میں نے بوکھلا کر فوراً ہی کہا۔ ''نہیں۔ میں دلاور خان نہیں ہوں۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ مجھے ایک ناکردہ قتل کے الزام میں پھانسا جا رہا ہے۔ یہ کیسا ظلم ہے۔ سو سال پہلے جو قتل ہوا تھا، آج اس کی سزا مجھ بے گناہ کو دینا چاہتے ہو۔''

رابرٹ نے غرا کر کہا۔ ''تم مجرم ہو۔ تمہاری شناخت ہو چکی ہے۔ اول تو سوسن نے تمہاری مخصوص مہک سے تمہیں پہچان لیا ہے۔ دوم یہ کہ تم سوسن کے سامنے خود کو دلاور خاں کہہ چکے ہو۔ اب سزا کے خوف سے انکار کرو گے تو یہ تمہاری حماقت ہو گی۔ تم سو سال پہلے بھی دلاور خاں تھے اور اب بھی دلاور خاں ہو۔''

سوسن نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ ''دلاور! تم پر سے میرا اعتماد ڈگمگا گیا ہے پھر بھی میں اپنے بیٹے سے پوچھتی ہوں کہ آخر تم نے اسے کیوں ہلاک کیا تھا۔''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''ممی میں بھی کبھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ میرا باپ مجھے ہلاک کرے گا لیکن ایک روز جب میں سکول سے واپس آ رہا تھا تو اس نے پیچھے سے آ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے اٹھا کر دور ایک جھاڑی کے پیچھے لے گیا۔ وہاں میرا گلا دبوچ کر کہنے لگا۔

''تم میرے بیٹے ہو مگر تمہیں بیٹا کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ میں نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ وہ تمہیں اسلامی تعلیم دے لیکن اسے اپنا مذہب پسند ہے۔ وہ تمہیں کلام پاک کی بجائے بائبل پڑھاتی ہے۔ مسجد کے بجائے چرچ میں جانے کیلئے کہتی ہے۔ میں مجبور ہوں

کہ تمہاری پرورش نہیں کر سکتا۔ انگریزوں سے ایک طویل جنگ جاری ہے۔ نہ جانے ہماری کتنی نسلیں یہ جنگ لڑتی رہیں گی۔ مگر میں تمہیں اپنی آئندہ نسل نہیں کہہ سکتا۔ بولو، میرے ساتھ چلو گے۔ میرے ساتھ بندوق چلاؤ گے یا انگریز بن کر رہنا پسند کرو گے؟''

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میری ممی انگریز ہیں۔ میرے گرینڈ فادر انگریز ہیں۔ میں بھی انگریز ہوں۔ چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو............''

لیکن اس دشمن نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میری گردن پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''میرے نطفے سے پیدا ہونے والا کافر بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تو زندہ رہا تو میں شرم سے مر جاؤں گا لیکن مجھے وطن کے لئے لڑنا ہے اس لئے تو مر جا............''

یہ کہہ کر اس نے پوری قوت سے میرا گلا گھونٹ دیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میں مر گیا تھا۔ اگر گرینڈ فادر میرے نام سانسیں جاری نہ کرتے تو میں اپنے ہی قاتل کی شناخت کے لئے یہاں نہ آ سکتا۔ ممی! آپ اسے کڑی سے کڑی سزا دیں تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔''

سوسن کا بیٹا اپنا بیان دے کر خاموش ہو گیا۔ سوسن نے میری طرف گھوم کر غراتے ہوئے کہا۔

''ہوں! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم ہی میرے بیٹے کے قاتل ہو۔ کیونکہ سو سال پہلے تم مجھ سے اسی موضوع پر لڑتے رہتے تھے کہ تمہارا بیٹا انگریز نہیں بنے گا۔ مسلمان بنے گا۔ ایک بار ڈیڈی اسے اپنے ساتھ چرچ لے گئے تھے، تو تم نے ڈیڈی سے بھی جھگڑا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر تمہارے بیٹے کو عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی تو تم بیٹے کو کافر بن کر زندہ نہیں رہنے دو گے، اسے مار ڈالو گے اور تم نے اسے مار ڈالا۔ میں اپنے بیٹے کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہیں بھی مار ڈالوں گی۔''

میں گھبرا کر ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔ رابرٹ اور سوسن کا بیٹا اب تہہ خانے سے واپس جا رہے تھے۔ میرے دل پر سے ذرا بوجھ ہلکا ہوا۔ میں نے سوچا کہ وہ دونوں چلے جائیں گے تو میں اکیلا سوسن سے نمٹ لوں گا۔ جب وہ اوپر چلے گئے تو اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ دونوں رنگ محل کے دروازے سے باہر جائیں گے مجھے بھی ان کے ساتھ باہر نکلنا چاہئے۔

یہ سوچتے ہی میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آیا۔ اوپر ایک کمرے میں رابرٹ اور سوسن کے بیٹے کے جسم بے جان پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں چھو کر دیکھا وہ دونوں عارضی طور پر حاصل کئے ہوئے جسموں کو چھوڑ کر اپنی کالی دنیا میں چلے گئے تھے۔

میں غصے سے طنطناتا ہوا تہہ خانے میں آیا۔ سوسن کے قریب پہنچتے ہی اس نے ایک طمانچہ میرے منہ پر جڑ دیا۔ ہڈیوں والے ہاتھ کا طمانچہ کھاتے ہی میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میں غلطی سے اب تک اپنے محبوب کا انتظار کرتی رہی۔ دراصل مجھے اپنے بیٹے کے قاتل کا انتظار کرنا چاہئے تھے۔ بہرحال تم قاتل کے روپ میں سامنے آ گئے ہو، اب تم یہاں تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر مرو گے۔''

میں نے چیخ کر کہا۔ ''شیطان کی بچی تو میری جان کی دشمن کیوں بن گئی ہے میں تنہا اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا۔ تو زبردستی مجھے دلاور خاں بنا کر یہاں لے آئی ہے۔

اُلو کی پٹھی! دلاور خاں شیر کا بچہ تھا۔ تیری پوری قوم اسے نہ مار سکی وہ ایک غیرت مند مسلمان تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی غیر اسلامی زندگی کو پسند نہیں کیا۔ وہ تیرے حسن و شباب کے آگے نہ جھکا۔ تیرے باپ کا طلسمی شربت بھی اس کے ایمان کو نہ ڈگمگا سکا۔ تم سب اسے ہزار کوششوں کے باوجود نہ مار سکے اس لئے اب سو سال بعد اس کی پرچھائیں کو مار کر انتقام لینا چاہتے ہو۔

اپنے آواگون کے عقیدے کے مطابق تم مجھے دلاور خاں کہہ سکتی ہو لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا عقیدہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد صرف قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا اور یاد رکھ! مجھے بزدل اور کمزور نہ سمجھنا۔ میں یہاں کے کھڑکیاں اور دروازے توڑ کر باہر چلا جاؤں گا۔ تو میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔''

یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ ہڈیوں کے ایک کھلونے کی طرح الٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اسے دوبارہ اٹھنا چاہئے تھا لیکن وہ بے جان پڑی رہی۔ میں نے جھک کر اسے ہلایا۔ پھر جھنجھوڑا لیکن وہ بھی اپنے باپ کی کالی دنیا میں جا چکی تھی۔

میں تیزی سے بھاگتا ہوا تہہ خانے کے اوپر آیا اور مختلف کمروں کی کھڑکیوں کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یوں لگتا ہے کہ یہ سب فولاد کی بنی ہوئی ہیں یا پھر یہ کوئی طلسم کدہ ہے۔ ایک بار اندر آنے کے بعد باہر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔

آہ! میری داستان کو اگر غور سے پڑھا جائے تو میں ابتدا ہی سے بھول بھلیوں میں الجھتا ہوا اس مقام تک آ پہنچا ہوں۔ آہ! میں اپنی دنیا میں کتنی چالاکیوں سے دوسروں کو فریب دیتا تھا۔ معقول معاوضہ لے کر قتل بھی کرتا تھا۔ آج تک قانون کے ہاتھ مجھے گرفت میں نہیں لے سکے اور یہاں ایک ناکردہ قتل کے الزام میں موت کی سزا کاٹ رہا ہوں۔

یہ موت کی سزا ہے کیونکہ اس عمارت میں کھانے کے لئے ایک دانہ اور پینے کے لئے ایک قطرہ پانی نہیں ہے۔ بے شمار دولت ہے لیکن اس دولت سے میں ایک لمحہ کی زندگی نہیں خرید سکتا۔ کوئی باہر سے میری مدد کے لئے نہیں آ سکتا میں اندر سے مدد کے لئے چیختا ہوں تو باہر والے کہتے ہیں کہ کتا بھونک رہا ہے۔

آخر سوچ سمجھ کر میں نے کاغذ قلم اٹھا لیا ہے اور اپنی داستانِ حیات کو اختتام تک پہنچا رہا ہوں اسے ختم کرنے کے بعد میں اسے پلاسٹک کے ایک تھیلے میں لپیٹ کر کھڑکی کے اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر پھینک دوں گا۔

اگر آپ اس راستے سے گزرنے کے عادی ہیں یا کوئی بھولے بھٹکے مسافر ہیں اور اس عمارت کے نیچے سے گزرتے وقت آپ نے اس پلاسٹک کے تھیلے کو اٹھا لیا ہے اور میری تحریر نکال کر پڑھ رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ میری مدد کو ضرور پہنچیں گے۔

اگر یہ پلاسٹک کا لفافہ وقت گزرنے کے بعد ملے اور آپ دوسرے لوگوں کی مدد سے دروازہ توڑ کر اندر آئیں تو آپ کو پانچویں کمرے میں دو ڈھانچے ملیں گے۔ ایک رابرٹ کا اور دوسرا سوسن کے بیٹے کا۔ جب آپ تہہ خانے میں پہنچیں گے تو خوابگاہ میں "مزید" ڈھانچے نظر آئیں گے۔ ایک ڈھانچہ سوسن کا اور دوسرا شہناز کا۔ جب آپ خوابگاہ سے باہر آئیں گے تو بے شمار ہیرے جواہرات کے ڈھیر میں ایک تنہا ڈھانچہ نظر آئے گا، وہ میرا ڈھانچہ ہوگا۔ یہی حیاتِ انسانی کا ختم شدہ ہے۔

☆======☆======☆

آتشِ زر

ایک پُراسرار قبر کی کہانی جس سے چنگاریاں پھوٹتی تھیں۔ اس قبر میں ایک عظیم خزانہ دفن تھا۔ جو بھی قبر کھودنے کی کوشش کرتا جل کر راکھ ہو جاتا۔

عادل ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو وہ ریسٹورنٹ اس کے پیٹ کی طرح خالی پڑا ہوا تھا۔ وہاں صرف ایک ہی احمق نظر آیا جو ہال کے وسط میں بیٹھا ہوا بھوجن میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑی سی پیتل کی تھالی میں پوریوں کا ڈھیر تھا اور پیتل کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں آلو اور کدو کی بھاجی، مسور کی دال، آم اور لیموں کا اچار اور خستہ پاپڑ مختلف ڈشوں کی صورت میں بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ اس ہندوستانی بھوجن کو دیکھتے ہی عادل کا خالی پیٹ کچھ اور خالی ہو گیا۔

وہ اس شہر میں اجنبی تھا اور دو دن کا بھوکا، اجنبی اس لئے تھا کہ پاکستان سے گردنیہ پاسپورٹ پر آیا تھا۔ گردنیہ پاسپورٹ سے مراد یہ ہے کہ وہ غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کرانے والے دلالوں کو کچھ روپے دے کر وہاں چھ ماہ قبل پہنچا تھا۔ اس وقت وہ دس برس کا بچہ تھا اس کے چچا نے اسے اس کی ماں سے نفرت دلائی تھی۔ کیونکہ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد وہ بیس برس تک اپنی ماں سے الگ رہا تھا۔ اس دوران اسے چچا کی محبت اور ماں کی ممتا کا فرق معلوم ہوتا رہا۔ اس کے چچا چچی اور دوسرے رشتے دار اس سے ایسا سلوک کرتے تھے جیسے وہ کوئی ملازم ہو۔ اس نے بمشکل چھ سات جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اس کے بعد اسے کام پر لگا دیا گیا تھا۔ چچا نے، جو اسے بیٹا بنا کر لائے تھے اپنا ڈرائیور بنا کر رکھ لیا تھا۔ ایسے وقت اسے اپنی ماں یاد آئی ماں سے ملنے کے لئے اس نے تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کئے اور وہ پیسے سرحد پار کرانے والے ایک دلال کو دے کر ماں تک پہنچ گیا۔ جب وہ ماں کے پاس پہنچا تو وہ بسترِ علالت پر تھی بیٹے کو دیکھتے ہی جیسے دوبارہ جی اٹھی۔ پانچ ماہ تک وہ اپنی ماں کی خدمت کرتا رہا لیکن ماں بیٹوں کی ملاقات بہت مختصر ثابت ہوئی۔ وہ بیٹے کو تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کا سوتیلا باپ اچھا خاصا دولت مند تھا۔ اس کا ایک سوتیلا بھائی بھی تھا جو اسے برداشت نہ کر سکا۔ دونوں ایک ہی ماں کے بیٹے تھے لیکن جائیداد سوتیلے بھائی کے باپ کی تھی۔ لہٰذا وہ ماں کی موت

کے بعد ایک ماہ سے زیادہ وہاں نہ رہ سکا۔ جب وہ اس گھر سے نکلا تو اس کی جیب میں پچیس روپے تھے اس کے سوتیلے بھائی اور باپ نے اسے اتنی رقم بھی نہیں دی تھی کہ وہ اپنے ملک واپس جا سکے۔ اس نے سوچا تھا کہ محنت مزدوری کرے گا اور اچھی خاصی رقم جمع کرنے کے بعد پاکستان واپس چلا جائے گا لیکن یہاں جنتا مہنگائی کا رونا رو رہی تھی اور روٹی اور روزگار کے لئے آئے دن ہنگامے کرتی رہتی تھی۔ ایسی صورت میں بھلا ایک پردیسی کو کام دھندا کہاں سے ملتا۔ پانچ ہی دن میں اس کے پچیس روپے پیٹ کی آگ بجھانے کا ایندھن بن گئے اب وہ پچھلے دو دن سے بھوکا تھا اور اس کی جیب میں صرف آٹھ آنے رہ گئے تھے۔

اس نے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر سوچا کہ آٹھ آنے میں دو پوریاں آئیں گی اور تھوڑی سی بھاجی مفت مل جائے گی۔ دو دن کی بھوک دو ہلکی پھلکی پوریوں سے نہیں مٹے گی لیکن اس کے ساتھ تین گلاس پانی پی لیا جائے تو شام تک تسلی ہو جائے گی۔ پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ریسٹورنٹ میں کوئی مہربان شخص مل جائے اور اس کی دو دن کی بھوک سے متاثر ہو کر اسے اپنے کھانے میں شریک کر لے۔

یہ سوچ کر وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا شاید اسی لئے ریسٹورنٹ خالی تھا صرف وہی ایک شخص ہال کے وسط میں ایک میز پر پیتل کی تھالی سجائے اخبار پڑھنے اور بھوجن کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے ململ کی ایک دھوتی اور سفید کھدر کا کرتا پہن رکھا تھا جس کے اوپر عمدہ تراش کی واسکٹ تھی۔ اس کا پیٹ مٹکے کی طرح نکلا ہوا تھا۔ وہ کافی صحت مند تھا لیکن جسم پر گوشت کی بجائے چربی زیادہ تھی۔ اسے دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ اسے کھانے سے زیادہ اخبار پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ یہ دیکھ کر عادل کو کوفت ہو رہی تھی اس کے بھوکے نظریئے کے مطابق انسان کو تمام چیزوں سے زیادہ کھانے سے دلچسپی رکھنی چاہئے لیکن وہ کھانے کو ایسے برت رہا تھا جیسے بھوک یا روٹی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

وہ اس کے قریب ہی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا اور چور نظروں سے اس کے نوالے گننے لگا۔ تہذیب کا تقاضا تھا کہ وہ خاموش بیٹھا مزیدار چیزوں کو ایک بڑے پیٹ والے کے پیٹ میں اترتا دیکھتا رہے۔ اس کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس دھوتی والے کو دھکا دے کر وہ تمام لذیذ کھانے ایک ہی سانس میں ہڑپ کر جائے۔ وہ صرف ایسا سوچ سکتا تھا لیکن بھوکے پیٹ کسی کو دھکا دینے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ ہوٹل کا مالک کاؤنٹر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بیرا شاید باورچی خانے میں مصروف تھا۔ اس لئے کوئی فوراً ہی اس کے پاس آرڈر لینے نہیں

آیا۔

اتنے میں باہر سے کسی کار کا ہارن سنائی دیا۔ ہارن کی آواز پر بڑے پیٹ والے نے چونک کر ریسٹورنٹ کے باہر دیکھا۔ وہاں ایک لمبی سی قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شاید کوئی خوبصورت سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے بھوک کے باعث اس دنیا کی کوئی خوبصورتی نظر نہیں آرہی تھی اس لئے اس نے کار والی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جب وہ سیٹھ اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسٹورنٹ کے باہر کار کی طرف چلا گیا تو میز پر پھیلا ہوا وہ کھانا یوں نظر آیا جیسے دیالو سیٹھ اس کے سامنے اپنی تجوری کھول کر چلا گیا ہو کہ لو بیٹا جو پسند آئے اس پر ہاتھ صاف کر دو۔

اس کے دل نے کہا کہ سیٹھ کو دھکا دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود ہی باہر چلا گیا۔ دوسری طرف ہوٹل کا مالک آنکھیں بند کئے خراٹے لے رہا تھا۔ اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو وہ اپنی بھوک کبھی نہ مٹا سکے گا۔ ایسا تو ممکن نہیں ہے کہ کھانا خود ہی چل کر اس کے پاس آئے۔ اسے خود وہاں تک چل کر جانا ہوگا۔

اور وہ وہاں تک پہنچ گیا اس نے ایک نظر بڑے پیٹ والے پر ڈالی وہ کار کی کھڑکی پر جھکا ہوا کار والی سے مصروفِ گفتگو تھا۔ وہ جلدی جلدی پوریاں اٹھا کر ایک ایک پوری کو ایک نوالہ بنا کر حلق میں اتارتا گیا۔ ہر لمحہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ کھانے کا اصل حقدار اچانک ہی اس کے سر پر آپہنچے گا۔ اس اندیشے کے پیشِ نظر اس نے چند پوریاں بھاجی اور کچھ پاپڑ اٹھا لئے اور اپنی میز پر واپس آکر بیٹھ گیا۔ اس کی میز پر بھی ایک ہندی اخبار رکھا ہوا تھا وہ ہندی پڑھنا نہیں جانتا تھا پھر بھی اس نے اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا تا کہ کھاتے وقت پردہ رہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ بڑے پیٹ والا اپنی جگہ واپس آکر بیٹھ گیا اس نے ایک نظر عادل پر ڈالی، عادل کے سامنے اخبار کا پردہ تھا اس لئے وہ نظر نہیں آیا، وہ بھی اپنا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس نے اس بات پر توجہ نہیں دی تھی کہ اس کی تھالی سے پوریاں اور بھاجیاں کم ہوگئی تھیں۔ چند منٹ بعد ایک بیرا کچن سے نکل کر عادل کی طرف جانے لگا تا کہ نئے گاہک سے کچھ آرڈر لے سکے لیکن اس بڑے پیٹ والے نے بیرے کو اپنی طرف بلا لیا۔ عادل کبھی کبھی اخبار کے پیچھے سے اس بڑے پیٹ والے کو دیکھ لیتا تھا۔ جب بیرا اس کے نزدیک آنے لگا تو اس نے سوچا کہ پوریاں تو مفت مل چکی ہیں اب صرف ایک کپ چائے کا آرڈر

دینے سے کام چل جائے گا۔ اس نے بیرے کے قریب آنے سے پہلے ہی کہا کہ ایک کپ چائے لے آئے لیکن بیرے نے حکم کی تعمیل کے بجائے قریب آکر کہا۔

''آپ کو وہ سیٹھ صاحب بلا رہے ہیں۔''

بیرے کا اشارہ بڑے پیٹ والے کی طرف تھا۔ یہ بلاوا سنتے ہی عادل کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ چوری پکڑی گئی ہے اب اسے حوالات میں بھیجا جائے گا، پھر اس کے متعلق تحقیقات ہوگی، جب پولیس والوں کو پتہ چلے گا کہ وہ قانون کے خلاف سرحد پار کر کے یہاں آیا ہے تو وہ اسے غیر ملکی جاسوس سمجھ کر اس سے برا سلوک کریں گے، اور اسے سخت سزا دیں گے۔

کچھ بھی ہو وہ سیٹھ صاحب کے سامنے حاضر ہونے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے پہنچا تو اس نے خلافِ توقع بڑی نرمی سے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا پھر بیرے سے کہا کہ اس کے لئے بھی یہی بھوجن لے کر آئے، بیرا حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا تو سیٹھ نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''عادل۔'' وہ اپنا نام بتا کر فوراً ہی پچھتانے لگا۔ اس نے سوچا خود کو ہندو ظاہر کرنا چاہئے تھا شاید اس طرح وہ سیٹھ اس سے اور زیادہ مہربانی سے پیش آتا لیکن سیٹھ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو تم مسلمان ہو میرا خیال ہے کہ تم پیسے پیسے کے محتاج ہو اور تم نے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ ورنہ کھانے پینے کی چوری تو بہت ہی حقیر سی چوری ہے تمہارے جیسے شریف آدمی کو تو کیا چوروں کو بھی یہ چوری زیب نہیں دیتی۔''

عادل نے جواب دیا۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں، بہت مجبور ہو کر میں نے آپ کی تھالی سے کھانا چرایا ہے۔ میری جیب میں صرف آٹھ آنے ہیں یہ پیسہ بھی کیا چیز ہے انسان کو انتہائی بلندی پر لے جاتا ہے اور یہی پیسہ اسے پستی میں دھکیل دیتا ہے۔''

اتنے میں بیرا کھانا لے کر آگیا اور وہ ساری باتیں بھول کر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے کھانے کا انداز ایسا تھا جیسے سانس لئے بغیر ساری چیزوں کو پیٹ میں اتار لینا چاہتا ہے۔ دھوتی والا اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب اس کا پیٹ بھرنے لگا اور کھانے کی رفتار سست ہونے لگی تو سیٹھ نے اس سے کہا۔

''واقعی پیسہ بہت بُری چیز ہے لیکن اس بُری چیز کے بغیر آدمی، انسان نہیں بنتا۔ تم ضرورت مند ہو، اگر میں تمہیں کوئی چھوٹا سا کام دوں تو کیا اسے کرو گے؟ کام چھوٹا سا ہوگا مگر معاوضہ اتنا بڑا ہوگا کہ تم اس کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔''

عادل نے اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں ہر کام کرنے کے لئے تیار ہوں، سوائے قتل کے، اگر اپنی جان کی سلامتی کے لئے مجھے قتل بھی کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

سیٹھ نے خوش ہو کر کہا۔ ''مجھے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جو بھوک مٹانے کے لئے چوری کر سکے اور جان بچانے کے لئے قتل کر سکے۔ تم ایک ہٹے کٹے نوجوان ہو اور خوبصورت بھی ہو۔ اگر تمہارا لباس بدل جائے اگر تمہارے پاس ایک کوٹھی ہو اور گھومنے کے لئے ایک کار ہو تو روزانہ کتنی ہی لڑکیاں تم پر عاشق ہوتی رہیں گی۔ میں تمہیں ایک پتہ لکھ کر دیتا ہوں تم اس پتے پر آج شام کو چھ بجے پہنچ جانا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی واسکٹ کی جیب سے چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور قلم کھول کر پتہ لکھنے لگا۔ عادل نے پوچھا۔ ''کام کیا کرنا ہوگا؟''

''کام کی اور معاوضہ کی باتیں شام کو طے ہو جائیں گی۔''

پھر اس نے نوٹ بک سے پتہ لکھا ہوا کاغذ پھاڑ کر اس کی طرف بڑھا دیا اس کے بعد اس نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا۔ وہ بٹوہ کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا۔ اس نے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی اچھا سا لباس خریدو، اپنا حلیہ درست کرو اور شام کو اس پتے پر پہنچ جاؤ۔ میرا نام جے راج ہے پانچ سو روپے لے کر بھاگ نہ جانا اگر بھاگو گے تو اپنی بنتی ہوئی تقدیر بگاڑ لو گے۔''

یہ کہہ کر جے راج نے کھانے کا بل ادا کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ زندگی میں پہلی بار اتنے روپے عادل کی مٹھی میں آئے تھے اس لئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ سے باہر آ کر بھی ان نوٹوں کو مٹھی میں جکڑے رہا اور فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے شیخ چلی کی طرح مستقبل کے سنہرے منصوبے بناتا رہا۔ پہلے اس نے اپنے لئے ایک اچھا سا مگر سستا سا سوٹ خریدا جوتے اور جرابیں لیں پھر ایک حمام میں آ کر غسل کرنے اور شیو کرنے کے بعد آئینے میں خود کو دیکھنے لگا۔ اپنے آپ کو نئے لباس اور جوتوں میں دیکھا تو خود کو اپنے پچھلے قد سے بہت اونچا پایا۔ چہرے پر جوانی کی سرخی پہلے بھی تھی۔ اچانک ہی

ملنے والی دولت نے وہ سرخی اور بڑھا دی تھی۔ شام کو وہ تحریر کردہ پتے کے مطابق سادھنا کاٹج کے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ کاٹج اتنا شاندار تھا کہ اس نے آئندہ ملنے والی دولت کے بل بوتے پر خیال ہی خیال میں اپنے لئے بھی ایک شاندار کاٹج بنا لیا۔

کال بیل کا بٹن دبانے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک حسین اور نوجوان عورت تھی اس نے کچھ اس قسم کا لباس پہن رکھا تھا جس میں سے اس کے دودھیا بدن کا ہر حصہ دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ جسم پر دائرے اور خطوط بناتا ہوا لباس گویا پھٹ پڑنے کو تھا۔ گریبان سے دو صحتمند کبوتر پھڑ پھڑا کر باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ حسن و شباب کی مستی چھلکی پڑ رہی تھی۔ عادل کے خون کی حرارت کچھ بڑھ گئی اب وہ پچھلی غربت اور فاقے نہیں تھے۔ اس لئے دنیا اپنی تمام تر خوبصورتیوں اور رنگوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ نگاہوں کے سامنے قیامت خیز حسن کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ پیدا ہونے کے بعد پہلی بار اس دنیا کے حسن کو دیکھ رہا ہے اس حسینہ کی آواز پر اسے ہوش آیا۔

''کون ہو تم؟''

اس نے چونک کر جواب دیا۔ ''میرا نام عادل ہے اور مسٹر جے راج نے مجھے اس پتے پر بلایا ہے۔''

اس عورت کے لبوں پر میٹھی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے اسے اندر آنے کو کہا۔ جب وہ اندر آیا تو اسے صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ خود کو سیٹھ جے راج کا ملازم سمجھ رہا تھا اس لئے صوفے پر بیٹھنے سے ہچکچانے لگا۔ اس عورت نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''عادل یہاں تکلف نہ کرو۔ تم ہمارے بے تکلف دوستوں میں سے ہو۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میرا نام سادھنا ہے میں جو کچھ ہوں اسے اپنے بے تکلف دوستوں سے نہیں چھپاتی۔ میں سیٹھ جے راج کی داشتہ ہوں۔''

عادل نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے اس طرح چونکنے پر وہ ہنستی ہوئی بولی۔

''تم بہت بھولے نظر آتے ہو کیا تم نے کبھی کوئی داشتہ نہیں رکھی؟''

عادل نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کے لئے جیب بھاری ہونی چاہئے اور آج سہ پہر سے پہلے میری جیب میں صرف ایک اٹھنی تھی۔''

"تم ہمارے یہاں کام کرو گے تو یقیناً اپنی جیب بھری پاؤ گے اور مجھ جیسی کسی حسین لڑکی کو دوست بھی بنا سکو گے اور داشتہ بھی.........."

وہ اتنی شوخی سے بول رہی تھی کہ اس کے سامنے کسی دوسری حسین لڑکی کا تصور بھی نہیں ابھر رہا تھا۔ وہ بے خیالی میں اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہ گیا اتنے میں کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا سیٹھ جے راج اپنا مٹکے جیسا پیٹ لئے ایک اجنبی شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ عادل کی توجہ سب سے پہلے جے راج کے پھولے ہوئے پیٹ کی طرف گئی اس نے سوچا یہ پھولا ہوا پیٹ اور سادھنا جیسی سندر عورت کا کوئی جوڑ نہیں یہ تو میرے ساتھ بچ رہی ہے پھر اسے جلد ہی خیال آیا کہ وہ اپنی پرواز سے اونچا اُڑ رہا ہے۔ وہ سادھنا کو بھول کر جے راج کی طرف متوجہ ہوا اس کے ساتھ جو آدمی تھا وہ اپنے چھوٹے قد اور بھاری بدن کی وجہ سے فٹ بال نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں اور چہرے کی سختی بتا رہی تھی کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ جے راج نے اس کا تعارف کرایا۔ "عادل ان سے ملو یہ مسٹر جوگندر پال، میرے بزنس پارٹنر ہیں۔ یہ تم سے کچھ ضروری باتیں کریں گے اور اس سلسلے میں، میں سادھنا سے کچھ ضروری مشورے کروں گا۔ آؤ سادھنا ہم دوسرے کمرے میں چلیں۔"

سادھنا نے اس کے قریب آکر اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! ڈارلنگ تم یہ بوجھ کہاں کہاں لئے پھرو گے۔ اس کمرے میں بات نہیں ہو سکتی کیا؟"

جے راج نے جھینپ کر اپنی دھوتی درست کرتے ہوئے عادل سے کہا۔

"یہ بڑی مسخری ہیں مجھے ان کی یہی ادائیں پسند ہیں۔ سادھنا، ہر جگہ مسخری اچھی نہیں لگتی چلو ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر جانے لگا تا کہ اس کی جوان داشتہ اس کا مذاق نہ اُڑائے۔ سادھنا بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ کمرے سے باہر نکلتے وقت اس نے ایک بار پلٹ کر عادل کو مر مٹنے والی مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ مسکراہٹ عادل کی نگاہوں کے سامنے روشن رہی۔ جوگندر پال نے اس کے قریب ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ اپنی دنیا میں واپس آجائیے۔"

عادل نے چونک کر جوگندر پال کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی اس دنیا میں

نہیں تھا اس دنیا سے دور کسی دلفریب مسکراہٹ کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ جوگندر پال نے مسکراتے ہوئے اپنی ایک آنکھ دبا کر کہا۔

"میڈم سادھنا ایک قیامت ہے۔ یہ ایسی عورت ہے جسے دیکھنے کے بعد چھونے کو دل چاہتا ہے اور چھونے کے بعد چکھنے کی تمنا مچلتی ہے میرا خیال ہے کہ اب آپ کا کام بن جائے گا۔"

عادل نے پوچھا۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہاں میری ملازمت پکی ہو گئی ہے۔"

"جی ہاں میں نے میڈم سادھنا کی نظروں کو تاڑ لیا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آپ پر مرمٹی ہیں اب وہ سیٹھ جے راج سے آپ کی سفارش کریں گی اور سیٹھ صاحب اس کے سامنے چوں تک نہیں کر سکتے۔ ایک زر خرید غلام کی طرح اس کی ہر بات مان لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میڈم ان کی دولت پر نہیں ان کے بوڑھے حسن پر ریجھ گئی ہیں۔ یہ انسان دنیا کا سب سے احمق جانور ہے بوڑھا ہو کر بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ ایک حسین اور جوان عورت اس کے مٹکے جیسے پیٹ پر قربان ہو گئی ہے۔"

عادل نے کہا۔ "تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم سیٹھ صاحب کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو۔"

"نہیں آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں میں رشک نہیں کرتا عقل کی بات کرتا ہوں اور عقل کی بات یہ ہے کہ کاروبار کے سلسلے میں عورت کے مشورے پر نہیں چلنا چاہئے۔"

عادل نے صوفے پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں یہ تو پوچھنا بھول ہی گیا تھا کہ کاروبار کیا ہے؟ اور مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"مسٹر عادل اس ملازمت کے لئے ایک بہت ہی اہم شرط ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ آپ ہم سے کوئی سوال نہیں کریں گے آپ کو جو کام بھی کرنے کے لئے دیا جائے گا آپ ہم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ اس کام کی وجہ کیا ہے اور وہ کام آپ سے کیوں کرایا جا رہا ہے، حتیٰ کہ آپ اس کام سے انکار بھی نہیں کریں گے اور نہ ہی ہماری اجازت کے بغیر یہ ملازمت چھوڑ کر جا سکیں گے۔"

عادل نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کولہو کے بیل کی طرح کسی کام میں جوتنا چاہتے

ہیں لیکن میں بیل نہیں ہوں آدمی ہوں کوئی بھی کام کروں گا تو میرے ذہن میں تجسس پیدا ہو گا۔''

''ہمیں اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ آپ کس قدر تجسس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کام کے دوران آپ اس کام کے متعلق اپنے طور پر جو کچھ بھی سوچیں اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ آپ پر صرف اتنی سی پابندی ہے کہ آپ ہم سے کوئی سوال نہ کریں۔''

عادل اسی وقت سے تجسس میں مبتلا ہو گیا وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ پتہ نہیں اس سے کس قسم کا کام لیا جائے گا، اتنی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ بہت ہی چالاک اور محتاط مجرموں کے درمیان آ گیا ہے۔ اگر کوئی سیدھا سادہ سا کام ہوتا تو اس سے کام لینے والے اس سے راز داری نہ برتتے۔ وہ سر جھکائے سوچتا رہا اتنے میں سادھنا اور جے راج واپس آ گئے سادھنا نے اسے سر جھکائے دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے کیا کسی پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہو؟''

جوگندر پال نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''مسٹر عادل کو ہماری شرط نے الجھا دیا ہے۔''

سادھنا، عادل کے قریب آ کر صوفے کے ہتھے پر بیٹھ گئی، پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''عادل اپنی سہ پہر سے پہلے کی زندگی پر غور کرو، وہ بھوکوں مرنے والی زندگی اچھی ہے یا تمہارے یہ موجودہ حالات بہتر ہیں۔ اس دنیا میں سیدھی انگلی سے نہ گھی نکلتا ہے اور نہ دولت ملتی ہے۔ اپنی پچھلی معصومیت اور شرافت سے توبہ کر لو تبھی تم آدمی بن سکو گے، میں نے سیٹھ صاحب سے تمہاری سفارش کی ہے لیکن میری سفارش بھی اس اہم شرط کے بغیر کوئی کام نہیں آئے گی۔''

مسٹر جے راج نے کہا۔ ''جانی تم عادل کو مجبور نہ کرو، اسے سوچنے کا موقع دو ہم جبراً اس سے کوئی کام نہیں کرانا چاہتے۔''

سادھنا نے کہا۔ ''جبر کی بات نہیں ہے ضرورت کی بات ہے۔ عادل تم ضرورتمند ہو اور ہمیں بھی تمہاری ضرورت ہے کیا تم میری بات کو ٹھکرا دو گے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے عادل کے شانے پر اپنے ملائم ہاتھ کا دباؤ ڈالا، خوبصورت انگلیوں سے خوبصورت سا خاموش اشارہ کیا کہ بات مان جاؤ یہاں تمہیں صرف دولت

نہیں، میں بھی ملوں گی۔

عادل مان گیا۔ سیٹھ جے راج نے خوش ہو کر کہا۔

''شاباش یہ مردوں والی بات کی ہے۔ تم نے ریسٹورنٹ میں کہا تھا کہ بھوک مٹانے کے لئے چوری کر سکتے ہو اور جان بچانے کے لئے قتل کر سکتے ہو لیکن ہم کسی کو قتل کرنے کے لئے نہیں کہیں گے اور نہ ہی چوری کرنے کے لئے کہیں گے۔ ایسا کوئی کام نہیں کرائیں گے جس سے تمہاری عزت اور تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے۔ بالکل سیدھا سادا سا کام ہے۔ مسٹر جوگندر پال آپ عادل کو وہ تصویر دکھائیں۔''

جوگندر پال نے اپنی اوپری جیب سے ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر نکالی۔ اس تصویر پر ایک نظر ڈالی پھر اسے عادل کی طرف بڑھا دیا۔ عادل اسے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت اور نیم شگفتگی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت کم سن ہے۔ اس نے ایک بچے کو گود میں لیا ہوا تھا۔ وہ تصویر ایسی تھی جیسے کسی نے بڑی جلدی میں اور اس لڑکی کی لاعلمی میں اسنیپ لیا ہو۔ عادل کی نظریں تصویر پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے کانوں سے جوگندر پال کی آواز ٹکرا رہی تھی۔

''اس لڑکی کا نام پونم ہے فی الحال تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم اسے تلاش کرو۔''

عادل نے کہا۔ ''یہ بہت بڑا ملک ہے میں اسے کہاں تلاش کروں گا؟''

''پونم اسی شہر میں ہے تمہیں اس شہر سے باہر نہیں جانا پڑے گا۔''

''آپ کیسے جانتے ہیں کہ یہ اسی شہر میں ہے، اگر جانتے ہیں تو پھر خود ہی کیوں نہیں تلاش کر لیتے۔ کیا اسے تلاش کرنے کے لئے میری خدمات حاصل کرنا ضروری ہیں؟''

سیٹھ جے راج نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔

''عادل تم سے پہلے ہی کہہ دیا گیا ہے کہ تم کوئی سوال نہیں کرو گے؟''

سادھنا نے کہا۔ ''ہاں عادل تم یہ کیوں پوچھتے ہو تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ کسی لڑکی کو تلاش کرتے وقت تم مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے؟''

''میں کسی مصیبت سے نہیں گھبراتا لیکن میں ایک انسان ہوں۔ میرے ذہن میں ایک تجسس پیدا ہوا تھا اس لئے میں نے سوال کیا۔ اب نہیں کروں گا۔''

سیٹھ جے راج نے کہا۔ ''شاباش تو ہم یہ سمجھ لیں کہ تم ہمارا کام کر رہے ہو؟''

''جی ہاں کسی کو تلاش کرنا بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ آپ اس لڑکی کے متعلق

کچھ اور بتائیں تاکہ مجھے تلاش کے سلسلے میں کچھ مدد ملے۔"

جوگندر پال نے کہا۔

"اب سے تین ماہ پہلے میڈم سادھنا بحری جہاز سے اپنے ملک واپس آ رہی تھیں۔ وہاں جہاز کے عرشے پر میڈم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ یہ کسی بہت بڑی فیملی کے ساتھ تھی اور ایک آیا کے طور پر ان کے بچے کو گود میں کھلا رہی تھی۔ میڈم بہت پہلے ایسی ہی ایک لڑکی کی تصویر میرے پاس دیکھ چکی تھیں اور یہ جانتی تھیں کہ مجھے اس لڑکی کی تلاش ہے، لہٰذا انہوں نے اس لڑکی کی لاعلمی میں اپنے بے بی کیمرے سے اس کی یہ تصویر اتار لی۔ میڈم کو اس فیملی سے دوستی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ پونم ایسے وقت نظر آئی تھی جب جہاز بمبئی کی بندرگاہ سے لگ رہا تھا۔ سب اپنا اپنا سامان باندھنے یا دور بندرگاہ پر کھڑے ہوئے رشتے داروں کو دیکھنے میں مصروف تھے پھر بھی میڈم نے اتنا پتہ چلا لیا کہ وہ فیملی اسی شہر میں آ کر قیام کرے گی۔ انہیں اس شہر میں اپنی قیام گاہ کا علم نہیں تھا کیونکہ وہ دس برس برما میں رہنے کے بعد اپنے دیس واپس آ رہے تھے۔ وہ اپنے کسی عزیز کے سہارے اس شہر میں اپنی نئی قیام گاہ تک پہنچنے والے تھے۔ میڈم ان کا پیچھا نہ کر سکیں کیونکہ کسٹم چیکنگ کے دوران وہ فیملی پونم کو لے کر جا چکی تھی۔ اس سے زیادہ ہم اس لڑکی کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتے۔ تمہاری معلومات کے لئے اتنا کافی ہوگا کہ پونم جہاں ملازمت کر رہی ہے اس کا مالک ایک کچھی تاجر ہے وہ یہاں کچھیوں کی آبادی میں مل سکتی ہے ایسے علاقوں میں مل سکتی ہے جہاں بڑے بڑے لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگ رہتے ہیں۔"

عادل نے کہا۔ "ان معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ اسے تلاش کر لینا آسان ہے۔ مگر یہ سوچ کر پھر ذہن الجھتا ہے کہ اتنے آسان سے کام کے لئے میرا انتخاب کیوں کیا گیا ہے مہربانی فرما کر صرف اتنا بتا دیجئے کہ مجھ میں کیا خاص بات ہے کہ میں ہی اسے تلاش کر سکتا ہوں۔"

جوگندر پال نے غرا کر کہا۔

"تم خواہ مخواہ سوالات کئے جا رہے ہو، کیا تم خاموشی سے کام نہیں کر سکتے؟ اس خاموشی کے تمہیں دس ہزار روپے ملیں گے۔ اسے تلاش کرنے کے لئے تمہیں ایک مرسڈیز کار دی جائے گی اور تمہارے رہنے کے لئے دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کا خوبصورت سا بنگلہ دیا جائے گا۔"

عادل نے کہا "اور تلاش ختم ہوتے ہی یہ سب کچھ چھین لیا جائے گا۔"

"نہیں۔" سیٹھ جے راج نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "جو کچھ تمہیں دیا جائے گا وہ تم سے واپس نہیں لیا جائے گا۔ پونم کو ڈھونڈ لینے کے بعد بھی تمہیں کچھ اور کام دیا جائے گا اور ہر کام کا معاوضہ پہلے سے دگنا ہوتا جائے گا"۔

عادل کی تو جیسے کھوپڑی اُلٹ کر رہ گئی تھی۔ یہ چکر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سادھنا، جے راج اور جوگندر پال کو دیکھا لیکن ان سے کچھ سوال کرنا فضول تھا، وہ معقول جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"مجھے منظور ہے میں پونم کو ڈھونڈ نکالنے کے بعد بھی آپ کے کام آتا رہوں گا اور ان کاموں کے سلسلے میں آئندہ کوئی سوال نہیں کروں گا؟"

سیٹھ جے راج نے خوش ہو کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔

"وش یو گڈ لک مسٹر عادل! یہ لیجئے کار کی چابی۔ کار باہر کھڑی ہے مسٹر جوگندر پال آپ کو آپ کے بنگلے تک پہنچا دیں گے آپ کا مستقل قیام وہیں رہے گا۔ ہم آپ سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔ پونم کہیں نظر آئے تو آپ ہم تینوں میں سے کسی ایک کو اطلاع دیں اس کے بعد آپ کو جو ہدایت ملے اس پر عمل کریں۔"

عادل نے سیٹھ سے کار کی چابی لے لی۔ رخصت کے وقت سادھنا نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں بہت کچھ کہا پھر وہ جوگندر پال کے ساتھ اپنی نئی کار میں بیٹھ کر اپنے نئے بنگلے کی طرف چلا گیا۔

دوسرے دن سے وہ پونم کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ وہ کچھیوں کی آبادی میں گیا اور صبح سے شام تک اس آبادی کے مختلف حصوں میں اپنی گاڑی روک کر انتظار کرتا رہا کہ پونم کسی کوٹھی سے باہر آئے گی۔ اس کی تصویر کار کے ڈیش بورڈ میں رکھی ہوئی تھی لیکن تصویر والی شام تک نظر نہیں آئی۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

اپنے بنگلے میں پہنچا تو نہ جانے کیسے تھکن غالب آ گئی۔ اب سے ایک دن پہلے وہ پھٹی چپل پہن کر شہر کی تمام سڑکیں ناپتا رہتا تھا اور تھکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آدمی کتنا ہی جی دار اور جاندار ہو منزل پر پہنچتے ہی آپ ہی آپ نڈھال ہو کر گر پڑتا ہے اس نے جتنے اونچے خواب نہیں دیکھے تھے اتنی اونچی زندگی مل گئی تھی اور وہ اسی کو منزل سمجھ کر فوم کے ملائم بستر پر گر پڑا

تھا۔ ایسے وقت میں وہ تھکے ہوئے ذہن سے سوچتا تھا کہ یہ جو بیٹھے بٹھائے اتنی دولت
رہی ہے کہیں یہ سپنا تو نہیں ہے۔ اس کے سوچتے ہی سوچتے وہ سپنوں کی طرح اس کے
روم میں چلی آئی۔

وہ سادھنا تھی۔ اس نے بغیر آستین کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ شانے پر سے ریشم
ساڑھی پھسل پھسل جارہی تھی اور چاندی جیسی بانہوں کو اجاگر کررہی تھی۔ عادل اسے
حیرانی سے دیکھنے لگا جیسے اس کے آنے کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہو۔ وہ پلنگ پر لیٹا ہوا
سادھنا اس کے قریب آکر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''آج تم اسے تلاش کرنے کے بعد ناکام واپس آئے ہو؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہاری کڑی نگرانی ہوتی رہتی ہے اور ہمیں اطلاع ملتی رہتی ہے کہ تم کیا کررہے
ہو۔''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ عادل اٹھ کر بیٹھا تو بیٹھنے کی پوزیشن میں اس کے بالکل قریب پہنچ
گیا۔ ہنسی کی تال پر تھرکتا ہوا بدن عادل سے مس ہورہا تھا اور اس کی رگوں میں لطیف
سرسراہٹ ہورہی تھی۔ اس نے سادھنا کی قربت کے نشے میں بہکتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اکیلی آئی ہو؟''

''ہم سب اکیلے آئے ہیں اور اکیلے جائیں گے ایک دوسرے سے تھوڑی دیر کی محبت
ہوتی ہے۔ اس تھوڑی سی دیر کو بہت سمجھو اور میری بانہوں میں ڈوب جاؤ۔''

اس کی آنکھوں میں نشہ سا گھل رہا تھا۔ اس نے اپنی چاندی جیسی چمکتی بانہوں کو عادل
کے گلے کا ہار بنا دیا عادل اس پر جھک گیا اور اس کی گردن کی اجلی اور چکنی جلد پر ہونٹوں
کو رکھتے ہوئے خمار آلود لہجے میں بولا۔

''سیٹھ صاحب نے یہاں آنے کی کیسے اجازت دے دی؟''

''میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔ وہ کمبخت پونا گیا ہوا ہے۔ میں نے اس کی موجودگی
میں تمہیں لفٹ نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیچارہ مجھے ہر ماہ پچیس ہزار روپے دیتا ہے
اس لئے اس کی موجودگی میں اس کی وفادار بن کر رہتی ہوں۔ کاروبار میں اس حد تک
ایماندار ہونا چاہیے۔''

وہ کہہ رہی تھی اور عادل کے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ شد

جذبات سے اس کا جسم دہک رہا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں سے اس کے بدن کے پسینے کو چوم رہا
تھا۔ تقدیر اس پر اچانک ہی مہربان ہوگئی تھی۔ پچھلے دن اس نے سیٹھ جے راج کے تھال
سے دو لقمے چرائے تھے۔ اب اس کی حسین داشتہ کو چرا رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ اس کے شبابی
جذبوں سے کھیل رہا تھا اسے اس دنیا میں خوبصورتی سے زندہ رہنے کی لگن پیدا ہوتی جارہی
تھی۔ اس نے لگاوٹ سے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ جب میری جیب بھری ہوگی تو میرے پہلو میں تمہاری جیسی ایک
حسین داشتہ آجائے گی لیکن تم نے آنے سے پہلے میری جیب نہیں دیکھی؟''

''عورت ہمیشہ جیب نہیں دیکھتی، وہ چوڑے چکلے سینے اور فولادی بازوؤں کے لئے
بھی ترستی ہے۔ میں ہر جگہ دوسروں کے جذبات کے لئے بکتی ہوں لیکن کبھی کبھی اپنی آسودگی
اور اپنی تسکین کے لئے سودا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ صرف دل سے دل کا
سودا ہو۔ عادل تم ایسے گبھرو جوان ہو کہ تمہیں دیکھتے ہی بے اختیار دل دھڑکنے لگتا ہے۔ جے
راج نے تمہیں ایک ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ اگر تمہارے بدن پر اچھا لباس ہو، رہنے کے
لئے شاندار کوٹھی اور گھومنے کے لئے نئے ماڈل کی کار ہو تو تم پر ہزاروں لڑکیاں مریں گی
اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں، جو کسی کے آگے گھاس نہیں ڈالتی، تمہارے آگے چارہ بن گئی
ہوں۔''

عادل نے چارے پر منہ ڈالتے ہوئے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہزاروں لڑکیاں مجھ پر مریں گی تو سیٹھ جے راج
کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟''

''یہ بات رفتہ رفتہ تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔''

''کیا میں یہ سمجھوں کہ میری خوبصورتی اور جواں مردی کے ذریعہ نوجوان لڑکیوں کو
پھانسا جائے گا؟''

''نہیں یہ فضول سا خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ سیٹھ جے راج کروڑ پتی ہے اور
ایک کروڑ پتی کبھی ایسا گندہ کاروبار نہیں کرے گا۔''

''تو پھر مجھے کس لئے آلہ کار بنایا گیا ہے؟''

وہ جھلا کر سادھنا سے الگ ہوگیا، سادھنا تڑپ کر پھر اس سے لپٹ گئی۔ عادل جیسے
نوجوان کھلاڑی نے اس کے اندر جذبات کی ایسی آگ بھڑکا دی تھی کہ وہ اسے بجھائے بغیر

چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے والا عادل ہی تھا۔ وہ ال
کرنے لگی۔ ”مجھ سے دور نہ جاؤ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔“

”میں بھی یہ سوچتے سوچتے مر رہا ہوں کہ میری خوبصورتی اور جواں مردی سے کس
کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے؟“

”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی پہلے مجھے فائدہ اٹھا لینے دو۔“

وہ تھوڑی دیر تک فائدہ پہنچاتا رہا اس دوران اس نے کہا۔

”میں تمہارے کام آ رہا ہوں تم میرے کام آؤ۔ تمہاری زبان پر تالے نہیں پڑے
ہیں۔ کم از کم زبان ہلا کر یہ تو بتا سکتی ہو کہ آخر مجھے کیوں استعمال کیا جا رہا ہے؟“

جذبوں کے ہجوم میں ہانپتی ہوئی بولی۔

”صرف اس لئے کہ پونم تم سے جلد ہی متاثر ہو جائے گی جب تم اسے ڈھونڈ نکالو گے
تو تمہیں دوسرا کام یہ دیا جائے گا کہ تم اس سے محبت کرو۔“

”تو گویا مجھے ڈیوٹی کے طور پر محبت کرنی ہو گی۔ یہ عجیب ملازمت ہے۔ آخر سیٹھ
صاحب یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں پونم سے محبت کروں؟“

”یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔“

”تم جھوٹ کہتی ہو۔“

وہ جھنجلا گئی کہ عادل کو وقت کی قیمت اور ماحول کی رنگینی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے
لیکن وہ سمجھتی تھی کہ جھنجلاہٹ کا اظہار کرے گی تو عادل بدک جائے گا۔ اس نے التجا آمیز
لہجے میں کہا۔

”یقین کرو عادل میں اسی حد تک جانتی ہوں جس حد تک کہ ایک داشتہ چوری چھپے
معلومات حاصل کر لیتی ہے ورنہ جے راج اور جوگندر پال بہت گہرے ہیں اپنے کاروبار
کے کسی اندرونی راز تک مجھے بھی نہیں پہنچنے دیتے میں صرف وہی باتیں تمہیں بتا سکتی ہوں جو
مجھے معلوم ہیں اور مجھے یہ معلوم ہے کہ پونم تمہیں کہاں ملے گی۔“

عادل کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے سادھنا کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے اور اس کے
بدن کی دلچسپیوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا ”وہ کہاں ملے گی، تم کیسے جانتی ہو؟“

”جے راج اور جوگندر پال بھی جانتے ہیں کہ وہ کہاں ملے گی وہ چاہتے ہیں کہ تم
چار دنوں تک اس کی تلاش میں بھٹکنے کے بعد اس تک پہنچو۔ یعنی وہ نفسیاتی حربہ استعمال

رہے ہیں کہ تم تلاش میں بھٹکتے رہو گے تو پونم کے لئے تمہاری دلچسپیاں بڑھتی جائیں گی اور تم
غیر شعوری طور پر اس سے ملنے اسے دیکھنے اور اس کے قریب رہنے کی تمنا کرتے رہو گے۔
میں اس سے ملنے کی مشکل آسان کر دیتی ہوں کل شام کو تم ہینگنگ گارڈن جاؤ گے تو بچوں
کے پارک میں وہ تمہیں نظر آئے گی۔ میں نے یہ معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اب تمہارا فرض
ہے کہ تم اس پر ڈورے ڈالو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی وہ خود ہی
تمہاری طرف کھنچی چلی آئے گی۔ سچ مچ تم ایسے ہو کہ تمہارے بازوؤں میں مر جانے کو دل
چاہتا ہے۔“

وہ بولتی رہی اور اس کے بازوؤں میں تڑپ تڑپ کر مرتی رہی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن شام کو وہ ہینگنگ گارڈن پہنچا۔ بچوں کے پارک میں آ کر وہ اس کی
تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا اور بار بار اپنی جیب سے تصویر نکال کر پونم کے چہرے کو ذہن
نشین کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ دور سے نظر آئی۔ وہ ایک بچہ گاڑی کو دھکیلتی ہوئی پارک
میں داخل ہو رہی تھی۔ پارک کے ایک گوشے میں آ کر اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر
دی پھر دوسری آیاؤں کے پاس جا کر باتیں کرنے بیٹھ گئی۔ عادل ایک جھاڑی کے پیچھے
سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھنے کے بعد اس کی تصویر پھیکی پڑ گئی۔ شباب نے نیا نیا اس کے
آنگن میں قدم رکھا تھا۔ وہ بہت ہی معمولی سا لباس پہنے ہوئے تھی۔ عادل کو اپنا زمانہ یاد آ
گیا کہ کبھی وہ بھی معمولی لباسوں میں رہا کرتا تھا۔ اس کے باوجود جے راج جیسے جوہری نے
گدڑی میں چھپے ہوئے لعل کو پرکھ لیا تھا۔ وہی خوبی پونم میں بھی تھی۔ عادل نے چشمِ تصور
میں اسے شاہانہ لباس میں دیکھا وہ کسی ریاست کی راجکماری نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک
اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کس طرح اس سے بات چیت کا آغاز کرے۔ وہاں تو اس
سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کے آس پاس دوسری آیائیں موجود تھیں۔

وہ سوچتا ہوں پارک سے باہر آ گیا۔ جب وہ ایک گھنٹے بعد بچہ گاڑی کو دھکیلتی ہوئی
واپس جانے لگی تو وہ گارڈن کے مین گیٹ کے پاس کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ پونم نے وہاں
سے گزرتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی۔ دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے گزرنے والے آس
پاس کی چیزوں کو دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ایسا تو ممکن نہیں تھا کہ فلموں کی طرح ہیروئن
ایک نظر ڈالتی اور ہیرو پر عاشق ہو کر ڈوئیٹ گانے لگتی۔ نہ ہی وہ عاشقانہ انداز میں چھیڑتے

ہوئے اس کے گھر تک جا سکتا تھا۔ اس روز عادل نے صبر کر لیا۔ گھر واپس آ کر بہت دیر تک منصوبے بناتا رہا کہ کس طرح اس سے لفٹ لی جائے اور پھر اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے جے راج کے پاس جا کر کہا کہ اسے اپنی تدبیر پر عمل کرنے کے لئے ایک کرائے کے آدمی کی ضرورت ہے۔ جے راج نے اسے یقین دلایا کہ اسے اس کا مطلوبہ آدمی مل جائے گا اور وہ اس کی تدبیر پر پوری طرح عمل کرے گا۔

دوسرے دن شام کو عادل اسی جھاڑی کے پیچھے چھپا رہا پونم حسب معمول بچہ گاڑی کو ایک طرف کھڑی کر کے آیاؤں سے باتیں کرنے چلی گئی تھی پندرہ منٹ بعد ایک بڑی مونچھوں والا غنڈہ چھپتا چھپاتا بچہ گاڑی کے پاس آیا اور بچے کو اٹھا کر بھاگنے لگا۔ اسی وقت عادل جھاڑی کو پھلانگ کر اسے للکارتے ہوئے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ آیاؤں کے درمیان کھلبلی مچ گئی۔ پونم بدحواس ہو کر بچے کی طرف دوڑی، غنڈہ بچے کو گھاس پر چھوڑ کر عادل سے الجھ گیا۔ عادل نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا تھا اور اسے مارتے ہوئے ایک طرف لے جا رہا تھا۔ پونم سے دور ہونے کے بعد غنڈے نے جھلا کر کہا۔

''اتنے زور سے مارنے کا معاہدہ نہیں تھا۔''

عادل نے کہا۔''معاوضہ ڈبل ملے گا۔ جا اب بھاگ جا یہاں سے..........''

اس کی ہدایت کے مطابق وہ غنڈہ وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ عادل نے آستین سے پسینہ پونچھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ پونم بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے اس کی طرف آ رہی تھی اس نے قریب آ کر احسان مندی سے کہا۔

''آپ دیوتا ہیں، انسان کے روپ میں اس بچے کو بچانے کے لئے آ گئے ہیں۔ اگر آپ نہ آتے تو اس بچے کے اغوا ہونے پر اس کے ماں باپ نہ جانے میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے۔ میں آپ کی اس مہربانی کو کبھی نہ بھولوں گی۔''

وہ یہی چاہتا تھا کہ پونم اسے کبھی نہ بھولے۔ اس نے کہا۔

''اگر تم اس بچے کی حفاظت کرنا چاہتی ہو تو ابھی اسے لے کر واپس چلی جاؤ وہ بدمعاش یہاں سے مار کھا کر گیا ہے لیکن کہیں تمہاری تاک میں بیٹھا ہو گا۔''

یہ سن کر وہ سہم گئی اور بچے کو گاڑی میں لٹاتی ہوئی بولی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ بچہ میرے پاس ایک امانت ہے۔ میں اس امانت کو حفاظت سے ابھی پہنچا دوں گی۔''

وہ گاڑی کو دھکیلتی ہوئی پارک سے باہر جانے لگی۔ عادل نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ بدمعاش کہیں تمہیں راستے میں مل گیا تو خواہ مخواہ تمہیں پریشان کرے گا تمہارا تنہا جانا مناسب نہیں ہے چلو میں تمہیں گھر تک پہنچا دوں گا۔''

وہ پھر ایک بار احسان مند ہو کر بولی۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اس وقت میرا دل بڑا گھبرا رہا ہے۔ اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔''

عادل دل ہی دل میں مسکراتا ہوا اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پونم نے اس کے لباس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ بہت پیسے والے معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے شرمندگی ہے کہ آپ بہت دور تک میرے ساتھ پیدل جائیں گے۔''

''تم نے میرے لباس سے میرے رئیس ہونے کا اندازہ لگایا اگر تمہارے پاس بھی اچھا لباس ہو تو تم بھی دولت مند نظر آؤ گی۔''

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔''میں بہت اونچے خواب دیکھتی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں محض آیا بننے کے لئے پیدا نہیں ہوئی مگر اب تو یہ آیا کی ملازمت بھی چھوڑ دوں گی بلا سے بھوکوں مر جاؤں لیکن یہ الزام اپنے سر نہیں لے سکتی کہ بچہ میری غفلت سے اغوا کیا گیا ہے میں تنہا لڑکی کہاں تک اس کی حفاظت کروں گی۔''

عادل نے کہا۔''اگر تم یہ ملازمت چھوڑ دو تو میں تمہیں بہت اچھی جگہ نوکری دلاؤں گا جہاں کام کم ہو گا اور معاوضہ تمہاری توقع سے زیادہ ملے گا۔ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لو کل شام کو میں اس کوٹھی کے سامنے تمہارا انتظار کروں گا جہاں تم کام کرتی ہو۔''

وہ اداس ہو کر بولی۔

''میرے ماں باپ نہیں ہیں، میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو ان دنوں ایک ہمدرد بوڑھے کے سائے میں پرورش پا رہی تھی۔ وہ بیچارہ ہمیشہ بیمار رہا کرتا تھا اپنا اور اس کا پیٹ پالنے کے لئے میں یہ ملازمت کرنے لگی۔ وہ بوڑھا اکثر کہا کرتا تھا کہ تم کسی کی خدمت کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ تم ایک راجکماری ہو اگر خدا کو منظور ہوا تو تمہیں تمہارے جائز حقوق مل جائیں گے۔''

''تم خدا کا نام لے رہی ہو کیا تم مسلمان ہو؟''

''وہ بوڑھا کہتا تھا کہ میرا باپ مسلمان تھا اور ماں ہندو تھی لیکن وہ کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے، یہ بات اس بوڑھے نے نہیں بتائی۔ وہ کہتا تھا کہ بات زبان سے نکلے گی تو دنیا تک پہنچ جائے گی پھر تمہاری اکیلی جان کے کتنے ہی دشمن پیدا ہو جائیں گے۔ میں آٹھ برس کی عمر میں اس کی یہ باتیں سنتی تھی۔ اس وقت مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی کہ میں اپنے ماضی کے متعلق اس سے کرید کرید کر معلومات حاصل کرتی۔ پھر وہ بوڑھا مر گیا۔ میں اپنے مالک اور مالکن کے ساتھ برما چلی گئی۔ میں آٹھ برس کی عمر سے ان کے یہاں کام کرتی ہوں اب پندرہ برس کی ہو گئی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اس ہندو بوڑھے کی باتیں یاد آتی ہیں جو مجھے ایک مسلمان کی بیٹی کہا کرتا تھا اور کبھی کبھی بڑے پیار سے راجکماری کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اوہ! میں کتنی باتونی ہوں اتنی دیر سے بولے چلی جا رہی ہوں آپ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔''

''میں تمہارے بارے میں یہی سوچ رہا ہوں کہ تم واقعی راجکماری ہو تم نے مجھے اپنا سمجھ کر اتنی ساری باتیں کہہ دیں تو میں بھی یہ کہہ دوں کہ میں بہت دنوں سے تمہیں چھپ چھپ کر دیکھتا رہا ہوں اس لئے کہ تم بہت حسین ہو اور میرے دل میں جگہ بنا کر بیٹھ گئی ہو۔''

اس نے فوراً ہی سر کو جھکا لیا اس کے دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئی تھیں اور رخساروں پر آگ سی دہکنے لگی تھی۔ اس نے موضوع بدلنے کے لئے ایک کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں وہاں رہتی ہوں۔''

عادل نے کہا۔ ''تم بات بدل رہی ہو۔ تم وہاں نہیں رہتی ہو میرے دل میں رہتی ہو میں تمہارا ہاتھ تھامنے کی جرأت کر رہا ہوں تم چاہو تو نفرت سے چھڑا لو پھر میں تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے پونم کے نازک سے ہاتھ کو تھام لیا اس کا ملائم سا ہاتھ ایک ننھی سی چڑیا کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ تو نہیں چھڑایا لیکن منہ پھیرے خاموش کھڑی رہی۔ عادل نے کہا۔

''میں تمہاری طرح اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں اور اپنی اکیلی دنیا کو تم سے آباد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھ پر بھروسہ کرو گی تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ میں چاہتا

ہوں کہ آج رات تم اپنے اور میرے متعلق سوچو اگر تم مجھ پر بھروسہ کر سکو تو کل صبح اسی پارک کے دروازے پر چلی آنا صبح دس بجے میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر کوٹھی کی طرف چلی گئی۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ عادل کے متعلق سوچ رہی ہے اور تمام رات سوچے گی۔

عادل وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گارڈن کی طرف جانے لگا وہاں وہ اپنی کار چھوڑ آیا تھا۔ کار تک پہنچتے پہنچتے اس نے پونم کے متعلق بہت کچھ سوچا۔ وہ لڑکی سادھنا کی طرح حسین تھی لیکن اس کی طرح مکار اور بے حیا نہیں تھی اتنی معصوم تھی کہ اسے دھوکہ دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ عادل یہی سوچ رہا تھا۔ کہ کیا اسے محبت کا فریب دے سکتا ہے؟ اس لڑکی نے ابھی اس دنیا کا ایک کونہ بھی نہیں دیکھا تھا، لوگوں کی چالبازیوں سے ذرا بھی واقف نہیں تھی جب سے پیدا ہوئی تھی اس دنیا کے ہر رشتے کی محبت سے محروم رہی تھی۔ پہلی بار اگر وہ عادل پر اعتماد کر کے اس کی محبت کو اپنے نازک سے سینے میں چھپا لیتی تو کیا وہ ایسے میں اسے دھوکہ دے سکتا تھا؟ وہ جتنا اس کے متعلق سوچ رہا تھا اتنا ہی اس کی تنہائی اور معصومیت سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔

وہ کار میں بیٹھ کر اپنے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر پونم کو دھوکہ نہیں دے گا تو زندہ کیسے رہے گا۔ اسے تو محبت کے نام پر دھوکہ دینے کا معاوضہ دیا جا رہا تھا۔ اگر اگر اس نے اس کام سے انکار کیا تو اس سے زندگی کی یہ تمام آسائشیں چھین لی جائیں گی پھر وہ پہلے کی طرح فٹ پاتھ پر آ جائے گا اگر پونم نے غربت میں اس کا ساتھ دیا تو وہ اسے بھی بھوکا مارے گا۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈیوٹی کے طور پر پونم سے جھوٹی محبت کرے گا لیکن دل ہی دل میں وہ پوری سچائی سے اسے اپنا لے گا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے کار کا رخ جے راج کی کوٹھی کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آئندہ پونم کے سلسلے میں اسے کس قسم کے احکامات ملتے ہیں۔

جب اس نے جے راج کے پاس پہنچ کر پونم سے ملاقات کی روداد سنائی تو وہ بہت خوش ہوا اس نے جوگندر پال کو بھی وہاں بلوا لیا جوگندر پال نے وہاں آ کر اسے دوسرا کام یہ دیا کہ وہ پونم سے محبت کرے۔ یہ بات سادھنا اسے پہلے ہی بتا چکی تھی۔ عادل نے کہا۔

''میں اس سے کیا محبت کروں گا۔ وہ خود ہی مجھے چاہنے لگی ہے کل صبح دس بجے وہ پھر

مجھ سے ملاقات کرے گی۔''

جے راج نے اس کے بازوؤں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''شاباش تم ہماری توقع سے زیادہ کام کے آدمی ثابت ہو رہے ہو۔ جب وہ لڑ
تمہاری محبت کا دم بھرنے لگے تو تم اس سے کہنا کہ تم اسے ایک اچھی ملازمت دلا سکتے ہو۔ وہ
تمہاری طرح ایک شاندار زندگی گزار سکتی ہے اگر وہ ملازمت کے لئے راضی ہو جائے تو تم
اسے جوگندر پال کے پتے پر بھیج دینا اس لاوارث لڑکی کی زندگی سنور جائے گی۔''

عادل نے کہا۔''میرے سوال کرنے کا حق آپ لوگوں نے چھین لیا ہے لہٰذا میں کوئی
سوال نہیں کروں گا لیکن اتنی درخواست کروں گا کہ اس معصوم لڑکی کے ساتھ کوئی دھوکہ نہ کیا
جائے۔ وہ اتنی معصوم ہے کہ اس نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے پھر اسے نقصان
پہنچانا کہاں کی انسانیت ہوگی؟''

جوگندر پال نے کہا۔

''تم کیسی باتیں کر رہے ہو عادل؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم ایک بے ضرر لڑکی کو
نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تم ہم پر بھروسہ کرو اور ذرا صبر سے کام لو ہم بہت جلد یہ ثابت کر دیں
گے کہ ہم نے اس لاوارث لڑکی کو فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا ہے۔''

عادل نے ان سے مزید بحث نہیں کی وہاں سے واپس چلا آیا۔ دوسری صبح دس بجے
پارک کے دروازے پر جب اس نے پونم کو دیکھا تو اسے یہ سوچ کر شرم آئی کہ ایک معصوم
اور نادان لڑکی کس طرح اس پر اعتماد کر کے وہاں چلی آئی ہے اس نے دل ہی دل میں سچائی
سے پیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا اب وہ فیصلہ اور مستحکم ہوگیا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ جے راج
اور جوگندر پال کے احکامات کی تعمیل کرے گا اس کے ساتھ ہی پونم کی حفاظت بھی کرے گا۔
اس نے پونم کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''تم مجھ پر اعتماد کر کے یہاں تک چلی آئی ہو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ
تمہارے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ خدا کی قسم اس لئے کھا رہا ہوں کہ تمہارے باپ
کی طرح میں بھی مسلمان ہوں۔''

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اب اس کے دیکھنے کے انداز میں پہلے سے زیادہ اعتما
اور پہلے سے زیادہ لگن تھی اسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیئے کار میں آ کر
بیٹھ گئی۔ عادل اسے لئے بہت دیر تک کار میں گھومتا رہا۔ اس سے محبت اور اعتماد کی باتیں

کرتے ہوئے اس کے دل میں جگہ بناتا رہا۔ اس نے پونم کے لئے ڈھیر ساری شاپنگ کی
پھر اسے اپنے بنگلے میں لے آیا وہاں اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس نے پونم کو بتایا کہ وہ کوئی
خاندانی رئیس نہیں ہے ایک کروڑ پتی سیٹھ کا ملازم ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو لڑکی اس کے
ساتھ زندگی گزارے وہ بھی ان کی ملازمت کرے وہ نہیں جانتا کہ سیٹھ کس قسم کا کام لینا
چاہتا ہے مگر یہ چاہتا ہے کہ پونم بے خوف و خطر ان کی ملازمت کرے۔

پونم نے کہا۔''میں بے خوف و خطر اپنی برسوں کی ملازمت چھوڑ کر آپ کے پاس چلی
آئی ہوں اب آپ جس راستے پر چلنے کے لئے کہیں گے میں اس سے انکار تو نہیں کروں گی
البتہ آپ کے بغیر اس راستے پر نہیں چلوں گی۔''

''میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا پونم لیکن ملازمت کے لئے تمہیں پہلی بار تنہا جانا ہو
گا جوگندر پال ملازمت کے سلسلے میں تم سے ضروری باتیں کرے گا۔ میں تمہیں اس کی کوٹھی
تک پہنچا دوں گا پھر وہاں سے ذرا دور اپنی کار میں بیٹھا تمہارا انتظار کروں گا اب تم جاؤ اور
لباس تبدیل کرلو۔''

وہ لباس کا پیکٹ اٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی۔ عادل ایک سگریٹ سلگا کر بستر پر لیٹ
گیا، جب اس نے دو تین سگریٹ پھونک لئے تو وہ باتھ روم سے باہر آئی، وہ نئے ریشمی
لباس میں پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ سچ مچ کسی ریاست کی راجکماری نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ
سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔

''تم کتنی حسین ہو یہ تمہیں آئینہ بتائے گا۔ میرا جی تو چاہتا ہے تمہیں اپنے سینے میں
چھپا لوں۔''

یہ کہہ کر اس نے بڑی آہستگی سے اور بڑی نرمی سے اپنے قریب لا کر اسے سینے سے لگا
لیا۔ وہ ایک نازک سی کلی کی طرح تھی۔ اسے چھوتے وقت اس بات سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں
کھلنے سے پہلے ہی اس کی پنکھڑیاں نہ بکھر جائیں اس نے بڑی احتیاط سے اسے اپنی آغوش
میں چھپا لیا تھا۔ بڑی دیر تک اس کے نازک سے دل کی نازک سی دھڑکنیں سننے کے بعد وہ
اسے لے کر بنگلے سے باہر آیا اور کار میں بیٹھ کر جوگندر پال کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔

وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا پونم اس کے شانے پر سر ٹیکے بیٹھی ہوئی تھی اور ہولے ہولے
پیار بھری باتوں سے اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی۔ اس کے بدن سے پسینے کی ہلکی ہلکی
جذبات انگیز مہک ابھر رہی تھی عادل کو ایسا رومانی ماحول پہلی بار نصیب ہوا تھا یوں تو وہ

سادھنا کے ساتھ بھی وقت گزار چکا تھا لیکن کلی اور پھول میں بڑا فرق تھا۔ سادھنا کے پاس خودغرضی تھی اور وہ بے غرض لڑکی عادل پر اندھا اعتماد کر کے اس کے پاس چلی آئی تھی۔ لہٰذا پونم کے لئے اس کے دل میں محبت بھی تھی اور عزت بھی۔

جوگندر پال کی کوٹھی کے سامنے اس نے کار روک دی۔ پھر اس نے ونڈ اسکرین کے اس پار دور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے پونم کو بتایا کہ وہ اس درخت کے نیچے اپنی کار میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہے گا۔ پونم کار سے اتر کر کوٹھی کی طرف جانے لگی۔ عادل نے کار اسٹارٹ کی پھر اسی درخت کے سائے میں آکر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے دل بہلانے کے لئے کار کا ریڈیو آن کر دیا تھا اور سگریٹ سلگا کر کش پہ کش لگاتا ہوا پونم کو چشمِ تصور میں دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی رسٹ واچ کو دیکھ رہا تھا۔ پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پھر ایک گھنٹہ، اس کے بعد دو گھنٹے گزر گئے مگر وہ واپس نہیں آئی تب عادل کو احساس ہوا کہ اس نے جوگندر پال اور جے راج پر بھروسہ کر کے بڑی حماقت کی ہے۔ مزید حماقت یہ کہ اس نے پونم کو وہاں تنہا بھیج دیا۔ وہ کار کو واپس موڑ کر جوگندر پال کی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوا۔ کوٹھی کے تمام کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ فوراً ہی کار سے اتر کر دروازے پر آیا پہلے تو اس نے کال بیل کا بٹن دبایا پھر دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگا مگر وہاں کوئی ہوتا تو جواب ملتا۔ دروازہ اندر سے بند تھا وہ گھوم کر کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف گیا۔ پچھلے دروازے پر بڑا سا تالا دیکھ کر اسے اللہ تعالیٰ یاد آ گیا۔

ایسے وقت خدا ہی یاد آتا ہے وہ خدا سے ہی پونم کی سلامتی کی دعا مانگ سکتا تھا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی وہ بیک وقت پونم کی سلامتی کی دعا بھی مانگ رہا تھا اور دشمنوں کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اپنی کار میں آ کر بیٹھ گیا پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا سادھنا کے کاٹیج کی طرف جانے لگا۔

سادھنا اپنے کاٹیج میں ہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چاندنی کی طرح بچھ گئی۔ اس سادھنا کو دیکھ کر پہلے دن عادل کو دنیا کی خوبصورتی کا احساس ہوا تھا لیکن آج وہ اور اس کی دنیا نہایت ہی مکروہ اور بدصورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے غصے سے پوچھا۔

''پونم کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے تم بہت غصے میں نظر آ رہے ہو آخر بات کیا ہے؟''

''تم سب فریبی اور مکار ہو میں نے پونم کو جوگندر پال کے پاس بھیجا تھا اور کوٹھی سے

ذرا دور اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد جب میں اس کوٹھی میں گیا تو وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا، دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اور وہاں میری چیخ و پکار کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا تم ان کے بہت سے منصوبوں سے واقف رہتی ہو مجھے بتاؤ کہ وہ پونم کو کہاں لے گیا ہے۔''

''عادل میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ مجھ سے بھی اپنے بہت سے راز چھپاتے ہیں ویسے میں یہ نہیں سمجھتی کہ وہ پونم کو کوئی نقصان پہنچائیں گے اگر جوگندر پال اسے کہیں لے گیا ہے تو تمہیں ذرا صبر سے اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے۔''

''مجھ سے صبر نہیں ہوتا وہ بہت ہی معصوم لڑکی ہے وہ واپس نہ آئی تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میں سیٹھ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں وہ کہاں ہیں؟''

''جے راج صبح سے یہاں نہیں ہے شاید وہ پھر پونا چلا گیا ہے۔ عادل تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو، اگر جے راج اور جوگندر پال کہیں غائب ہو جائیں تو تم انہیں تلاش نہیں کر سکو گے اور نہ ہی ان کے خلاف کچھ کر سکو گے۔ انہوں نے تمہارے لئے ایک مار کھانے والے غنڈے کو کرائے پر حاصل کیا تھا وہ مارنے اور قتل کرنے والے غنڈوں کو بھی کرائے پر حاصل کر کے تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں میری بات مانو غصے میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے۔ دیکھو رات ہے تنہائی ہے اور میں ہوں آؤ میری بانہوں میں آ کر پونم کو بھول جاؤ''

وہ دونوں بانہیں پھیلا کر اس کے گلے کا ہار بننے کے لئے آگے بڑھی عادل نے غصے سے اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا پھر پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆======☆======☆

پونم نے آنکھ کھول کر دیکھا تو پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں پہنچ گئی ہے۔ ایک بہت بڑا سا کمرہ تھا اونچی اونچی دیواریں تھیں جن پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، چھت سے ایک بہت بڑا اور بہت ہی خوبصورت فانوس لٹک رہا تھا۔ فانوس کے درمیان سے لٹکنے والے حریری پردے ایک بڑے سے پلنگ کے چاروں طرف مسہری کی طرح پھیل گئے تھے اور وہ بڑے آرام دہ بستر پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ بستر کے چاروں طرف خوبصورت داسیاں ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں۔ ان سے ذرا دور ایک خوش پوش عورت ایک چبوترے پر بیٹھی ہوئی مدھم سُروں میں ستار بجا رہی تھی۔ ستار کے میٹھے سُروں

نے ہی راجکماری کو بیدار کیا تھا۔

وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے بدن پر وہ لباس نہیں تھا جسے پہن کر وہ عادل کے ساتھ جوگندر پال کے پاس گئی تھی۔ اس کے بدن پر ایک خوبصورت سا کڑھائی کیا ہوا نائٹ گاؤن تھا۔ پہلے تو اسے خیال آیا کہ وہ سپنا دیکھ رہی ہے کیونکہ اس ہندو بوڑھے نے اسے راجکماری کہتے کہتے ایک راجکماری کا سپنا دیکھنے کی عادت ڈال دی تھی لیکن وہ خواب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اب سے پہلے اس کے کسی بھی خواب میں عادل کی یاد نہیں آتی تھی اور اس وقت وہ یاد آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں کہاں ہوں۔ تم سب کون ہو؟"

ایک داسی نے دست بستہ عرض کیا۔

"راجکماری ہزار برس جئے ہم سب آپ کی داسیاں ہیں۔"

اس نے چیخ کر کہا۔

"میں راجکماری نہیں ہوں مجھے بتاؤ عادل کہاں ہے؟"

ایک داسی نے بڑی اداسی سے کہا۔

"افسوس آپ ابھی تک عادل کو نہیں بھولیں اس کی موت کو پچیس برس گزر چکے ہیں آپ کب تک سوگ منائیں گی؟"

وہ بستر سے اتر کر داسی کے پاس آئی اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

"تم سب پاگل ہو عادل کو پیدا ہوئے بھی پچیس برس نہیں ہوئے ہوں گے پھر وہ پچیس برس پہلے کیسے مر گیا؟"

داسیوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی وقت دروازے کی طرف سے ایک بھاری بھرکم سی آواز سنائی دی۔

"ہر ہر مہا دیو۔ بیٹی ہوش میں آؤ، کب تک اس مرنے والے کو پاگلوں کی طرح پکارتی رہو گی جو بوڑھا تمہیں اس راج محل سے اٹھا کر لے گیا تھا کیا اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ تم راجکماری شکنتلا ہو ایک بار عادل کے عشق میں جان دینے کے بعد تم نے دوسرا جنم لیا ہے۔ ہر ہر مہا دیو۔ بھگوان کی لیلا نیاری ہے دوسری بار بھی تمہیں وہی رنگ وہی روپ اور اسی بہروپ میں پیدا کیا ہے۔"

پونم حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس جوگی کو دیکھ رہی تھی جس نے گیروے رنگ کا

لباس پہن رکھا تھا اس کے ایک ہاتھ میں کمنڈل اور دوسرے ہاتھ میں ترشول تھا۔ سر کے اوپر بالوں کا ایک بڑا سا جوڑا بندھا ہوا تھا اور گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی اس نے پونم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"پتری اپنے نئے جیون کی ساری باتیں بھول جا۔ اپنے پچھلے جنم کی بدنصیبیوں کو یاد کر۔ ایک مسلمان کی محبت نے تجھے بے موت مارا تھا تو ادھرمی ہو کر مری تھی اور اب دھرم والی ہو کر اس لئے جنم لیا ہے کہ اپنے پچھلے پاپوں کا پرائشچت کرے۔"

پونم نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

"تم کون ہو کہاں کے جوگی ہو؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو جسے عقل تسلیم نہیں کرتی۔ میں راجکماری شکنتلا نہیں ہوں، میں ایک مسلمان لڑکی ہوں کیونکہ میرا باپ بھی مسلمان تھا۔"

"شیو شمبھو!" جوگی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں پتری تجھے دھرم کے راستے سے کسی نے بھٹکا دیا ہے پچھلے جنم میں تو راجکماری بن کر اس راج محل میں پیدا ہوئی تھی اس جنم میں تو نہ جانے کس کے گھر میں پیدا ہوئی۔ میں انتر گیانی ہوں برسوں کے بعد اپنے گیان سے یہ معلوم کیا تھا کہ تو راجکماری ہو کر کہیں داسی کا کام کر رہی ہے اور پھر کسی مسلمان کی محبت کے فریب میں آ رہی ہے اسی لئے میں تجھے یہاں لے آیا ہوں۔"

پونم نے کہا۔ "میں تمہارے دھرم کو اور آواگون کے اس فلسفے کو نہیں مانتی کہ انسان ایک بار مرنے کے بعد دوسری بار جنم لیتا ہے۔ میرے مذہبی عقیدے کے مطابق فنا کے بعد اس دنیا میں دوسری زندگی نہیں ملتی مرنے والے قیامت کے دن جلائے جائیں گے۔"

"تو نادان ہے میری بچی میں اپنے دھرم کی سچائی ثابت کر دوں گا میرے ساتھ آ اور اس راج محل کو اچھی طرح دیکھ تجھے اپنے پچھلے جنم کی تمام باتیں یاد آ جائیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور راجکماری کی خوابگاہ سے باہر جانے لگا پونم اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بولی۔

"اگر تو نے یہ ثابت کر دیا کہ میں نے سچ مچ دوسرا جنم لیا ہے تب بھی میں اپنے عادل کو نہیں بھولوں گی۔"

"تو عادل کو کب بھولی ہے جو اب بھولے گی۔ تیرا پچھلا جنم مٹ گیا مگر عادل کا نام تیری زبان سے نہ مٹ سکا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ پریم میں بڑی شکتی ہے۔"

وہ پونم کو ساتھ لئے اسے راج محل کی سیر کراتا رہا اور اسے بتاتا رہا کہ وہ بچپن میں

کہاں کھیلتی تھی، کہاں پڑھتی تھی اور جوان ہونے تک اس راج محل میں کس طرح ہنستے کھیلتے زندگی گزارتی رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا پونم سن رہی تھی اور راج محل کی ایک ایک چیز اور ایک ایک سجاوٹ کو دیکھتی ہوئی سپنوں میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ اس نے سوتے جاگتے خیالوں کے دھندلکے میں اس راج محل کو دیکھا ہے۔ بوڑھے بابا نے اس راج محل کے ایک ایک کمرے اور ایک ایک راہداری کے متعلق اسے بتایا تھا۔ اس کی باتیں سن کر چشمِ تصور میں جو راج محل ابھرا تھا وہ یہی تھا جہاں اب وہ سانس لے رہی تھی وہاں کی ساری چیزیں اور سارا ماحول جانا پہچانا سا لگ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پہلے بھی یہاں آ چکی ہے اور رہ چکی ہے۔ اس کے کچے دماغ میں جھوٹ اور سچ خلط ملط ہو گئے۔ وہ سچ کو جھوٹ سے اور جھوٹ کو سچ سے الگ نہ کر سکی۔ سپنے اور سچائی کے درمیان بھٹکتی چلی گئی۔

پھر وہ ایک بڑی سی تصویر کے سامنے آ کر ٹھٹک گئی۔ وہ ایک بہت بڑی سی روغنی تصویر تھی جو زینے کے پاس والی دیوار پر چسپاں تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ اس کی اپنی تصویر تھی۔ اس تصویر میں پونم سیاہ لباس پہنے سر جھکائے سوگوار بیٹھی تھی۔ وہ اپنی پشت کی جانب فرش پر ہاتھ ٹیکے ہوئے تھی۔ اس کے پس منظر میں سوکھے درخت تھے اور دور تک قبریں پھیلی ہوئی تھیں چند قبروں پر سے چمگادڑیں اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس تصویر میں ایک ایسی قبر تھی جس میں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

وہ بڑی محویت سے اپنی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کانوں کے قریب جوگی کی بھاری بھرکم آواز گونج رہی تھی۔

''راجکماری شکنتلا! غور سے دیکھو یہ تمہاری تصویر ہے اس تصویر کے رنگ و روغن بتا رہے ہیں کہ یہ آج سے تقریباً پچیس برس پہلے بنائی گئی ہے تمہاری عمر پچیس برس نہیں ہے پھر سوچو کہ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے یہ تصویر کیسے بنائی گئی؟''

وہ گم صم کھڑی رہی اور سوچتی رہی کہ واقعی وہ تصویر کیسے بنائی گئی اور اس حالت میں کیوں بنائی گئی۔ اس نے پوچھا۔

''اگر یہ میری تصویر ہے تو میں کس کا سوگ منا رہی ہوں؟''

''تم عادل کا سوگ منا رہی ہو اور وہ قبر جس سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں وہ عادل کی قبر ہے۔''

وہ چیخ کر بولی۔ ''نہیں عادل زندہ ہے میں کچھ دیر پہلے اس سے مل چکی ہوں۔ اس نے مجھے نیا لباس پہنایا تھا اور مجھے اپنے سینے سے لگایا تھا میں اب تک اس کے دل کی دھڑکنیں اپنے سینے میں محسوس کر رہی ہوں۔''

''راجکماری! یوں تو صدیاں، صدیوں میں گزرتی ہیں لیکن دوسرا جنم لے کر یوں لگتا ہے جیسے ایک صدی ایک پل میں گزر گئی ہے۔ تمہیں بھی برسوں پرانی دھڑکنیں یوں لگ رہی ہیں جیسے عادل ابھی تمہارے قریب آیا تھا اور پھر تم سے بچھڑ کر چلا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس جلتی ہوئی قبر میں عادل کی آتما بے چین ہے کہ اکثر راتوں کو اس کی آتما اس قبر کے پاس آتی ہے اور پکار پکار کر تم سے کہتی ہے۔ ''راجکماری یہاں آؤ اور میری اس قبر کی آگ کو بجھاؤ۔ کیا تمہیں میری اس بات کا یقین ہے کہ عادل کی آتما اس قبر کے پاس آتی ہو گی اور تمہیں پکارتی ہو گی؟''

پونم نے جواب دیا۔

''اگر میں اس کی آتما کو دیکھ لوں اور اس کی پکار سن لوں تو مجھے یقین آ جائے گا۔''

''تم ضرور اسے دیکھو گی اور اس کی پکار کو سنو گی جاؤ ابھی آرام کرو، اگر کسی رات اس کی آتما نے تمہیں پکارا تو میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔''

☆======☆======☆

عادل دوسری صبح پھر جوگندر پال کی کوٹھی میں گیا، کوٹھی کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور جوگندر پال ڈرائنگ روم میں چار ہٹے کٹے بدمعاشوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ عادل نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''پونم کہاں ہے؟''

جوگندر پال نے کہا۔ ''آؤ یہاں اطمینان سے بیٹھو۔ معلوم ہوتا ہے پونم کے لئے رات بھر تڑپتے رہے ہو تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

''میری آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اگر پونم نہ ملی تو میں تمہارا خون کر دوں گا۔''

جوگندر پال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے آس پاس دیکھ لو کتنے شریف آدمی بیٹھے ہوئے ہیں میں جانتا تھا کہ پونم نہیں ملے گی تو تم کھوپڑی سے باہر ہو جاؤ گے اس لئے احتیاطاً یہ باڈی گارڈز رکھ لئے ہیں ورنہ دھرم کی بات یہ ہے کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ ہی پونم کو نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم

آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو پونم تمہیں مل جائے گی۔"

"میرے اطمینان کے لئے پہلے یہ بتادو کہ پونم کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہے آرام سے ہے میں تمہیں یہ نصیحت کروں گا کہ پونم کے لئے اتنے پاگل نہ بنو ورنہ یہ عیش وآرام کی زندگی چھن جائے گی تم پھر ایک بار فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے پھرو گے۔ اگر معاہدے کے مطابق کوئی سوال کئے بغیر تم ہمارے حکم کی تعمیل کرتے رہے تو میرا یہ وعدہ ہے کہ پونم ہمیشہ کے لئے تمہارے حوالے کردی جائے گی۔"

"لیکن ابھی وہ کہاں ہے۔ مجھے کچھ تو معلوم ہونا چاہئے کہ تم اسے کہاں لے گئے ہو؟"

"تم پھر سوال کررہے ہو۔" جوگندر پال کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

عادل صوفے سے اچھل کر کھڑا ہوگیا اور غصے سے بولا۔

"تمہارے سوال جواب کی ایسی کی تیسی میں تمہاری باتوں سے بہلنے والا نہیں ہوں مجھے ابھی پونم سے ملاؤ نہیں تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے جوگندر پال کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے چاروں بدمعاش اچانک ہی اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ لیا۔ عادل ان کی گرفت سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگا کسی کو سر سے ٹکریں مارنے لگا کسی کو ٹھوکروں سے الگ کرنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں اچھی خاصی جنگ ہونے لگی۔ جلد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ وہ اکیلا چاروں پر بھاری پڑے گا۔ آخر اسے گرفت میں رکھنے کے لئے ایک بدمعاش نے ماربل کی بھاری ایش ٹرے اٹھا کر پیچھے سے اس کے سر پر دو چار ضربیں لگادیں۔ عادل اپنا سر تھام کر لڑکھڑانے لگا اس کے بعد انہوں نے آسانی سے اس پر قابو پالیا۔ اس حالت میں بھی وہ ان کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے پھر اسے اٹھا کر اندر ایک کمرے میں لے گئے اور وہاں ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

جوگندر پال اس کے سامنے ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ چاروں بدمعاشوں کو باہر بھیج کر اس نے کمرہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ تنہائی میں اس نے عادل سے کہا۔

"غصے میں تم پاگل ہاتھی بن جاتے ہو۔ مجھے تمہارے لڑنے کا انداز بہت پسند آیا ہے مجھے تمہارے جیسے آدمی کی ضرورت ہے میں تمہیں دوست بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔"

"ایک دوست دوسرے دوست کو نقصان نہیں پہنچاتا اور تم میرے ساتھ کیسا سلوک

کررہے ہو۔ یہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

"عادل مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، تم نے ایسا سلوک کرنے پر مجھے مجبور کردیا تھا اگر تم مجھ پر اعتماد کرو اور دوستی نبھانے کا وعدہ کرو تو میری ذات سے تمہیں ہمیشہ فائدہ پہنچتا رہے گا۔"

عادل نے کہا۔ "مجھے کسی فائدے کا لالچ نہیں ہے اگر تم دوست بن کر رہنا چاہتے ہو تو پونم کو میرے حوالے کردو۔"

"آج رات پونم تمہیں مل جائے گی لیکن اسے پانے کے لئے ہم تمہیں جو کہیں وہ کرنا ہوگا۔"

"جب تک مجھے سوال کرنے کا حق نہیں دیا جائے گا اس وقت تک میں کوئی بات نہیں مانوں گا۔ اگر تم دوستی کا دم بھرتے ہو تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ صاف صاف بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟"

"اگر میں صاف صاف بتادوں تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟ جو ڈرامہ ہم کھیل رہے ہیں اس کے اختتام پر بہت بڑی دولت ہاتھ آئے گی، اگر تم دیانتداری سے ساتھ دو گے تو تمہیں اس دولت کا ایک حصہ بھی ملے گا اور پونم بھی ملے گی۔"

"مجھے منظور ہے پونم کو حاصل کرنے کے لئے میں ہر مرحلے پر تمہارا ساتھ دوں گا۔"

جوگندر پال ایک سگار سلگا کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ پھر اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا تو سنو! ہندوستان تقسیم ہونے سے پہلے پونم شانتی نگر کے راجا کی بیٹی کی حیثیت سے دیکھی گئی تھی اس وقت وہ راجکماری شکنتلا تھی اس کے ماں باپ مرچکے تھے اس لئے ریاست کا کاروبار میرے باپ کے ہاتھوں میں تھا محل کے انتظامات کے لئے ایک ناظم رکھا گیا تھا اس کا نام مکرم علی تھا کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ راجکماری شکنتلا مکرم علی کے عشق میں گرفتار ہوگئی ہے اور وہ دونوں اکثر چوری چھپے ملا کرتے ہیں۔ میرا باپ اس محل میں دیوان جی کہلاتا تھا اس نے شکنتلا کو اس عشق سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ریاست کے تمام بڑے عہدیدار بھی یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ راجکماری اپنا تن من دھن ایک مسلمان کے حوالے کردے۔ ان دنوں بڑے بڑے شہروں میں فرقہ ورانہ فساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک ہندو عورت اور ایک مسلمان مرد کی محبت جلتی آگ میں تیل چھڑکنے کا

کام کررہی تھی۔

دیوان جی کی روم تھام کے باوجود راجکماری اور مکرم علی کی محبت بہت آگے بڑھ چکی تھی، جلد ہی یہ انکشاف ہوا کہ راجکماری کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ مکرم علی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ دیوان جی نے اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے راجکماری کو محل میں نظر بند کردیا اس وقت تک ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ کانگریس پارٹی نے اقتدار سنبھالتے ہی اعلان کیا تھا کہ تمام ریاستوں کو حکومت میں ضم کرلیا جائے گا ریاستوں کا الگ سے کوئی وجود نہیں ہوگا اور اس سلسلے میں راجاؤں کو سالانہ وظیفے دیئے جائیں گے۔

یہ اعلان سن کر دیوان جی کو فکر ہوئی کہ ریاست کی تمام دولت ہندسرکار کے قبضے میں چلی جائے گی۔ اس محل کی ایک آہنی تجوری میں سونے کی اینٹوں کے علاوہ ایسے بیش قیمت ہیرے جواہرات تھے جن کی مالیت کروڑوں اور اربوں روپے تک پہنچتی تھی۔ دیوان جی اس فکر میں تھے کہ راجکماری کی شادی اپنے بیٹے یعنی میرے ساتھ کردیں۔ اگرچہ راجکماری کا پاپ ظاہر ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ بے انتہا دولت پر قابض ہونے کے لئے اسے مجھ سے بیاہنا چاہتے تھے اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ مکرم علی کو ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دیں اور وہ دولت ایسی جگہ چھپا دیں کہ جہاں تک ہندسرکار نہ پہنچ سکے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ راجکماری جب بچے کو جنم دے گی تو اس بچے کو ہلاک کردیا جائے گا یہ بات راج محل سے باہر نہیں جائے گی، پھر چند ماہ بعد راجکماری کی شادی مجھ سے کردیں گے۔

اس منصوبے کے تحت ایک رات مکرم علی کو راج محل میں بلایا گیا وہاں دیوان جی کے آدمیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر قتل کردیا۔ راج محل کے پیچھے سوگز کے فاصلے پر مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان تھا وہاں مکرم علی کی لاش کو دفن کردیا گیا۔ اس کی قبر بہت گہری کھودی گئی تھی اس گہرائی میں سونے کی اینٹیں اور تمام ہیرے جواہرات چھپا دیئے گئے اوپر سے قبر کو پختہ بنا دیا گیا اس کام سے فارغ ہو کر دیوان جی مطمئن ہو گئے کہ جب بھی موقع ملے گا اس قبر کی تہہ سے وہ خزانہ نکال لیا جائے گا۔

چھ ماہ بعد راجکماری کی زچگی کا وقت قریب آگیا۔ دیوان جی نے محل میں سخت پہرہ لگا دیا۔ ایک بوڑھی دائی اور ایک بوڑھے مالی کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ بوڑھے مالی کو حکم دیا گیا تھا کہ بچہ ہوتے ہی اس کا گلا دبا کر پھر اسے چھپا کر کہیں دور لے جا کر پھینک دے دیوان جی کے حکم کے مطابق عمل کیا گیا۔ وہ بوڑھا مالی راجکماری کے

ننھے بچے کو لے کر محل سے باہر گیا اور دیوان جی دھوکہ کھا گئے وہ بوڑھا پھر لوٹ کر محل میں نہیں آیا۔ زچگی کے بعد راجکماری کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ایسے وقت جب اسے پتہ چلا کہ مکرم علی کو قتل کردیا گیا ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی دو ماہ تک پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی رہی۔ وہ سیاہ لباس پہن کر مکرم علی کی قبر پر جاتی تھی اور روتے روتے بیہوش ہو جایا کرتی تھی اسی طرح اس نے روتے روتے جان دے دی۔ دیوان جی اسے اپنی بہو نہ بنا سکے۔ اب اس ریاست کا کوئی وارث نہ تھا ایک ننھی سی بچی تھی جسے وہ بوڑھا اپنے ساتھ لے گیا تھا لہٰذا دیوان جی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ راجکماری کی شادی مجھ سے ہو چکی تھی۔ ریاست کے بڑے پنڈت کو انہوں نے اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ وہ اور ریاست کے دوسرے بڑے عہدیدار بھی اس بات کے گواہ تھے کہ میں نے راجکماری کے ساتھ لگن منڈپ میں سات پھیرے لگائے ہیں اس کے بعد بوڑھی دائی اس بات کی گواہ تھی کہ راجکماری کے بطن سے میری ایک اولاد ہے جسے ایک بوڑھا مالی اٹھا کر لے گیا ہے اس طرح میں اور وہ گمشدہ بچی ریاست کے وارث بن گئے اور وہ راج محل ہمارے قبضے میں رہا۔ ہندسرکار نے وہ ریاست تو ختم کردی لیکن ہمیں آج تک وظیفہ دے رہی ہے۔''

عادل نے پوچھا۔ ''اور اس پوشیدہ خزانے کا کیا ہوا؟''

''وہ خزانہ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے ہم اب تک اسے حاصل نہیں کرسکے حالانکہ وہ محل کے پیچھے سوگز کے فاصلے پر اب تک مکرم علی کی قبر میں محفوظ ہے۔''

''تعجب ہے کہ خزانہ آپ کے سامنے موجود ہے اور اب تک آپ اسے حاصل نہیں کر سکے۔''

''دیوان جی نے اپنی زندگی میں ایک بار اس خزانے کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن جب ان کا ایک آدمی کدال لے کر اس قبر کو کھودنے کے لئے گیا تو اچانک ہی اس قبر سے چنگاریاں نکلنے لگیں کدال لے کر کھودنے والا ان چنگاریوں سے جھلس کر سیاہ پڑ گیا۔ اس کے تمام جسم پر چھالے پڑ گئے اور وہ دونوں آنکھوں سے اندھا ہو گیا اس کے بعد کسی دوسرے نے وہاں جانے کی ہمت نہیں کی۔ دیوان جی نے سمجھا کہ وہ کوئی جادوئی کرشمہ ہے انہوں نے ایک بہت بڑے جادوگر کو بلا کر اس سے کہا کہ اگر وہ اپنے منتروں سے اس قبر کو کھول دے گا تو اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ جادوگر نے پتہ نہیں کیسے کیسے منتر پڑھے اس قبر پر ان منتروں کی بندش کی پھر کدال لے کر اسے کھولنے کے لئے گیا لیکن اس کا بھی

وہی انجام ہوا۔قبر سے چنگاریاں نکلیں اور وہ جھلس کر اندھا ہو گیا۔

آخر دیوان جی نے تھک ہار کر ایک مسلمان عالم بلایا اور اس سے پوچھا کہ ایک مسلمان جو قتل کر دیا گیا ہو اور اسے چھپا کر دفن کر دیا جائے تو کیا اس کی قبر سے چنگاریاں نکلتی ہیں؟''

اس عالم دین نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسا تو نہیں ہوتا کتنے ہی مسلمان قتل کئے جاتے ہیں مگر ان کی قبر سے چنگاریاں نہیں نکلتیں جس قبر کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہاں ایسی کوئی خاص بات ہے جس کا علم مجھے نہیں ہے اگر آپ کو ہے تو مجھے وضاحت سے بتائیں تبھی میں اس راز تک پہنچ سکوں گا کہ اس قبر سے چنگاریاں کیوں نکلتی ہیں؟''

دیوان جی اسے حقیقت نہیں بتانا چاہتے تھے اس لئے اس قبر کی نشاندہی بھی نہیں کی تھی۔انہوں نے پوچھا۔

''اگر ایک مقتول مسلمان کے ساتھ خزانہ دفن کر دیا جائے تو کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''

عالم دین نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔''ہاں یہ بات دین و ایمان کے خلاف ہے۔ایک مسلمان مرنے کے بعد اس دنیا کی کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاتا صرف اپنے اعمال لے جاتا ہے اگر اس کے ساتھ سونا چاندی اور دوسرے خزانے دفن کئے جائیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اس دنیا کی دولت اس کی قبر کو جلاتی ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اس مقتول کو قبر کے عذاب سے کیسے نجات دلائی جا سکتی ہے؟''

''اس کے لئے اس کی اولاد دعا کرے کوئی لالچی انسان اس قبر کو کھود کر اس خزانے کو حاصل نہیں کر سکتا اگر اس کی کوئی اولاد ہو تو وہ نیک نیتی سے اس قبر کو کھولے اور اس خزانے کو غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دے۔تبھی اس قبر کی آگ بجھ سکے گی۔''

اس عالم دین کی باتیں سن کر ہم سب پریشان ہو گئے۔کیونکہ مکرم علی کی جو بچی تھی اسے وہ بوڑھا نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔خزانے کو حاصل کرنے کے لئے اس بچی کو تلاش کرنا ضروری تھا۔اس بچی کو ہم صرف صورت شکل سے پہچان سکتے تھے۔بوڑھی دائی نے ہمیں بتایا تھا کہ بچی کا ناک نقشہ بالکل راجکماری شکنتلا کی طرح تھا۔اس عالم دین نے جو کچھ بتایا تھا صرف اپنے ہی نظریئے کے مطابق بتایا تھا اور ہمارے دھرم کے عقیدے کچھ اور تھے۔ہم نے ایک پنڈت کو بلا کر پوچھا۔اس نے کہا۔

''وہ مسلمان عالم بیکار باتیں کرتا ہے۔مصر میں اب تک ایسے بادشاہوں کی قبریں پائی جاتی ہیں جن کے ساتھ بے انتہا دولت دفن کی گئی تھی لیکن ان کی قبر سے کبھی چنگاریاں نکلتی نظر نہیں آئیں۔یہ صرف مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد صرف ان کے اعمال ان کے ساتھ جاتے ہیں۔میں تمہیں بتاؤں گا کہ کس طرح اس قبر کی آگ بجھائی جا سکتی ہے اور وہ خزانہ حاصل کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس لڑکی کو تلاش کر کے لاؤ جسے وہ بوڑھا لے گیا ہے۔'' یہ کہہ کر جوگندر پال خاموش ہو گیا۔وہ ذرا دیر تک اپنا بجھا ہوا سگار دوبارہ سلگاتا رہا اس کے بعد اس نے کہا۔

''دیوان جی کے مرنے کے بعد میں اسے تلاش کرتا رہا۔کل رات تم نے اس لڑکی کو میرے پاس پہنچا دیا، پونم اس وقت اپنے راج محل میں ہے۔پہلے ہم نے سوچا تھا کہ ہم پونم کے سامنے اسے راجکماری شکنتلا کی بیٹی نہیں کہیں گے بلکہ اسے یہ سمجھائیں گے کہ وہ خود راجکماری شکنتلا ہے جس نے آواگون کے عقیدے کے مطابق دوسرا جنم لیا ہے۔راج محل میں اسے یہی بات سمجھائی جا رہی ہے لیکن تمہاری ضدی طبیعت نے مجھے یہ سمجھا دیا ہے کہ تم آواگون کے عقیدے پر یقین نہیں کرو گے اسی لئے میں تمہیں تمام سچی باتیں بتا رہا ہوں۔''

عادل نے پوچھا۔''تم یہ سچی باتیں بتا کر وہ خزانہ کس طرح حاصل کرو گے؟''

جوگندر پال نے جواب دیا۔''پنڈت اور مسلمان عالم دونوں کے نظریئے اور عقیدے کے مطابق وہ قبر کھودی جائے گی۔مسلمان عالم نے کہا تھا کہ مکرم علی کی اولاد اس قبر سے خزانے کو نکال سکتی ہے۔پنڈت نے کہا ہے کہ مکرم علی جیسے ایک بے گناہ مسلمان کو قتل کر کے بہت بڑا پاپ کیا گیا ہے۔ہمارے دھرم کے ایک آدمی نے اس مسلمان کو قتل کیا تھا اگر ایک مسلمان ہمارے دھرم کے آدمی کو مار کر اس کے خون کے چھینٹے اس قبر پر مارے تو اس قبر کی آگ بجھ جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان پھر اس راج محل کی کسی لڑکی سے محبت کرتا ہو جس طرح مکرم علی اس راج محل کی شکنتلا سے محبت کرتا تھا۔ہم نے اسی لئے تمہیں پونم کی تلاش میں لگایا تھا کہ تم اسے ڈھونڈو گے، اس سے ملو گے اور اس سے محبت کرو گے ہمارا یہ منصوبہ کامیابی سے تکمیل کی طرف جا رہا ہے۔تم مسلمان ہو اور پونم سے دیوانہ وار محبت کر رہے ہو آج رات میں تمہیں اس راج محل کے پیچھے اس قبر کے پاس لے جاؤں گا۔پونم وہاں تمہیں ملے گی۔اس راج محل کی ایک لڑکی پھر اپنی ماں کے عشق کی داستان کو دہرائے گی۔وہاں پھر دیوان جی کی طرح کوئی تم دونوں کے درمیان دیوار بنے گا اگر تم نے اس

دیوار کو گرا دیا اور اس کے خون سے اس قبر کی آگ بجھا دی تو تمہیں پونم مل جائے گی۔''

عادل نے کہا۔ ''میری محبت کے سامنے جو شخص بھی آ کر رکاوٹ بنے گا وہ یقیناً تمہاری طرف سے بھیجا جائے گا، مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ ہندو ہو گا یا مسلمان اگر ہندو ہو گا تب بھی بے گناہ ہو گا اور کسی لالچ کے تحت آلہ کار بن کر میرے سامنے آئے گا، میں اسے اچھا نہیں سمجھتا کہ اپنے ہاتھوں سے ایک بے گناہ انسان کو قتل کر دوں۔''

جوگندر پال نے اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھولتے ہوئے کہا۔

''ایک بار تم نے کہا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لئے قتل بھی کر سکتے ہو تا میں جانتا ہوں کہ تم پونم سے ملنے سے انکار نہیں کرو گے۔ لہٰذا آج رات اس سے ملنے ضرور جاؤ گے اور جب اس کی اور تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی تو تم جان بچانے کے لئے قتل کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا اب تم جاؤ شام کو پانچ بجے میرے پاس آ جانا راج محل یہاں سے آٹھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے ہم آدھی رات تک وہاں پہنچ جائیں گے۔''

عادل نے آزاد ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے پھر اس نے پوچھا۔

''اس کہانی میں جے راج اور سادھنا کون سا رول ادا کر رہے ہیں؟''

جوگندر پال نے جواب دیا۔

''ہند سرکار کی طرف سے جو وظیفہ مجھے ملتا ہے وہ میرے اخراجات کے لئے ناکافی ہے، جے راج میرا فنانسر ہے اور راز دار بھی ہے۔ وہ بہت بڑا جوہری بھی ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ قبر سے نکلنے والے ہیرے جواہرات کو اچھے داموں فروخت کرائے گا۔ عادل، یہ تمہارے لئے سنہری موقع ہے۔ خوش قسمتی تمہارے لئے پونم کی محبت اور راج محل کی دولت کے دروازے کھول رہی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔''

عادل نے کوئی جواب نہیں دیا چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر وہ ہینگنگ گارڈن کے سامنے آیا اور ایک طرف گاڑی کھڑی کر کے ایک سگریٹ سلگانے کے بعد پُر سکون ہو کر موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔ جوگندر پال سے بہت کچھ سننے کے بعد بھی یہ چکر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جوگندر پال راجکماری شکنتلا سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ناکام رہا پونم اسی راجکماری کا رنگ روپ لے کر اس کے سامنے آئی ہے اگرچہ جوگندر پال کافی عمر رسیدہ ہے لیکن بظاہر بوڑھا نظر نہیں آتا۔ کیا وہ پونم کو حاصل کر

کے اپنی پچھلی ناکامی کا زخم نہیں بھرے گا؟ اس کا باپ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مکرم علی، راجکماری سے شادی کرے۔ پھر جوگندر پال یہ کیسے گوارا کرے گا کہ میں بھی مسلمان ہو کر راجکماری کی بیٹی سے شادی کروں؟

پھر اس کے دماغ میں دوسرا خیال آیا کہ جوگندر پال صرف دولت کا لالچی لگتا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لئے اس نے جے راج کو پارٹنر بنایا ہے اور اب مجھے بھی پارٹنر بنا رہا ہے اور پونم کو بھی میرے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ لوگ دولت کے لئے اپنے دھرم کی لڑکی دوسرے دھرم والے کو دے دیتے ہیں۔

وہ جوگندر پال کی حمایت میں بھی سوچ رہا تھا اور مخالفت میں بھی سوچ کر محتاط رہنا چاہتا تھا پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایک مسلمان کی قبر سے چنگاریاں کیسے نکلتی ہوں گی؟ وہ بہت دیر تک اس قبر کے متعلق سوچتا رہا، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے دوبارہ کار اسٹارٹ کی اور کسی عالم دین کی تلاش میں چل پڑا۔

دو گھنٹے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے مکان میں ایک بزرگ ہستی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ کس طرح ایک مسلمان کو قتل کر کے اس کے ساتھ بہت بڑا خزانہ دفن کیا گیا ہے۔ دفن کرنے والے جب اس خزانے کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس قبر سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔

بزرگ ہستی نے اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف میں کلمات پڑھنے کے بعد کہا۔

''اللہ کے رازوں کو کوئی نہیں جان سکتا ایسا کیوں ہوتا ہے میں نہیں سمجھ سکتا ویسے یہ درست ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ اس دنیا کا کوئی خزانہ نہیں جاتا صرف اس کے اعمال جاتے ہیں۔ جو واقعہ تم سنا رہے ہو، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو مقتول مسلمان وہاں دفن کیا گیا ہے وہ لالچی نہیں تھا اس نے یہ تمنا نہیں کی تھی کہ اس کے ساتھ خزانہ دفن کیا جائے۔ لہٰذا وہ مقتول مسلمان کسی عذاب میں مبتلا نہیں ہے، اگر اس قبر سے چنگاریاں نکلتی ہیں تو مقتول کی روح کو اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی کیونکہ اس کی روح ہمارے عقیدے کے مطابق عالمِ ارواح میں پہنچ چکی ہو گی۔ قبر میں تو وہ جسم دفنایا گیا ہے جو فنا ہونے کے لئے ہی پیدا کیا جاتا ہے اب تک تو اس کی ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی لہٰذا اس خزانے کا اور اس قبر سے نکلنے والی چنگاریوں کا مقتول مکرم علی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ خزانہ ایک امانت ہے، تمہارے کہنے کے مطابق اگر پونم، راجکماری شکنتلا اور مکرم علی کی بیٹی ہے تو وہ

خزانہ صرف اسے ہی ملے گا اس کے علاوہ جو بھی اسے ہاتھ لگائے گا اسے صرف انگ
ملیں گے۔''

عادل نے پوچھا۔ ''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک ہندو کو قتل کر کے اس کے خو
چھینٹے دیئے جائیں تو قبر کی آگ بجھ جائے گی؟''

''توبہ توبہ، بیٹے ایمان والے ایسا نہیں سوچتے۔ کسی انسانی جان کی قربانی دے
مطلوبہ چیز پر خون کے چھینٹے مارنا ایمان والوں کا کام نہیں ہے، ایسا کافروں کے یہاں
سمجھا جاتا ہے۔''

عادل وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اب وہ یہی سوچ رہا تھا کہ پونم سے ملاقات کر
کے دوران اگر کسی نے اس کی مخالفت کی تو اس سے نمٹنے کا طریقہ کیا ہوگا، مخالف بن کر
والا یقیناً جوگندر پال کا آلۂ کار ہوگا۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی ہو وہ اس کے خون کے چھینٹے
علی کی قبر پر نہیں پڑنے دے گا۔

☆======☆======☆

جے راج نے راج محل کے احاطے میں داخل ہو کر اپنی کار ایک جگہ کھڑی کر دی دور
برگد کے سائے میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا اس چبوترے پر جوگی مہاراج بیٹھے ہوئے تھے۔

جے راج نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

''پونم کا کیا حال ہے؟''

جوگی نے جواب دیا۔

''کبھی قائل ہو جاتی ہے کہ وہ راجکماری شکنتلا ہے اور اب اس نے دوسرا جنم لیا ہے
اور کبھی صاف انکار کر دیتی ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ بوڑھا مالی جو اسے اٹھا کر لے گیا تھا
ایک ہندو تھا پتہ نہیں اسلامی نظریات اس لڑکی کے دماغ میں کس نے ٹھونس دیئے ہیں، وہ
ہمارے آواگون کے عقیدے کو نہیں مانتی''۔

جے راج نے سر ہلا کر کہا۔

''ہاں عادل بھی ضدی اور غصہ ور ہے اور اپنے اسلامی عقیدوں کا سختی سے پابند ہے
اسی لئے جوگندر پال نے اسے صاف اور سیدھی بات بتا دی ہے کہ پونم، راجکماری شکنتلا کی
بیٹی ہے اور اس کا باپ ایک مسلمان تھا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ پونم کو بھی زبردستی آواگون
کے عقیدے پر یقین کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے''۔

''بات بدلنے سے گڑبڑ ہو جائے گی۔ پونم سمجھے گی کہ ہم فراڈ ہیں۔ اب ہم یہ کہہ کر کہ
وہ راجکماری کی بیٹی ہے اسے راجکماری شکنتلا اور مکرم علی کے عشق کی داستان سنائیں گے تو
وہ اس پر یقین نہیں کرے گی''۔

''اس کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے ہمارے کسی کام میں رکاوٹ نہیں پڑے گی،
کیونکہ عادل اس شرط پر ہمارا کام کرنے کے لئے تیار ہے کہ آج رات پونم اس کے حوالے
کر دی جائے گی اور اسے خزانے کا ایک بڑا حصہ بھی دیا جائے گا۔ تم راج محل میں جا کر پونم
کو یہ خوشخبری سنا دو کہ آج رات کو راج محل کے پیچھے مکرم علی کی قبر کے پاس عادل اس سے

ملنے آئے گا''۔

جوگی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تو حکم کا بندہ ہوں مجھ سے جو کہا جائے گا میں وہی پونم کو سمجھا دوں گا لیکن ضرور کہوں گا کہ تم اور جوگندر پال خزانہ حاصل کرنے کے لئے ایک دم سے بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو گئے ہو، اس لئے کوئی ٹھوس پلاننگ نہیں کر سکتے ہو اور اپنی چالیں بدلتے رہتے ہو بہر حال آج رات آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اس پلاننگ کا انجام کیا ہوتا ہے؟''

وہ بڑبڑاتا ہوا راج محل کی طرف چلا گیا۔ پونم اپنی خوابگاہ میں بستر کے سرے پر بیٹھی تھی اور داسیاں اس سے کچھ کھانے پینے کے لئے منتیں کر رہی تھیں لیکن وہ عادل کو پکار رہی تھی۔ جوگی نے کمرے میں آ کر کہا۔

''بھوکی رہو گی تو عادل نہیں ملے گا۔ میں تمہیں یہ خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ وہ آج رات اس قبر کے پاس آئے گا جس میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں''۔

پونم نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رات آنے سے پہلے ہی تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ عادل وہاں آئے گا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس کی روح نے اپنی آمد کی خبر دی ہے؟''

جوگی نے جواب دیا۔ ''نہیں میں نے تم سے غلط کہا تھا کہ عادل مر چکا ہے اور یہ بھی غلط کہا تھا کہ تم نے دوسرا جنم لیا ہے۔ تم راجکماری شکنتلا نہیں ہو بلکہ اس کی بیٹی ہو''۔

پونم نے پوچھا۔ ''کیا تم کوئی دوسری چال چلنے آئے ہو؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے میں کسی راجکماری کی بیٹی یا بادشاہ زادی بن کر خوش نہیں رہ سکتی صرف عادل کی محبوبہ بن کر رہ سکتی ہوں تم مجھے عادل کے پاس پہنچا دو پھر ایک نہیں ہزار جھوٹ بولا کرو، میں تمہاری بات کا یقین کر لیا کروں گی''۔

''اگر تم اس سے ملنا چاہتی ہو تو پھر یہ ماتم نہ کرو، کھانا پینا نہ چھوڑو آج رات تک بھروسہ کرو تمہیں تمہارا عادل مل جائے گا''۔

اس نے داسیوں سے کہا کہ اس کے لئے کھانا چن دیں اور اس کی ضرورتوں کا اچھی طرح خیال رکھیں۔ انہیں حکم دے کر وہ اس کمرے سے باہر چلا گیا۔ اسی محل کے ایک گوشے میں ایک قد آور جوان لنگوٹ پہنے ڈنڈ بیٹھک میں مصروف تھا۔ ایک خوبصورت سی لڑکی تھال میں مٹھائی سجائے اور ایک بالٹی دودھ لئے اس کمرے میں آئی، اس وقت پہلوان

بیٹھک لگا رہا تھا۔ بیٹھک لگاتے وقت اس حسینہ کو دیکھتے ہی بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ وہ بڑے ناز و انداز سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اس کے آگے ایک بالٹی دودھ اور مٹھائی کی تھال رکھ دی۔ پہلوان نے کہا۔

''پشپا میں نے تجھ سے کتنی بار کہا ہے۔ ایسے وقت نہ آیا کر میری ساری پہلوانی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ یہ عورت بھی کیا چیز ہے مرد بادشاہ بنے یا پہلوان سب کچھ عورت کے لئے ہی بنتا ہے''۔

پشپا نے اس کے تیل سے چپڑے ہوئے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور ہم عورتوں کے لئے قاتل بھی بنتا ہے بتا اب تک تو نے کتنے قتل کئے ہیں؟''

''بہت سے قتل کئے ہیں مگر بھگوان قسم اب خون خرابے کو جی نہیں چاہتا۔ آج رات آخری بار صرف تجھے حاصل کرنے کے لئے ایک مسلمان کو قتل کروں گا۔ جوگندر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے اسے قتل کر دیا تو وہ تمہیں انعام کے طور پر مجھے دے دیں گے اور جو خزانہ اس قبر سے نکلے گا اس میں سے بھی مجھے حصہ دیں گے آج مجھے خزانہ بھی ملے گا اور میری پشپا رانی بھی ملے گی''۔

یہ کہہ کر اس نے پشپا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا پشپا اس کے تیل اور پسینے سے بھیگے ہوئے سینے پر سر رکھتی ہوئی بولی۔

''اچھا تو تو یہ سب کچھ مجھے پانے کے لئے کر رہا ہے؟''

''ہاں تجھے پانے کے لئے بس ایک بار اور آخری بار کسی انسان کے خون سے ہاتھ رنگوں گا''۔

پشپا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہری سنگھ اس دنیا میں ایک سے ایک بلوان ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم سے زیادہ شکتی والا کوئی نہیں ہے، جسے تو قتل کرنے جا رہا ہے اگر وہ تجھ سے زیادہ بلوان ہوا اور اگر اس نے تجھے قتل کر دیا تو پھر میرا کیا بنے گا؟''

''تو گھبراتی کیوں ہے۔ میں کسی کے داؤ پیچ میں آنے والا آدمی نہیں ہوں، جیت میری ہو گی''۔

''میدانِ جنگ کا ہر سپاہی یہی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دوسرے کو مار کر آئے گا۔ اگر اپنی طاقت پر بھروسہ نہ ہو تو وہ میدانِ جنگ میں نہ جائے، مگر وہاں انسان کی طاقت نہیں تقدیر

فیصلہ سناتی ہے تو کیا جانے کہ تیری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اسی لئے پوچھتی ہوں کہ تیرے بعد میرا کیا بنے گا۔ میں تو روتے روتے مر جاؤں گی''۔

''پشپا تو ہمیشہ میری طاقت پر گھمنڈ کیا کرتی تھی مگر آج تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تو بزدلی کی باتیں کیوں کر رہی ہے؟''

''تیری محبت نے مجھے بزدل بنا دیا ہے جسے تو قتل کرنے جا رہا ہے اسے پونم صبح سے پکار رہی ہے۔ تو بھی جانتا ہے کہ وہ اس کی کیسی دیوانی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچ کر پونم کی جگہ پشپا ہے اور آج رات اس کی محبت کو کوئی قتل کر دے گا تو پشپا اپنے ہری سنگھ کو کس طرح رو رو کر پکارے گی؟''

ہری سنگھ آنکھیں پھاڑے بڑی سنجیدگی سے اپنی حسین محبوبہ کو تکنے لگا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی ہری سنگھ اسے چشمِ تصور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ قتل کر دیا گیا ہے اور پشپا اس کی لاش کے پاس سر پٹخ پٹخ کر اور اپنے بال نوچ نوچ کر بین کر رہی ہے۔ ہمیشہ جیتنے والا انسان کبھی اپنی ہار کے متعلق نہیں سوچتا لیکن پشپا نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ایک محبت نے دوسری محبت کے درد کا احساس دلا دیا تھا اور وہ پونم کی جگہ پشپا کو روتے اور پکارتے دیکھ رہا تھا، اس نے جھلا کر دودھ کی بالٹی کو ایک زور کی ٹھوکر ماری بالٹی الٹتی ہوئی اور دودھ پھیلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ پھر اس نے غصے سے کہا۔

''یہ سالی جو عورت ہوتی ہے نا یہ اپنے پیار سے مردوں کو بزدل بنا دیتی ہے۔ ہزار دامن بچانا چاہو۔ ہزار اپنی قوتِ ارادی سے کام لو پھر بھی مرد بہک ہی جاتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب تو میرے دل میں سما گئی تھی''۔

پشپا نے غصے سے کہا۔

''صاف کیوں نہیں کہتا کہ میں منحوس ہوں میں تو تیرے پاس محبت کرنے کے لئے نہیں آتی تھی تو ہی میری خوشامدیں کیا کرتا تھا۔ اب ان محبت کی گھڑیوں کو منحوس کہہ رہا ہے میں اب کبھی تیرے پاس نہیں آؤں گی''۔

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ پہلوان ہری سنگھ کو یوں لگا جیسے جسم سے دل نکل کر جا رہا ہو، اس نے ہاتھ اٹھا کر آواز دی۔

''اری سن تو کہاں جا رہی ہے غصے میں میرے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی پشپا واپس
جا!''

مگر وہ واپس نہیں آئی طنطناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ہری سنگھ نے جھنجھلا کر مٹھائی کی تھال کو ایک ٹھوکر ماری۔ مٹھائیاں اڑتی ہوئی دور تک پھیل گئیں اور تھال لڑھکتی ہوئی فرش پر بجنے لگی۔

☆======☆======☆

آدھی رات اِدھر تھی اور آدھی رات اُدھر، بیچ میں کہاسے کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس کہاسے کی دھند میں دور تک پھیلی ہوئی قبریں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ پونم جوگی مہاراج کے ساتھ قبرستان کی اونچی نیچی زمین پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی جا رہی تھی۔ عورتوں کا اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ آدھی رات کو قبرستان کے قریب سے بھی گزر سکیں لیکن عادل کی محبت اسے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ ایک قبر کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ ذرا دور اس قبر کے پاس کوئی نظر آ رہا تھا کہاسے کی دھند میں پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ جوگی نے آہستہ سے کہا۔

''آگے بڑھو، وہاں تمہارا عادل کھڑا ہوا ہے۔ میں راج محل میں واپس جا رہا ہوں''۔

پونم نے اسے آواز دی۔ ''عادل!'' اس کی آواز سناٹے میں گونجنے لگی، جواب میں اسے عادل کی آواز سنائی دی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا پونم کا نام بھی سناٹے کو چیرتا ہوا اِدھر اُدھر پھیلنے لگا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی عادل نے دونوں بازو پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ پونم اس کے سینے سے لگتے ہی ننھی سی بچی کی طرح رونے لگی۔ عادل اسے تھپکتا رہا اور تسلیاں دیتا رہا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''اب کیوں روتی ہو میں تو تمہارے پاس آ گیا ہوں۔'' اس کی آواز محبت سے لرزاں اور سرشار تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے عادل! کتنے خوبصورت باغیچے میں ہمارے پیار کی ابتداء ہوئی تھی اور کس قبرستان کے سناٹے میں آ کر ہم مل رہے ہیں؟ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں ہمیں کیوں لایا گیا ہے؟''

عادل نے اس قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے باپ کی قبر ہے تم راجکماری شکنتلا کی بیٹی ہو۔ راج محل کے جس خزانے کی تم وارث ہو، وہ خزانہ اس قبر میں تمہارے باپ مکرم علی کے ساتھ دفن کیا گیا ہے۔ جوگندر پال اس خزانے کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اس خزانے

کو ہم دونوں ہی اس قبر سے نکال سکتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے ہم دونوں کو یہاں بھیجا گیا ہے''۔

''عادل مجھے خزانہ نہیں چاہئے تم مل گئے ہو تو مجھے ساری دنیا مل گئی ہے چلو ہم یہاں سے بھاگ کر چلے جائیں''۔

''نہیں پونم یہاں سے بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ جوگندر پال چاہتا ہے کہ میں کسی شخص کو قتل کر کے اس کے خون سے اس قبر کی آگ بجھاؤں، وہ یہاں کہیں چھپا ہوا ہوگا اور ہماری تمام حرکتوں کو دیکھ رہا ہوگا ہوسکتا ہے کہ ہمیں گھیرنے کے لئے اس نے چاروں طرف سے پہرہ لگا رکھا ہو۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تو وہ تمہیں میرے حوالے کر دے گا اسی لئے میں تمہاری خاطر کسی کو بھی قتل کرسکتا ہوں''۔

''یہ کیسی محبت ہے کہ کسی کا خون بہانے کے بعد ہمیں حاصل ہوگی؟''

''پیٹ کی بھوک اور دل کی پیاس بجھانے کے لئے انسان ہر کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں مجبور ہوں''۔

قبرستان کے سناٹے میں کسی کی بھاری بھرکم آواز گونجنے لگی۔

''ہاں میں بھی مجبور ہوں۔ تمہارا خون بہا کر ہی اپنی محبت کو حاصل کرسکتا ہوں''۔

عادل اور پونم نے آواز کی سمت دیکھا۔ قبر کی دوسری سمت ہری سنگھ ہاتھ میں خنجر لئے کھڑا تھا۔ عادل نے پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں لیکن اس وقت تمہاری موت بن کر آیا ہوں''۔

عادل نے کہا۔ ''ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے ہیں اور ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں ہیں پھر تم خنجر لے کر کیوں آئے ہو۔ تم جو کوئی بھی ہو میں تمہیں صاف صاف بتادوں کہ جوگندر پال نے تمہیں اپنا آلۂ کار بنا کر صرف اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں، شاید اسے کسی جوتشی یا پنڈت نے بتایا ہے کہ اگر اس قبر پر تمہارے خون کے چھینٹے دیئے جائیں گے تو خزانہ آسانی سے برآمد ہو جائے گا۔ جوگندر پال نے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں تمہیں قتل کر دوں تو وہ انعام کے طور پر پونم کو میرے حوالے کرے گا اور خزانے کا ایک بڑا حصہ بھی دے گا''۔

ہری سنگھ نے کہا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ جوگندر پال نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر

میں تمہیں قتل کر دوں تو انعام کے طور پر مجھے پشپا بھی ملے گی اور خزانہ بھی ملے گا''۔

عادل نے کہا۔ ''اگر جوگندر پال نے تم سے بھی یہی کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہم دونوں کو بیوقوف بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہا ہے جو لالچ تمہیں دیا ہے وہی لالچ اس نے مجھے بھی دیا ہے''۔

ہری سنگھ نے کہا۔ ''ہاں! اس نے مجھ سے بھی یہی کہا کہ مسلمان کی اس قبر پر کسی ایسے مسلمان کا خون ٹپکایا جائے جو اسی راج محل کی ایک لڑکی سے محبت کرتا ہو تو اس کے خون سے اس قبر کی آگ بجھ جائے گی''۔

''میری رگوں میں مسلمان کا خون ہے تمہاری رگوں میں ہندو کا خون ہے اگر انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو خون نہ تو ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان، نفرتوں کا بیج بونے کے لئے خون کی تفریق کی جاتی ہے۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن کوئی تیسرا ہم سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہم دونوں میں سے ہمارے ہی ہاتھوں کسی کا خون اچھالنا چاہتا ہے کیا یہ مناسب ہے کہ ہم کسی تیسرے شخص کی چال میں آجائیں؟''

پونم نے بھی آگے بڑھ کر کہا۔

''ہری سنگھ اگر تیرے ہاتھوں عادل کو کوئی نقصان پہنچا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔ رو رو کر اپنی جان دے دوں گی۔ تو ہماری محبت کا دشمن کیوں بن گیا ہے؟''

ہری سنگھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا

''پشپا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ عادل کے ہاتھوں مجھے نقصان پہنچا تو وہ رو رو کر جان دے دے گی۔ عورت کی محبت ہمیں کمزور بنا دیتی ہے۔ مگر یہ کمزوری بڑی خوبصورت ہوتی ہے''۔

پھر اس نے اپنا خنجر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''آؤ آج میں اپنی طاقت سے نہیں لڑوں گا۔ اپنی پشپا رانی کی دی ہوئی کمزوری کے سہارے تم سے مقابلہ کروں گا''۔

عادل نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکال کر اسے بھی ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''میں بھی تجھے قتل کرنے کے لئے چاقو لے کر آیا تھا لیکن اب میں بھی پونم کی دی ہوئی کمزوری کے سہارے تیرا مقابلہ کروں گا''۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی وہ دونوں آگے بڑھے اور وہ پہاڑوں کی طرح آپس میں

ٹکرا گئے۔ دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں اور دونوں اپنی پوری قوت سے زور لگا رہے تھے۔ ہری سنگھ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں نے بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑا ہے۔ آج تک کسی سے شکست نہیں کھائی''۔

عادل نے زور لگاتے ہوئے کہا۔

''زندگی سب سے زیادہ شہ زور پہلوان ہے۔ میں اب تک اسے پچھاڑتا آیا ہوں''۔

ہری سنگھ نے کہا تو بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ اگر اچھی باتیں کرنے والے اور خلوصِ دل سے محبت کرنے والے اس دنیا سے اٹھ جائیں تو پھر ہماری اس دنیا میں کیا رہ جائے گا۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں اس دنیا کی خوبصورتی کو قتل کرتے ہیں''۔

''ہاں۔ پونم کے حسن اور پشپا کی وفا کا نام دنیا ہے۔ ہم دنیا کی اس خوبصورتی کو مجروح نہیں کریں گے۔ بول تیرا کیا ارادہ ہے؟''

''ارادہ کیا ہوگا اب تک تو یہی ہوتا آیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کا خون بہایا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی بستیاں اجاڑی ہیں۔ آج ہم دونوں مل کر اس اجڑی ہوئی دنیا کو بسائیں گے۔ جوگندر پال، جے راج اور وہ جوگی اسی قبرستان میں کہیں دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا انہیں مرنا چاہئے جو دوسروں کو لڑا کر خون ریزی کا تماشہ دیکھتے ہیں میں اسی لئے تم سے پنجے لڑا رہا ہوں کہ ہماری لڑائی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا تو وہ بیزار ہو کر ہمیں جوش دلانے کے لئے قریب آئیں گے۔ اس لئے ان کے قریب آنے کا انتظار کرو اور اس وقت تک لڑتے رہو یہ لو میرا ایک داؤ سنبھالو''۔

یہ کہتے ہی اس نے تیزی سے پلٹ کر عادل کو پیٹھ پر لادتے ہوئے اور اپنے کندھے پر سے اچھالتے ہوئے دھوبی پاٹ مارا۔ عادل دھپ کی آواز کے ساتھ زمین پر چاروں شانے چت ہوگیا۔ اس نے زمین پر گرتے ہی کہا۔

''لو ہری سنگھ اب میرا داؤ سنبھالو''۔

ہری سنگھ نے سمجھا تھا کہ عادل باقاعدہ زمین پر سے اٹھے گا اور پہلوانوں کی طرح مقابلے پر آ کر پینترا بدلتے ہوئے اپنا داؤ آزمائے گا لیکن اس نے لیٹے لیٹے الٹی قلابازی کھائی۔ اس کی دونوں ٹانگیں فضا میں بلند ہوئیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہری سنگھ کی گردن

کے اطراف وہ ٹانگیں قینچی بن گئیں۔ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا۔ عادل کی طرح زمین پر گر پڑا۔ اس کی گردن اب تک ٹانگوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کے لئے تڑپ رہا تھا پھر اس نے لیٹے لیٹے عادل کے منہ پر ٹھوکر مادی۔ عادل نے اس ٹھوکر کو ہاتھوں سے روک لیا لیکن گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ہری سنگھ تڑپ کر نکل گیا اور لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا پھر وہ دونوں ہی اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور ایک بار پھر مقابلے کے لئے ڈٹ گئے ہری سنگھ نے دوبارہ اس سے پنجے لڑاتے ہوئے کہا۔

''ماں قسم بڑا پھرتیلا ہے تیرے ساتھ لڑنے میں مزہ آ رہا ہے''۔

عادل اسے کوئی جواب نہ دے سکا اسی وقت قریب ہی جوگندر پال کی آواز سنائی دی۔

''تم لوگوں نے اپنے چاقو کیوں پھینک دیئے نہتے کیوں لڑ رہے ہو''۔

جے راج نے کہا ''ہری سنگھ اپنا خنجر اٹھاؤ!''

جوگندر پال نے کہا۔ ''عادل اپنا چاقو سنبھالو!''

دونوں نے حکم کے مطابق خنجر اور چاقو اٹھا لئے۔ ہری سنگھ جے راج کے قریب آ گیا اور عادل جوگندر پال کی طرف چلا گیا۔ ہری سنگھ نے کہا۔

''میں عادل کا دوست بن کر پشپا کو حاصل کر سکتا ہوں''۔

عادل نے کہا۔ ''میں ہری سنگھ کا بھائی بن کر پونم کو اپنا سکتا ہوں۔ مارنا تو انہیں چاہئے جو دو مذہب کو اور دو قوموں کو لڑاتے ہیں''۔

یہ کہتے ہی ایک کے ہاتھ میں خنجر بلند ہوا اور دوسرے کے ہاتھ میں چاقو کا پھل چمکنے لگا قبرستان کے سناٹے میں جوگندر پال اور جے راج کی آخری چیخیں بلند ہوئیں اور زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی موت کی پستی میں ڈوب گئیں۔ یہ تماشہ دیکھ کر جوگی مہاراج وہاں سے بھاگنے لگا۔ ہری سنگھ نے دوڑتے ہوئے اس کا پیچھا کیا اور دور جا کر ایک شکستہ قبر میں اسے بھی ہمیشہ کے لئے سلا دیا اسی وقت اسے پشپا کی آواز سنائی دی۔

''ہری سنگھ تو نے میری محبت کی لاج رکھ لی۔ میں تجھ پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے''۔

ہری سنگھ نے خون آلود خنجر ایک طرف پھینک دیا پھر اس نے آگے بڑھ کر پشپا کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے لئے ہوئے عادل کے پاس آ گیا اس نے پونم سے پوچھا۔

''راجکماری آپ کا کیا حکم ہے کیا اس قبر کو کھود کر خزانے کو نکالنا چاہئے؟''

عادل نے کہا۔ ''پونم تم اس خزانے کی حقدار ہو میں نے ایک عالم دین سے پوچھا ہے۔ان کے مشورے کے مطابق تم ہی اس قبر کو کھود کر اس خزانے کو حاصل کر سکتی ہو''۔

پونم نے عادل کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''عادل یہ میرے ابو کی قبر ہے۔ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں اتنی بدنصیب ہوں کہ کبھی باپ کی گود میں آنکھیں بند کر کے سونے کا ایک مختصر سا لمحہ بھی نہیں ملا اور وہ قبر کی گود میں گہری نیند سو رہے ہیں۔تم میرے جذبات کو سمجھو کہ میں کس طرح باپ کی قبر پر کدال چلاؤں گی۔ مجھے یوں محسوس ہوگا جیسے میں دولت کے لئے ابو کے سینے کو کدال سے زخمی کر رہی ہوں۔نہیں مجھے یہ دولت نہیں چاہئے میری دولت تو تم ہو۔چلو ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔ میں اس راج محل میں راجکماری بن کر رہوں گی تو دھرم کا مسئلہ آن کھڑا ہوگا۔اس لئے ہم ایسی جگہ چلے جائیں جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہ ہو''۔

پشپا نے آگے بڑھ کر کہا۔

''راجکماری آپ کے یہاں سے جانے کا ہمیں افسوس تو ہوگا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اپنے عادل کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے آپ کو اس راج محل سے جانا ہی ہوگا''۔

پونم نے اپنے باپ کی قبر پر لپٹ کر اسے آخری بار بوسہ دیا پھر عادل کا ہاتھ تھام کر ہری سنگھ اور پشپا کے ساتھ وہاں سے چلتی ہوئی بولی۔

''ہری سنگھ میرے ابو کی قبر کا خیال رکھنا۔ویسے اتنا تو مجھے یقین ہے کہ کوئی لالچی انسان اس قبر کو کھودنے کی جرأت نہیں کرے گا''۔

وہ باتیں کرتے ہوئے دور کہاسے کی دھند میں گم ہو گئے۔مکرم علی کی قبر تنہا تھی۔تنہا ہی رہ گئی۔شانتی نگر کے راج محل کے پیچھے سوگز کے فاصلے پر وہ قبر آج بھی موجود ہے۔اگر آپ کبھی وہاں جائیں تو اپنے ساتھ کدال لے کر ہرگز نہ جائیں

☆======☆======☆

کار جھاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ انسپکٹر حشمت اگلی سیٹ پر بیٹھا ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں سے پرے ایک سڑک تھی اور سڑک کے اس پار ڈاکٹر وقار احمد کی کوٹھی کی کھڑکیاں روشن نظر آ رہی تھیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے شکاری چھپتے ہیں، سراغرساں چھپتے ہیں۔ یا پھر عاشق حضرات دیدار کی حسرت میں آہیں بھرتے ہیں کہ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

حشمت کے نام کے ساتھ انسپکٹر کا عہدہ منسلک نہ ہوتا تو وہ عاشق ہی کہلاتا کیونکہ وہاں اس کی معشوق نے اُسے بلایا تھا۔ معشوق بھی ایسی تھی جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ قد میں چھوٹی اور جسامت میں موٹی تھی۔ ناک نقشہ اچھا ہی تھا۔ مگر صرف صورت سے کچھ نہیں بنتا۔ عورت اپنی اداؤں سے حسین بنتی ہے۔ اُس کے ہنسنے کی ادا ایسی تھی کہ منہ پھاڑ کر ہنستی تھی جیسے سامنے والے کو نگلنے سے پہلے قہقہہ لگا رہی ہو۔ یہ انسپکٹر حشمت کا حوصلہ تھا کہ اس کے سامنے کھڑا رہ جاتا تھا۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کامران نے کہا۔

''یار حشمت! مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم سنجیدگی سے اُس چڑیل کو چاہتے ہو۔''

''لینگویج پلیز۔ تم اُسے چڑیل کہہ کر میری محبت کی توہین کر رہے ہو۔''

''لعنت ہے ایسی محبت پر۔ وہ چار بچوں کی ماں ہے۔''

''وہ چار بچوں کی ماں تھی۔ اب تو نہیں ہے۔ بچے مر چکے ہیں۔''

''کاش کہ وہ خود مر جاتی۔'' کامران نے ناگواری سے کہا۔ ''اتنی سردی میں عشق کرنے آئے ہو۔ مجھے بھی پریشان کر رہے ہو۔''

''کامران! میرے پاس کار ہوتی تو میں تمہیں تکلیف نہ دیتا۔''

''لیکن کار میں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کا انتظار کرنا کیا ضروری ہے؟ وہ اس کوٹھی کی ایک معمولی ملازمہ ہے تم کار کے بغیر بھی رومانس کر سکتے ہو۔''

''دیکھو کامران! میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ میری محبت کی توہین نہ کرو۔ وہ کوٹھی کی ملازمہ ہے۔ مگر میرے دل کی ملکہ ہے۔ وہ دیکھو شاید وہ آ رہی ہے۔ خبردار! اس کی شان میں گستاخی نہ کرنا۔''

''اسے دیکھنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی آنکھیں پھوڑ لوں۔''

جب وہ جھاڑیوں کے پیچھے آئی تو کامران نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اسے ایک بار دیکھ چکا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں تھی۔ محبوبہ نے کار کے قریب آ کر کہا۔

''پیارے ہنس مت......''

حشمت نے کہا۔ ''میں نہیں ہنسوں گا۔''

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''یہ لو...... میں ہنسنے کو منع نہیں کر رہی ہوں۔ تم تو بڑے مذاقیہ ہو۔ ہائے تمہارا نام کتنا پیارا ہے۔ ہنس مت......''

حشمت نے کہا۔ ''کام کی بات کرو۔ آج کوٹھی میں کتنے لوگ آئے تھے؟''

''صبو کو دو جنے آئے تھے۔ ابھی ایک مستنڈا آیا ہے۔ اپنی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا ڈاکٹر صاحب بیچتا کیا ہے۔ بس لاکھوں روپے کی بات کرتا رہتا ہے۔''

وہ کوٹھی کے مالک وقار احمد کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔

''مجھے بتاؤ کہ ڈاکٹر آنے والوں سے کیا باتیں کرتا ہے؟''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بیزار ہو کر بولی۔

''اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب کسی بیڈروم کا سودا کرتا ہے۔''

''بیڈروم کا سودا؟ یعنی تم کیا کہنا چاہتی ہو کہ وہ اپنی خواہ گاہ فروخت کر رہا ہے؟''

''ہاں۔ مگر یہ پتہ نہیں کہ وہ کھواب گاہ اس کی ہے یا کسی اور کی اُس کی قیمت بائیس لاکھ روپے ہے۔ یہ جو مستنڈا آیا ہے وہ بائیس لاکھ دینے کو تیار ہے۔''

حشمت اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے ڈاکٹر وقار احمد کی کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک بدنام ڈاکٹر تھا۔ پولیس کے ریکارڈ میں اسمگلر کی حیثیت تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اُس کی انگریز بیوی السر کے مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی لارا کا خود علاج کیا۔ پھر ناکام ہو کر اُسے امریکہ لے گیا۔ السر قابلِ علاج مرض ہے لیکن جس کی موت آتی ہے، وہ امریکہ کے ہسپتالوں میں بھی جا کر مر جاتا ہے۔ بے چاری لارا مر کر ہی واپس آئی۔

انٹیلی جنس والے ڈاکٹر پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ کیونکہ جب بھی وہ ملک سے باہر جاتا تھا۔ واپسی میں پہلے سے زیادہ دولت مند ہو جاتا تھا۔ پہلے اُس کی ایک معمولی سی ڈسپنسری تھی۔ دس سال پہلے وہ امریکہ گیا تو واپسی میں ایک کار لے کر آیا۔ ڈسپنسری فروخت کر دی اور دو بیڈروم کا بنگلہ خرید لیا۔ چار سال بعد پھر ملک سے باہر جا کر واپس آیا تو گلبرگ میں پانچ لاکھ کی کوٹھی خرید لی۔ آخری بار وہ لارا کا علاج کرانے امریکہ گیا تو انسپکٹر حشمت نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی ملازمہ زلیخا سے عشق شروع کر دیا تھا۔ زلیخا تین شوہروں سے فارغ ہو چکی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں حشمت کو عاشق ہوتے دیکھ کر پھر سے جوان ہو گئی۔ حشمت نے کہا۔

''تم میرے کام آؤ گی تو اپنی ترقی ہوتے ہی تم سے شادی کر لوں گا۔''

وہ فوراً ہی گلے کا ہار بن کر بولی۔ ''میں تمہارا کام کروں گی پیار سے......''

حشمت اپنی گردن چھڑاتے ہوئے بولا۔

''شادی سے پہلے گلے لگنا گناہ ہے۔ اب کام کی بات سنو۔ جب تمہارا ڈاکٹر صاحب واپس آئے گا تو تم خیال رکھنا کہ کتنے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں اور کیا باتیں کرتے ہیں۔''

وہ جاسوس کی بیوی بننے کے لئے جاسوسہ بن گئی تھی۔ اب جھاڑیوں کے پیچھے آ کر اسے رپورٹ سنا رہی تھی اور حشمت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کس خواب گاہ کا سودا ہو رہا ہے؟ کیا سمگلنگ کا مال ڈاکٹر نے اپنی خواب گاہ میں چھپا رکھا ہے؟ محتاط رہنے والے مجرم سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بائیس لاکھ روپے کا مال وہ اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ زلیخا نے کہا۔

''پیارے ہنس مت! کوٹھی کو کیا دیکھ رہے ہو؟ میرے کو دیکھو نا۔''

کامران نے آنکھیں کھول کر کہا۔

''خدا کے لئے میرے دوست کا نام نہ لو۔ میرے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ اسے صرف پیارے کہہ کر جواب دو۔''

حشمت نے کہا۔ ''وہ دیکھو کوٹھی کے دروازے سے کوئی نکل رہا ہے۔ زلیخا تم فوراً یہاں سے جاؤ۔ ورنہ ڈاکٹر کو تم پر شبہ ہوگا۔''

زلیخا کو مجبوراً جانا پڑا۔ کوٹھی سے نکلنے والا ایک کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو رہا

تھا۔ حشمت نے کہا۔

''کامران! اس آدمی کا پیچھا کرنا ہے۔ آگے جا کر ہم اُس کا راستہ روکیں گے۔''

''میں سمجھ گیا۔ تم اس لئے مجھے کار کے ساتھ یہاں لائے ہو۔ اب تک اپنے عشق کی داستان سنا کر مجھے احمق بنا رہے تھے۔''

حشمت نے جواب نہیں دیا۔ کوٹھی کے احاطہ سے نکلنے والی کار سڑک پر پہنچ کر دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ کامران نے اپنی گاڑی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکالی۔ پھر تعاقب شروع ہو گیا۔ دو چار موڑ کے بعد آگے والے کو احساس ہو گیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اُس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ کامران کو ڈرائیونگ میں مہارت حاصل تھی۔ وہ پانچ منٹ میں ہی اُسے اوور ٹیک کرنے لگا۔ دونوں کاریں سڑک پر برابر دوڑ رہی تھیں۔ حشمت نے اُس سے کہا۔

''گاڑی روکو۔ میں انسپکٹر حشمت بول رہا ہوں۔''

اس کی بات پوری ہوتے ہی گاڑی کو زور کی ٹکر لگی۔ کامران کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح گاڑی سے گاڑی ٹکرا کر آگے نکل جائے گا۔ اسے سنبھلنے کے لئے بریک لگانے پڑے۔ اتنی دیر میں وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ کامران نے پھر گاڑی کی رفتار تیز کی۔ جب وہ آگے والی کار کے قریب پہنچنے لگے تو حشمت نے ریوالور نکال کر فائر کیا۔ تیسرے فائر میں اگلی کار کا پچھلا پہیہ ایک زوردار دھماکے سے برسٹ ہوا۔ کار گھسٹتی ہوئی سڑک کے کنارے ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ کامران تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ لہٰذا کار روکتے روکتے وہ سو گز آگے چلے گئے۔ کار سے اتر کر دونوں دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ ٹکرانے والی کار کا اگلا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کار ڈرائیو کرنے والا زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔

حشمت نے قریب آ کر دیکھا۔ کار کے حادثہ میں وہ بری طرح ڈیش بورڈ سے ٹکرایا تھا۔ حشمت نے اسے سیدھا کیا تو اس کے کھلے ہوئے منہ سے لہو ابل رہا تھا۔ سر کے نیچے ایک چابی تھی۔ چابی ایک ننھی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور اُس زنجیر کے سرے پر چھوٹا سا چرمی ''فلیگ'' تھا۔ اُس فلیگ پر ستر (70) کا ہندسہ درج تھا۔ حشمت نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ تم نے کار کیوں نہیں روکی؟ ایک مجرم کی طرح کیوں فرار ہو رہے تھے؟''

اُس نے آنکھیں پھاڑ کر حشمت کو دیکھا۔ ایک آخری ہچکی لی۔ پھر اُس کا سر ڈھلک

گیا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر وقار احمد اپنی خوابگاہ میں بیٹھا اپنی آنجہانی شریکِ حیات لارا کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ تصویر میں لارا مسکرا رہی تھی لیکن ڈاکٹر رو رہا تھا۔ اُسے مرنے والی کی باتیں اور ادائیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔

''جب اپنے چاہنے والے زندہ ہوں تو اُن کی مسکراتی ہوئی تصویر نہیں اتارنی چاہئے۔ مرنے کے بعد اُن کی یہی مسکراہٹ ہمیں رلاتی ہے۔''

بڑبڑاہٹ کے دوران کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ لارا کی تصویر کو مینٹل پیس پر رکھ کر کوٹھی کے بیرونی دروازے پر آیا اور پھر اسے کھولتے ہی پولیس والوں کو دیکھ کر چونک پڑا۔ حشمت نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ رات ایک بجے زحمت دے رہا ہوں۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

پھر وہ اجازت ملنے سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اُس کے ساتھ چار مسلح سپاہی تھے۔ اس نے کہا۔

''ڈاکٹر! ابھی رات کے آٹھ بجے ایک شخص آپ سے ملنے آیا تھا۔ اُس کی کار کا نمبر کے سی ون فور نائن ٹو نائن ہے۔ میں کار کے نمبر سے اُس کا نام اور پتہ معلوم کر سکتا ہوں۔ بہتر ہے کہ آپ ہی بتا دیں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس کا نام احمد پاشا ہے۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض ہے اور میرے پاس علاج کے لئے آیا تھا۔''

''اچھا تو آپ علاج کی فیس بائیس لاکھ روپے لیتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے چونک کر اسے دیکھا۔ حشمت نے جیب سے ایک چمڑے کا بٹوا نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ احمد پاشا کی کار کے ڈیش بورڈ والے خانہ میں تھا۔ اس بٹوے میں بیش قیمت ہیرے ہیں۔ ان کی مالیت ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جب کہ میری اطلاع کے مطابق آپ بائیس لاکھ میں سودا کر رہے تھے۔ آپ نے وہ باقی ہیرے کہاں چھپا رکھے ہیں۔''

ڈاکٹر گفتگو کے آغاز میں ذرا پریشان رہا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیا آپ مجھے ڈاکٹر کی بجائے ہیروں کا سوداگر سمجھتے ہیں؟''

''ہاں۔ احمد پاشا نے یہی بیان دیا ہے۔''

ڈاکٹر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''اچھا کیا بیان دیا ہے۔ ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو کہ میں کیا ہوں؟''

''اس نے بتایا ہے کہ باقی ہیرے خواب گاہ میں چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ یہ دیکھئے میں تلاشی کا وارنٹ لے کر آیا ہوں۔''

''بہت خوب...... میں وارنٹ پڑھے بغیر اجازت دیتا ہوں کہ آپ تلاشی شروع کر دیں۔ آیئے میں آپ کو بتاؤں۔ یہاں ایک میری خوابگاہ ہے دوسری خوابگاہ لارا کی تھی۔''

ایسا کہتے وقت اُس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آنسو بھرے لہجے میں بولا۔

''وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی۔ تب سے میں نے اُس کی خوابگاہ کو مقفل کر دیا ہے۔ اسے کبھی نہیں کھولتا۔ کیونکہ وہاں کی ایک ایک چیز دیکھ کر اس کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آتا ہے۔''

''یقیناً یاد آتا ہوگا۔'' حشمت نے کہا۔ ''میں پہلے لارا کی خوابگاہ کھولنے کے لئے کہوں گا۔''

ڈاکٹر نے ذرا سی پس و پیش کے بعد لارا کی خوابگاہ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ چاروں سپاہی بیڈ روم کے ایک ایک گوشہ کی تلاشی لینے لگے۔ انہوں نے قالین ہٹا کر دیکھا۔ دیواروں کو ٹھونک بجا کر کسی خفیہ خانہ کا پتہ لگانا چاہا۔ جب وہ وہاں کی کسی چیز کو اٹھا کر بے دردی سے دوسری جگہ رکھتے یا پھینکتے تو ڈاکٹر کے منہ سے آہ نکل جاتی۔ وہ تڑپ کر بولتا۔

''ذرا آہستہ رکھو۔ یہ میری لارا کی یادگار ہے۔ میرا دل دکھتا ہے۔''

ڈاکٹر کی آنکھوں میں سچے آنسو تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجرم تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں تھا کہ لارا کے لئے اس کی محبت میں سچائی تھی۔ وہ سچ مچ اس کی ابدی جدائی کا صدمہ اٹھا رہا تھا۔ حشمت نے صبح چار بجے تک پوری کوٹھی کی تلاشی لی۔ مگر ایک ہیرا تو کیا کانچ کا ایک ٹکڑا بھی ہاتھ نہ آیا۔

حشمت نے تھک ہار کر جیب سے وہ چابی نکالی جو ایک ننھی سی زنجیر سے بندھی ہوئی

تھی۔زنجیر کے آخری سرے سے ایک چرمی فلیگ منسلک تھا اور فلیگ پر ستر (70) کا ہندسہ نظر آرہا تھا۔اُس نے کہا۔

''ڈاکٹر! یہ کی چین کس کی ملکیت ہے؟ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ یہ احمد پاشا کی کار کی چابی ہے لیکن اس کی کار کے اگنیشن میں پہلے سے ایک چابی موجود تھی۔کیا یہ کسی بریف کیس کی چابی ہوسکتی ہے؟''

''انسپکٹر! تعجب ہے کہ آپ احمد پاشا کا بیان لینے کے بعد مجھ سے یہ سوال کررہے ہیں۔اگر یہ کی چین احمد پاشا کے پاس سے برآمد ہوئی ہے تو وہی آپ کے سوال کا صحیح جواب دے گا۔''

حشمت نے کہا۔''میں نے جھوٹ کہا تھا کہ احمد پاشا نے کوئی بیان دیا ہے۔وہ بیان دینے سے پہلے ہی کار کے حادثہ میں ہلاک ہوگیا۔''

اتنا سنتے ہی ڈاکٹر نے پہلے چونک کر اسے دیکھا۔پھر بے اختیار قہقہہ لگانے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ لارا کا غم بھول گیا۔دیوانہ وار ہنستا رہا اُس کے دل و دماغ سے بہت بڑی پریشانی دور ہوگئی۔جیسے احمد پاشا کی موت کے ساتھ جرم کے سارے ثبوت مرگئے ہوں۔حشمت نے جھلا کر پوچھا۔

''یہ آپ کس خوشی میں قہقہے لگارہے ہیں؟''

وہ اچانک ہی چپ ہوگیا۔اچانک ہی اُس کے تیور بدل گئے۔اُس نے غصے سے کہا۔

''آپ نے مجھے ساری رات جگا کر رکھا۔کسی ثبوت کے بغیر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ ایک معزز ڈاکٹر کو پریشان کریں۔کس اُلّو کے پٹھے نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ میں ہیروں کا سودا کرتا ہوں اور مال کسی خوابگاہ میں چھپا کر رکھتا ہوں۔اب تو خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑیئے۔صبح ہوچکی ہے۔اب تو مجھے سونے دیجئے۔''

حشمت دل ہی دل میں نادم تھا کہ جاہل ملازمہ کی الٹی سیدھی باتیں سن کر وہ تلاشی لینے چلا آیا۔اُسے ذرا صبر و تحمل سے چپ چاپ تفتیش کرنی چاہئے تھی۔وہ ہار پچھتا کر کوٹھی سے باہر آیا۔پولیس کی جیپ میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن کوٹھی سے ذرا دور زلیخا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔جیپ کو روکنا پڑا۔حشمت نے غصے سے کہا۔

''ہٹ جاؤ راستے سے۔تمہاری باتوں میں آکر میں نے بہت بڑی حماقت کی

ہے۔''

وہ قریب آکر بولی۔''غُصّا کیوں کرتے ہو۔میں ایک بات کہنا بھول گئی تھی۔''

''خدا کرے تم سب کچھ بھول جاؤ۔مجھے بھی بھول جاؤ۔میرا پیچھا چھوڑو۔''

وہ سپاہی سے کہنا چاہتا تھا کہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔اسی وقت زلیخا نے کہا۔

''پیارے ہنس مت! میں ایک نمبر بھول گئی تو تم ناراض ہوگئے۔''

حشمت نے چونک کر پوچھا''کون سا نمبر؟''

''ستر۔''وہ بولی۔''اس کا نمبر ستر ہے۔''

''ارے کس کا نمبر ستر ہے؟''وہ جیب سے چین نکال کر دیکھنے لگا۔

''وہ جو کھواب گاہ ہے اُس کا نمبر ستر ہے۔ڈاکٹر اس مستنڈے سے بول رہا تھا۔ میں دروازے کے پیچھے سے سن رہی تھی۔میرے کو اب اچھے سے یاد آگیا ہے۔وہ کھواب گاہ کا نمبر بتا رہا تھا۔''

کی چین کی فلیگ پر 70 کا ہندسہ تھا۔حشمت گہری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ گھروں میں خواب گاہوں کے نمبر نہیں ہوتے۔ہوٹلوں اور عیاشی کے اڈوں میں جو الگ الگ کمرے ہوتے ہیں۔انہیں خوابگاہ بھی کہا جا سکتا ہے۔کیونکہ عیاش طبع لوگ صرف راتیں گزارنے وہاں جاتے ہیں۔اسے ایسے ہی مقامات سے تفتیش شروع کرنی چاہئے۔

☆======☆======☆

وہ پورے دو ہفتے تک خوابگاہ نمبر ستر کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ اس نے تمام ہوٹلوں کے ان کمروں کی تلاشی لی جن کے نمبر ستر تھے۔ وہ کی کلب میں بھی گیا جہاں اونچے طبقہ کی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ آتی تھیں۔ وہاں کمروں کی چابیوں کے ذریعہ آنکھ مچولی ہوتی تھی۔ پہلے عورتیں اوپری منزل کے ایک ایک کمرے میں چھپ جاتی تھیں۔ پھر تمام مرد کاؤنٹر پر آ کر ایک ایک کمرے کی چابی اٹھا لیتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی بیویاں کس نمبر کے کمرے میں ہیں۔ وہ جس نمبر کے کمرے میں پہنچ جاتے اس کمرے کی عورت ایک رات کی خوابگاہ میں ان کے ساتھ رات گزار لیتی۔

جس وقت کاؤنٹر پر چابیاں تقسیم ہو رہی تھیں، اسی وقت حشمت وہاں پہنچ گیا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئے کیونکہ وہ غیر قانونی کلب تھا۔ یوں بھی زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ بڑے بڑے افسران اور بڑے بڑے دولتمندوں کی سرپرستی میں وہاں گناہ کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ وہاں حشمت جیسے پولیس انسپکٹر کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ جب وہ خواب گاہ نمبر 70 کی چابی اٹھا کر اوپری منزل کی طرف چلا تو دولتمند شرفاء ریسیور اٹھا کر اپنے سرپرست افسران کو شکایتی کال کرنے لگے۔

حشمت کی جیب میں جو ''کی چین'' رکھی ہوئی تھی، وہ کی کلب کی چابی سے مختلف تھی۔ اُس نے کلب کی چابی سے خواب گاہ نمبر ستر کا دروازہ کھولا۔ اندر ایک حسین اور جوان عورت بیٹھی وہسکی کے دو پیگ بنا رہی تھی۔ وہ حشمت کو دیکھ کر شرمانے لگی۔ حشمت نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ڈاکٹر وقار احمد سے تمہارا کیا تعلق ہے۔''

وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر پریشان ہو کر بولی۔

''تم کلب کے اصولوں کے خلاف سوال کر رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں کوئی کسی کا نام اور ولدیت نہیں پوچھتا۔ یہاں ہم صرف پارٹنر بدلنے آتے ہیں۔''

''میں ایک پولیس انسپکٹر ہوں۔ تمہارا پارٹنر بننے نہیں، کچھ پوچھنے آیا ہوں۔''

وہ سہم کر بیٹھ گئی۔ پھر ہکلاتی ہوئی بولی۔

''مم۔ مجھے تو بتایا گیا تھا کہ یہاں کوئی پولیس والا نہیں آئے گا۔ یہاں ہماری عزت پر حرف نہیں آئے گا۔''

''ہاں تم لوگوں کی بے عزتی اپنے پردوں میں چھپ کر ہوتی ہے کہ یہاں سے گزر کر بھی باہر باعزت خواتین کہلاتی ہو۔ میں تم پر کیچڑ اچھالنے نہیں آیا ہوں۔ میرے سوالوں کا جواب دو۔ میں چپ چاپ واپس چلا جاؤں گا۔''

ایسا کہتے ہوئے وہ اُس خوابگاہ کی تلاشی لینے لگا۔ اُس عورت نے کہا۔ ''ڈاکٹر وقار میرا سوتیلا باپ ہے۔ میں لارا وقار کی بیٹی میرلن ہوں۔''

حشمت نے اسے چونک کر دیکھا۔ پھر سوال کیا۔

''کیا کمرہ نمبر ستر میں تمہارا باپ تمہیں بھیجتا ہے؟''

''ایسی بات نہ کہو۔ وہ سوتیلا سہی۔ مگر بے غیرت نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کلب سے میرا تعلق ہے۔ یہاں میں دوسری بار اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوں۔''

حشمت نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم اتفاقاً ستر نمبر کے کمرے میں آئی ہو اور میں بھی اتفاقاً اسی نمبر کے کمرے کی تلاشی لینے آیا ہوں؟''

''ہاں یقین کرو۔ ایک ہفتہ پہلے میں اٹھارہ نمبر کے کمرے میں گئی تھی۔ آج اس کمرے میں آئی ہوں۔ فار گاڈ سیک میری عزت رکھ لو۔''

''میں اس شرط پر خاموشی سے چلا جاؤں گا کہ تم سچ کہو گی۔ بتاؤ کیا ڈاکٹر ہیروں کا اسمگلر نہیں ہے؟''

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اپنے سوتیلے باپ کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ میری ماں نے اُس مسلمان سے شادی کی۔ اس لئے میں نے ماں سے بھی رشتہ توڑ دیا۔ چار برسوں سے میں نے اُس کی صورت نہیں دیکھی۔ اُس کی موت کے بعد آخری بار میں نے اس کی صورت دیکھی۔ اب تو مجھے ڈاکٹر کو سوتیلا باپ نہیں کہنا چاہئے۔ میری ماں مر چکی ہے۔ اب اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرلن نے ریسیور اٹھا کر سنا۔ پھر ریسیور کو حشمت کی طرف بڑھایا۔ دوسری طرف سے اس کا ایک افسر اسے حکم دے رہا تھا کہ

وہ فوراً ہی کلب سے باہر چلا جائے اور شریف لوگوں کو پریشان نہ کرے۔ اُس نے عاجزی سے کہا۔

سر! میں ڈاکٹر وقار احمد کے کیس کے سلسلہ میں یہاں آیا ہوں۔ یہاں بھی ایک خوابگاہ نمبر ستر ہے۔ مجھے کامیابی کی توقع ہے۔ کیونکہ اس کمرے میں ڈاکٹر کی سوتیلی بیٹی میرلن موجود ہے۔''

''یوفول! وہاں کوئی بھی ہو فوراً نکل جاؤ۔ ورنہ ہماری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔''

اُسے ڈانٹ سن کر کلب سے باہر نکلنا پڑا۔ ویسے اس نے خوابگاہ کی تلاشی لی تھی اور اطمینان ہو گیا تھا کہ باقی ہیرے وہاں چھپا کر نہیں رکھے گئے ہیں۔ عقل بھی یہی سمجھاتی تھی کہ قیمتی ہیرے ایسی جگہ چھپا کر نہیں رکھے جا سکتے، جہاں مرد اور عورت پارٹنر بدلتے ہوں۔

دوسرے دن وہ ڈاکٹر وقار احمد کی کوٹھی میں پہنچا تو زلیخا دوڑتی ہوئی آ کر اُس کے گلے لگ گئی۔

''پیارے ہنس مت! مجھے بچاؤ۔ یہ ڈاکٹر مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے۔''

ڈاکٹر اس کے پیچھے دوڑتا آ رہا تھا۔ اپنی ملازمہ کو انسپکٹر کے گلے لگتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ حشمت نے غصہ سے پوچھا۔

''کیا بات ہے۔ آپ اسے مار ڈالنا چاہتے ہیں؟''

ڈاکٹر نے کہا۔''میں اسے سزا دینا چاہتا ہوں۔ یہ چھپ کر میری باتیں سنتی رہتی ہے ابھی میں فون پر باتیں کر رہا تھا۔ یہ پردے کے پیچھے کھڑی سن رہی تھی۔''

زلیخا نے کہا۔''ہاں سن رہی تھی۔ تم وہی کھواب گاہ نمبر ستر کی بات کر رہے تھے۔ فون کے اندر بول رہے تھے کہ انسپکٹر کو تھک کر بیٹھ جانے دو۔ پھر کھواب گاہ کا سودا ہوگا۔''

''تم جھوٹی ہو۔'' ڈاکٹر نے چیخ کر کہا۔''نکل جاؤ میرے گھر سے..........''

انسپکٹر نے زلیخا کے شانہ کو تھپک کر کہا۔

''تم ابھی یہاں سے جاؤ۔ نوکری کی پرواہ نہ کرو۔ میں زنانہ پولیس کے شعبہ میں تمہارے لئے سفارش کروں گا۔ کل میرے دفتر میں آنا۔ ابھی جاؤ۔''

وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد حشمت نے پوچھا۔

''آپ کی سوتیلی بیٹی کا نام میرلن ہے؟''

''میرلن؟'' ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔''کیا آپ میرلن کو جانتے ہیں؟ مجھے اُس کا پتہ بتائیے۔ مجھے ایک قرض ادا کرنا ہے۔''

''کیسا قرض؟''

میری بیوی لارا نے مرنے سے پہلے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس کی جائیداد میرلن کے حوالے کر دوں۔ میرلن اپنی ممی کا آخری دیدار کرنے آئی تھی۔ پھر مجھ سے کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ میں نے اسے تلاش کیا تو پتہ چلا کہ دو برس پہلے اس نے کسی سے شادی کر لی ہے اور پرانا مکان چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس کا پتہ بتائیے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔''

''آپ مجھے خوابگاہ نمبر ستر کا راستہ بتا دیں۔ میں آپ کو میرلن تک پہنچا دوں گا۔''

وہ دانت پیستے ہوئے حشمت کو گھورنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔

''آپ ایک ذہین آفیسر ہیں۔ آپ کو ایک جاہل ملازمہ کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے۔ کوئی بھی صاحب عقل یقین نہیں کرے گا کہ خواب گاہ کے بھی نمبر ہوتے ہیں۔''

''نمبری بدمعاش ہر خفیہ چیز کے نمبر مقرر کر لیتے ہیں۔ چیز کا نام نہیں لیتے، اس کے نمبر سے سودا طے کرتے ہیں۔''

''کیا آپ مجھے نمبری بدمعاش کہہ رہے ہیں۔ آپ ہوش میں تو ہیں؟''

''ابھی تو ہوش میں ہوں۔ اگر جلد ہی اس خواب گاہ کا پتہ نہ چلا تو میں پاگل بن کر تمہاری پٹائی شروع کر دوں گا۔''

وہ ڈاکٹر کو دھمکی دے کر وہاں سے چلا آیا۔ ایک ہفتہ بعد اُسے فون پر اطلاع ملی کہ کامران بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کے بیڈ کا نمبر ستر ہے۔ وہ عیادت کے لئے ہسپتال پہنچا۔ دوست کی خیریت دریافت کی۔ اُس نے کہا۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مجھے السر کی بیماری ہے۔ اگر باقاعدہ علاج نہ ہوا اور اگر مرض بڑھتا گیا تو میرے پیٹ کا آپریشن کیا جائے گا۔''

کامران کی باتیں سن کر حشمت کی کھوپڑی روشن ہو گئی۔ سامنے بستر کے اوپر ستر کا ہندسہ تھا۔ دوست السر کے مرض میں مبتلا تھا اور اس مرض کا آخری علاج آپریشن ہوتا ہے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کامران سے معذرت چاہی۔ تیزی سے چلتا ہوا ایک ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچ کر فون کا ریسیور اٹھایا اور پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

آدھ گھنٹہ بعد وہ ڈاکٹر وقار احمد کی کوٹھی میں تھا۔ ڈاکٹر کہیں باہر جانے والا تھا۔ اُس

نے حشمت کو دیکھتے ہی ناگواری سے پوچھا۔

''کیا آپ پھر مجھے پریشان کرنے آئے ہیں؟''

''نہیں میں تمہاری بیوی لارا سے ملنے جارہا ہوں۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لے چلوں۔''

ڈاکٹر نے.......... ایک دم سے پریشان ہوکر پوچھا۔

''یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ لارا سے ملنے کہاں جائیں گے؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔ لارا جہاں موجود ہے، وہاں کی چابی میرے پاس ہے۔'' حشمت نے جیب سے کی چین نکالی۔ اُس کے فلیگ پر 70 کا ہندسہ درج تھا۔

ڈاکٹر وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔ حشمت نے ریوالور نکال کر کہا۔

''تمہاری کوٹھی چاروں طرف سے گھیر لی گئی ہے۔ بہتر ہے شرافت سے میرے ساتھ چلو۔''

اس نے بے بسی سے ریوالور کو دیکھا۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''پلیز آپ مجھے بتادیں کہ کہاں لے جارہے ہیں؟''

''جہاں تم نے لارا کو اور باقی ہیروں کو چھپایا ہے۔''

باہر پولیس کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب وہ قافلہ آگے بڑھا تو ڈاکٹر کی گھبراہٹ اور بدحواسی بڑھ گئی۔ حشمت نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''کیوں ڈاکٹر! یہی راستہ خواب گاہ نمبر 70 کی طرف جاتا ہے نا؟''

وہ شکست خوردہ انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ حشمت نے کہا۔

''اب تم میرے سوالات کا جواب سیدھی طرح دوگے۔ بتاؤ امریکہ میں لارا کا علاج کیسے ہوا تھا؟''

وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''نیوجرسی میں ہماری رہائش کا انتظام ان لوگوں نے کیا تھا، جن سے میں دولاکھ ڈالر کے ہیرے لے کر یہاں واپس آنے والا تھا۔ یہاں ان کی مالیت بائیس لاکھ روپے ہے۔ لارا کا مرض آخری اسٹیج پر تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر بھی مایوس تھے پھر بھی انہوں نے اس کے پیٹ کا آپریشن کیا۔ آپریشن کے تیسرے دن لارا نے کہا۔

''ہسپتال میں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے اُسی رہائش گاہ میں لے چلو۔''

میں نے ڈاکٹروں سے چھٹی کی درخواست کی۔ ان سے آپریشن کی رپورٹ حاصل کی۔ پھر اپنی رہائش گاہ میں اُسے لے آیا۔ اُس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا آخری وقت آپہنچا تھا۔ اس نے مجھے قریب بلا کر کہا۔ ''میں نہیں جانتی تھی کہ تم سے شادی کروں گی تو میری بیٹی مجھ سے بدظن ہو جائے گی۔ وقار میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھ سے دور ہوکر بازاری عورت بن جائے۔ میں مرنے سے پہلے اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ بولو کیا مجھ سے ایک وعدہ کروگے؟''

''میں تم سے کیا ہوا وعدہ نبھاؤں گا۔ تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں وہ تمام ہیرے اپنے پیٹ میں چھپا کر لے جاؤں گی۔ تم ان کی آمدنی میں سے ایک لاکھ روپے میری میرلن کو دے دینا۔''

''میں کسی طرح بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ میرے پیٹ کے ٹانکے کھول کر وہ قیمتی ہیرے چھپا دو۔ اس کے بعد دوبارہ ٹانکے لگا دینا۔ تم ڈاکٹر ہو۔ ایسا آسانی سے کر سکتے ہو۔ ائیرپورٹ کی سیکورٹی فورس والے شبہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہاں کے بہت بڑے ہسپتال اور مستند ڈاکٹر کے آپریشن کی رپورٹ تمہارے پاس موجود ہے۔''

میں نے اُس کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ وہ مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ میں اسمگلنگ کی خاطر اس کی زندگی سے نہیں کھیل سکتا تھا لیکن وہ آخری وقت اپنی روٹھی ہوئی بیٹی کے لئے کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ دوسری صبح میری آنکھ کھلی تو وہ مُردہ پڑی ہوئی تھی۔ رات کو کسی وقت اس نے چاقو لے کر اپنے پیٹ کے ٹانکے کھول دیئے تھے۔

اُس کی باتوں کے دوران گاڑیاں قبرستان کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ وہ گاڑیوں سے اتر کر احاطہ میں داخل ہوئے۔ اب چھپانے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر انہیں قبرستان کے بائیں گوشے میں لے گیا۔ پھر وہ قبروں کو گنتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سترہویں قبر پر پہنچ کر وہ رک گیا۔

جب اُسے کھود کر تابوت کو نکالا گیا تو اس کی لکڑیاں بے رنگ ہو رہی تھیں۔ حشمت نے جیب سے کی اور چین نکال کر ایک سپاہی کو دی چین کے چرمی فلیگ پر 70 کا ہندسہ تھا۔ لارا سترنمبر کی ابدی خوابگاہ میں ابدی نیند سو رہی تھی۔ تابوت کا ڈھکن چابی سے کھلنے کے بعد

اسے کوئی نہ پہچان سکا کیونکہ وہاں صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ سینے سے کمر تک کی ہڈیوں کے درمیان ہیروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھنسے ہوئے جگمگا رہے تھے۔

ڈاکٹر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگا۔ اُس کی محبوب بیوی نے ایک ماں کے ناطے بیٹی کے لئے بہت بڑی قربانی دی تھی لیکن جو کچھ بھی کیا تھا جرم کے سائے میں کیا تھا۔ اس لئے بیٹی کو ماں کی قربانی سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

☆======☆======☆

سحر زدہ

ایک حسین ساحرہ کا عبرت انگیز قصہ
جس نے سب کو سحر زدہ کر رکھا تھا۔
تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانی۔

ایک ماحول کو پُراسرار بنانے کے لئے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کچھ وہاں موجود تھا۔ اس بند کمرے میں نیم تاریکی اور نیم روشنی تھی۔ ایسی آدھی آدھی روشنی جو دم توڑتی ہوئی لگتی ہے اور ایسی نیم تاریکی جو دُکھ کی پرچھائیوں کی طرح اور آسیب کی طرح آہستہ آہستہ حواس پر چھانے لگتی ہے۔ وہ بستر پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی پھیلی پھیلی آنکھوں سے کمرے کے اس ماحول کو دیکھ رہی تھی۔

ایک حسین لڑکی لیٹی ہوئی ہو اور اس کے آس پاس ہلکی ہلکی تاریکی ہو تو ایسی خوابناک سچویشن میں گدگدی سی ہوتی ہے۔ اگر وہ لڑکی وحشت زدہ ہو اور سوچتی ہوئی سہمی سہمی نظروں سے آس پاس دیکھ رہی ہو تو لگتا ہے، حسن مصیبت میں گرفتار ہے۔ ایسے میں اس پر اور زیادہ پیار آتا ہے۔ مجھے تو ٹوٹ ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔ جی مچل رہا تھا کہ ابھی اس حسینہ کے پاس جاؤں اور اس پر قربان ہو جاؤں۔

لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ میں یوں چھپ کر تماشہ دیکھ رہا تھا جیسے کسی جادوگر نے اس شہزادی کو قید کر رکھا ہے۔ اگر وہ اس پر ظلم کرے گا، تب میں اچانک ہی اس کی جان بچانے کے لئے چھلانگ مار کر اس کے سامنے پہنچ جاؤں گا۔ مجھے معلوم کرنا تھا کہ وہاں کیا ہونے والا ہے۔

اس کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی۔ اس کا ڈیزائن ایسا تھا جیسے انگریزی کے حرف [illegible] کو الٹا دیا گیا ہو۔ اس کے شیشوں سے باہر کی روشنی اندر آرہی تھی جس کی وجہ سے کمرہ نیم روشن اور نیم تاریک تھا۔ کھڑکی کے اوپر ایک تصویر تھی۔ اس تصویر میں ایک بڑا سا چہرہ بنا ہوا تھا۔ وہ چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے پتھر کا ہو۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ ان آنکھوں کی پتلیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔ یا تو وہ اندھا تھا یا پھر سحرزدہ ہو گیا تھا۔ اس پر بھی جادو کا اثر تھا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ سامری جادوگری نے اسے پتھر کا بنا دیا ہو۔

اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ دروازہ بند ہو گیا۔ ہلکی ہلکی قدموں

کی چاپ سنائی دینے لگی۔ آنے والا کھڑکی کے سامنے آ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا سایہ سامنے کی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ وہ بڑا قد آور تھا۔ اس سائے کی کھوپڑی دیکھنے سے پتہ چلتا تھا جیسے اس کا سر منڈا ہوا ہو۔ گردن سے نیچے تک ایک بہت بڑا اور ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی انگلیاں یوں پتلی پتلی استخوانی لگ رہی تھیں جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے نے لبادہ پہن رکھا ہو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حسینہ کے سرہانے پہنچ گیا۔ وہ دیدے پھیلائے چھت کو تک رہی تھی۔ اس نے یقیناً آنے والے کی آہٹ سنی ہو گی لیکن اب تک اس نے سر گھما کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر کمرے کی خاموشی میں ایک بھاری بھرکم گھمبیر سی آواز ابھری۔ آنے والے نے کہا۔ ''لڑکی میں تمہارے سامنے آرہا ہوں۔ اپنی آنکھیں بند کرلو۔ جب تک میں نہ کہوں مجھے نہ دیکھنا۔''

لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سرہانے کی طرف سے چلتا ہوا بستر کے پائنتی پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے پلٹ کر لڑکی کے رُوبرو ہو کر اس کے خوبصورت سے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اب میں بھی اس سامری جادوگر کے چہرے کو صاف طور سے دیکھ سکتا تھا۔

وہ روایتی جادوگروں کی طرح بھیانک نہیں تھا۔ اچھا خوبرو جوان تھا۔ اپنے لانبے قد کے ساتھ اگر صحت مند ہوتا تو اور زیادہ خوبرو اور پُرکشش لگتا۔ اس وقت ڈھیلے ڈھالے لبادے میں اپنے آپ کو جادوگر کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہوئے اپنی گھمبیر آواز میں پوچھا۔ ''کیا تم نے صبح ناشتہ کیا تھا؟''

''جی نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

وہ سرہلا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تم پر جو عمل کرنے جارہا ہوں اس کے لئے خالی پیٹ رہنا ضرور ہے۔ تم اس وقت خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی ہو، یا اب بھی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو؟''

وہ بولی۔ ''پروفیسر، یہ پریشانیاں تو مرتے دم تک نہیں چھوٹیں گی۔ اس ہسپتال کے ڈاکٹر پچھلے تین دنوں اور تین راتوں سے مجھے سلانے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔ کتنی ہی دوائیں کھانے اور انجکشن لگوانے کے باوجود مجھے نیند نہیں آئی۔''

''فکر نہ کرو۔ میں ابھی تمہیں گہری نیند سلا دوں گا۔ مجھ سے تعاون کرو۔ اپنے دل اور دماغ کو میری طرف مائل کردو۔ سوچو کہ میں کیسا ہوں۔ میری شخصیت تم پر اثر انداز ہوتی

ہے، یا نہیں؟ میری آواز کیسی ہے؟''

''آپ کی آواز سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ریگ مال سے دل کو رگڑ رہا ہو۔ بڑی ہی خراشیں ڈالنے والی آواز ہے۔ مگر سیدھی کانوں کے راستے دل تک پہنچتی ہے۔''

''ہوں، اب تم آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھو۔''

وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''میرے چہرے کو نہیں، میری آنکھوں کو دیکھو، ان آنکھوں میں جھانکتی رہو۔''

وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے۔ پھر پروفیسر سامری نے اپنی اسی گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم میری آنکھوں میں جھانک رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں اب کسی سمت نہیں دیکھیں گی۔ تم ایک بہت اچھی اور تعاون کرنے والی لڑکی ہو۔ تم مجھ سے ہر معاملے میں تعاون کرو گی۔ جیسا میں کہوں گا اس پر عمل کرو گی۔''

دیکھنے والی کی پلکیں جھپک گئیں، وہ بولا۔ ''اب تم پلکیں نہیں جھپکاؤ گی۔ میری آنکھوں میں دیکھتی رہو گی۔ دیکھتی چلی جاؤ گی۔ تمہیں میری آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ دیکھو، میری آنکھوں کو دیکھو۔ جیسے میں تمہاری آنکھوں کو دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ اگر تمہاری زبان نہ ہو تو بھی تم گونگی نہ کہلاؤ، کیونکہ تمہاری آنکھیں بولتی ہیں اور خوب بولتی ہیں۔ دیکھو یہ بول رہی ہیں کہ تمہاری آنکھوں میں نیند کے ڈورے پڑ رہے ہیں، تمہاری آنکھوں میں خواب سمانے والے ہیں۔ تمہارے آس پاس کا ماحول دھندلا گیا ہے۔ اب صرف میری آنکھوں کے سوا اس دھندلکے میں تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔''

میں جہاں سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا، وہاں سے اس حسینہ کی تمام کیفیات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ پتہ نہیں اس پر کیا گزر رہی تھی، اور وہ کس حد تک پروفیسر سامری سے متاثر ہو رہی تھی۔ سامری نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہاری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔ تمہاری پلکیں نیند سے بوجھل ہو گئی ہیں۔ تم نیند کی آغوش میں پہنچنے کے لئے اپنی آنکھوں کو بند کر رہی ہو۔''

اس کے کہنے کے مطابق اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں سامری ایک عامل کی طرح ٹھہر ٹھہر کر بولتا جا رہا تھا۔ اپنی آواز کے ذریعے اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ اپنی

آنکھوں کی مقناطیسی قوت کے ذریعے اس کی آنکھوں کو بند کر چکا تھا اور اسے رفتہ رفتہ نیند کی وادی میں پہنچا رہا تھا۔

پھر اس نے کہا۔ ''تم اس وقت میرے زیرِ اثر ہو۔ تم اپنی نیند کے دوران میری تابع فرمان رہو گی۔''

اس کی آنکھیں اور اس کے ہونٹ بند تھے۔ پھر اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ وہ کھلے اور وہ بولنے لگی۔ ''میں تمہاری تابع فرمان رہوں گی۔''

''نیند کے دوران تمہارا خوابیدہ ذہن صرف میرے لئے بیدار رہے گا۔ تمہارے کان دنیا کی کوئی آواز نہیں سنیں گے، صرف میرے سوال سنیں گے اور تم ان کے جواب دو گی۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر سحر زدہ انداز میں بولنے لگی۔ ''میں تمہارے سوالات کے جواب دوں گی۔''

پروفیسر سامری نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سمیرا رحمان ہے۔''

''رحمان تمہارا کون ہے یا کون تھا؟''

''رحمان میرا باپ تھا۔''

''تمہیں نیند کیوں نہیں آتی؟''

''میں خوف زدہ رہتی ہوں۔''

''یہ باتیں تم نے ڈاکٹر سے اور ماہر نفسیات سے چھپائی ہیں۔ آخر کیوں؟''

''میں اپنے خوف کی وجہ دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔''

''چپ چاپ خوف زدہ رہنے کی وجہ بتاؤ؟''

''مجھے اس قاتل سے ڈر لگتا ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''تمہیں کس پر شبہ ہے؟ کون تمہیں قتل کر سکتا ہے یا قتل کرا سکتا ہے؟''

''میرا شوہر، میرا سسر!''

''اچھا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟''

"نہیں، میری شادی نہیں ہوئی۔"

"پھر تمہارا شوہر کہاں سے آ گیا؟"

"وہ شادی محض ایک کاروباری معاہدہ ہے۔"

"اپنی اس بات کی وضاحت کرو۔"

وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ "جمشید میرے والد کا بزنس پارٹنر ہے وہ میری شادی ا
بیٹے ظفر سے کرنا چاہتا تھا۔ میرے والد بھی اپنی زندگی میں یہی چاہتے تھے لیکن میں ظ
پسند نہیں کرتی۔ میرا آئیڈیل کوئی اور ہے لیکن والد کے مرنے کے بعد جمشید نے کہا،
کاروبار اسی طرح پورے اعتماد سے چل سکتا ہے کہ ہم آپس میں رشتہ دار رہیں۔ مجھے شُ
کہ وہ باپ بیٹا مل کر کاروبار میں خسارہ ظاہر کر رہے ہیں اور میرے والد مرحوم کی لاکھو
روپے کی رقم دبائے بیٹھے ہیں۔ اگر میں نے شادی نہیں کی اور انہیں اپنے اعتماد میں نہ ل
اتنی بڑی رقم سے محروم ہو جاؤں گی۔ پھر یہ باپ بیٹے آہستہ آہستہ مجھے اس کاروبار سے ک
طرح الگ کر دیں گے۔ میں ان کی بہو بن کر اور ظفر کی بیوی بن کر اس کاروبار کے م
سے اپنی زندگی کو خوشحال بنا سکتی ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے ظفر سے صاف صاف کہہ دیا
میں شادی کر لوں گی لیکن تمہارے ساتھ بیوی کی حیثیت سے زندگی نہیں گزاروں گی۔
صرف بزنس پارٹنرز ہوں گے۔ ظفر نے میری بات مان لی۔ پھر رشتہ داروں اور دوس
احباب کی موجودگی میں ہماری شادی ہوگئی۔"

پروفیسر سامری نے پوچھا۔ "اس دکھاوے کی شادی سے تمہارے شوہر ظفر ا
تمہارے سسر جمشید کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اعتماد کیسے قائم ہو سکتا ہے؟"

"ایسے کہ اب میں اس کی بیوی بن جانے کے بعد کسی دوسرے سے شادی نہیں
سکوں گی۔ کسی دوسرے کو اپنا دوست اور ہمراز نہیں بنا سکوں گی۔ میں اس کی بیوی کی حیثیت
سے زندگی نہ گزارنے کے باوجود نکاح نامے کی رُو سے پابند ہوں گی لیکن میرے
اندازے غلط نکلے۔ بات کچھ اور تھی۔"

"کیا بات تھی؟"

"دراصل ظفر مجھے اپنی بیوی بنانے کے بعد میرے حصے کے بزنس پر قابض ہو
ہے۔ بحیثیت شوہر میرے بعد وہی میرے حصے کا مالک ہوگا اور میرے بعد مالک بنے
لئے شاید وہ مجھے قتل کرانا چاہتا ہے۔ اسی لئے مجھے اپنے شوہر اور سسر پر شبہ ہے۔"

"یعنی صرف شبہ ہے، یقین نہیں ہے؟"

"صرف شبہ ہے۔"

"یقین کیوں نہیں ہے؟"

"اس لئے کہ ظفر مجھے بہت چاہتا ہے۔ میری ہر بات مانتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی
ہے کہ اس کی کسی بات سے میرے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ میں اس کی صورت دیکھتی ہوں تو دل
کہتا ہے، ایسا شخص مکار نہیں ہو سکتا۔ میری جان کا دشمن نہیں بن سکتا۔"

پروفیسر سامری نے پوچھا۔ "جس وقت تمہارا دل ظفر کو اپنا جانی دشمن نہیں سمجھتا ہے۔
اس وقت تمہارا شبہ اور کس پر ہوتا ہے؟"

"قادر جان پر شبہ ہے۔"

"یہ قادر جان کون ہے؟"

"میرا محبوب ہے۔ وہ میرا دیوانہ تھا۔ شادی سے پہلے وہ کہتا تھا کہ کوئی میری طرف
آنکھ اٹھا کر دیکھے گا تو اس کی آنکھیں نکال لے گا۔ کوئی میرا ہاتھ پکڑنا چاہے گا تو اس کے
ہاتھ توڑ دے گا۔ اگر میں کسی سے شادی کروں گی تو وہ مجھے قتل کر دے گا، کسی دوسرے کی
آغوش میں برداشت نہیں کرے گا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ وہ اپنی اس دھمکی پر دیوانہ وار
عمل کر رہا ہے۔ مجھے ظفر کی منکوحہ کی حیثیت سے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے قتل کر دینا چاہتا
ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ قتل کرنا چاہتا ہے؟"

"نہیں۔ شبہ ہے۔"

"کوئی اور ایسا ہے جس پر تمہیں یقین کی حد تک شبہ ہو؟"

اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ "مجھے اکبر پاشا پر یقین کی حد تک شبہ
ہے۔"

"یہ اکبر پاشا کون ہے؟"

"میرا نقلی باپ ہے۔"

"نقلی باپ کے سلسلے میں وضاحت کرو۔"

"میرے والد عبدالرحمان کے انتقال کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا اجنبی شخص مجھ سے
ملا تھا۔ اس نے کہا۔ میں تمہارا اصلی باپ ہوں تمہاری ماں سے میری شادی ہونے والی تھی۔

ہم چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ جب وہ میرے بچے کی ماں بننے لگی تو عبدا
کے پاس دولت دیکھ کر ادھر پھسل گئی اور اس کی منکوحہ بن کر تمہیں جنم دیا۔ عبدالرحمان
خوش فہمی میں رہا کہ میں اس کی بیٹی ہوں۔''

''کیا اس کا یہ دعویٰ درست ہے؟''

''میں نہیں مانتی۔ میں عبدالرحمان کی بیٹی ہوں۔ اکبر پاشا جھوٹ بولتا ہے۔ میر
والد کی دولت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے جب تک میں اسے ہر ماہ اچھی خاص
دیتی رہوں گی۔ اس وقت تک وہ اس بات کا انکشاف ظفر اور جمشید پر نہیں کرے گا۔''

''اکبر پاشا کس طرح تمہیں اپنی بیٹی ثابت کر سکتا ہے؟''

''اس نے مجھے ایک تصویر دکھائی۔ اس تصویر میں میری ماں اور وہ دونوں ایک سا
کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی تقریب میں اتاری ہوئی تصویر ہے لیکن وہ
ہے کہ یہ ان کی محبت کی نشانی ہے اس تصویر کے علاوہ چند ایسے خطوط ہیں جو میری ماں
محبت سے لکھے ہیں۔ وقت آنے پر وہ ان خطوط کو بھی پیش کرے گا۔ میں ڈرتی ہوں، سو
ہوں کیا کروں؟ اگر میں اسے جھوٹا کہتی ہوں اور اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتی ہوں تو وہ میر
ماں کو بدنام کر دے گا۔ بیشک جوانی میں، میری ماں نے محبت کرنے کی غلطی کی ہوگی لیکن
ایسی بے حیائی نہیں کی ہوگی جیسا کہ وہ کہتا ہے۔''

''کیا تم اس کا مطالبہ پورا کرتی ہو؟''

''ہاں! ایک ماہ وہ مجھ سے پانچ ہزار روپے لے گیا۔ دوسرے مہینے دس ہزار رو
جبراً لے کر جانے لگا تو میں نے کہا۔ میں آئندہ اتنی رقم نہیں دے سکوں گی۔ وہ ہنستا ہوا
گیا۔ تیسرے مہینے بھی اس نے دس ہزار کا مطالبہ کیا۔ میں نے دینے سے انکار کر دیا۔ میں
اتنی بڑی بڑی رقمیں نہیں دے سکتی تھی۔ آخر ایک حد ہوتی ہے۔ میں کب تک اس کا مطا
پورا کرتی رہتی۔ میرے انکار کرنے پر وہ بھڑک گیا، کہنے لگا۔ میں تمہاری ماں کو بدنام نہیں
کروں گا۔ میں جمشید اور ظفر کو بھی نہیں بتاؤں گا کہ تم میری بیٹی ہو۔ اس لئے کہ اس میں م
بھی نقصان ہے۔ میں تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دیتا ہوں اگر تم نے دس ہزار روپے مجھے
مہینے بھی نہ دیئے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس دھمکی کے بعد میں نے یہی دیکھا
وہ غائب ہو گیا ہے لیکن اس کی عدم موجودگی میں دوبار مجھ پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ یقیناً
مجھے دہشت زدہ کر رہا ہے قتل کرنا نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہوتا تو قاتل دوبار ناکام نہ ہوتا

سوچتی ہوں، قاتل سے دوبار چُوک ہوگئی ہے، تیسری بار ایسا نہیں ہوگا، اور وہ سچ مچ مجھے مار ڈالے گا۔ کبھی ایسا سوچتی ہوں، کبھی ویسا سوچتی ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ کس طرح اپنی جان بچاؤں؟ بس اسی فکر اور پریشانی میں مجھے نیند نہیں آتی، بھوک نہیں لگتی۔ میں کسی کو اپنا دُکھڑا سنا نہیں سکتی۔ اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ میں بھی بدنام ہوں گی، میری ماں بھی بدنام ہوگی۔ ظفر اور جمشید میرے دشمن ہو جائیں گے اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح اس بزنس کی پارٹنر شپ سے نکال کر پھینک دیں گے۔''

''کیا اصل قاتل تک پہنچنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں آتی ہے؟''

میں ہمیشہ سوچتی رہتی ہوں۔ دماغ میں یہی بات آتی ہے کہ اگر ہمارے ملک میں پرائیویٹ جاسوس ہوتے تو میں ان میں سے کسی کی خدمت حاصل کرتی۔ وہ چپکے چپکے قاتل تک پہنچنے کی کوشش کرتا اور اسے بے نقاب کر دیتا۔ یہاں پولیس والوں سے رابطہ قائم کرنے سے بات فوراً ہی کھل جاتی ہے۔ پولیس والے مشتبہ افراد کی کھچائی شروع کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اصل مجرم ہوشیار ہو جاتا ہے۔ ایسا ہوا تو وہ مجرم اور بھی میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ ابھی وہ محض دھمکیاں دینے کے لئے قاتلانہ حملے کر رہا ہے۔ بعد میں سچ مچ مجھے قتل کر دے گا۔ ادھر اکبر پاشا کی طرف سے جان کا خطرہ ہے۔ اُدھر جمشید اور ظفر کی طرف سے یہ اندیشہ ہے کہ بات کھلنے سے وہ مجھے اپنے گھر سے اور اپنے کاروبار سے نکال دیں گے۔''

''میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو باقاعدہ پرائیویٹ جاسوس نہیں ہے لیکن کچھ ایسی ہی خدمات پیش کرتا ہے۔ میں اس سے تمہارا تعارف کراؤں گا۔ وہ اس قاتل تک ضرور پہنچے گا۔ جس کی وجہ سے تم نے کھانا پینا اور سونا چھوڑ دیا ہے۔ کیا تم میرے احکامات کی تعمیل کرو گی؟''

''ہاں! میں تمہارے احکامات کی تعمیل کروں گی۔''

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم چھ گھنٹے تک گہری نیند سوتی رہو گی۔''

''میں چھ گھنٹے تک گہری نیند سوتی رہوں گی۔''

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ بیدار ہونے کے بعد تم غیر شعوری طور پر میری معمولہ بنی رہو گی۔ ہوش و حواس میں رہ کر میرے احکامات کی غیر شعوری طور پر تعمیل کرتی رہو گی۔''

''میں غیر شعوری طور پر تمہارے احکامات کی تعمیل کرتی رہوں گی۔''

"تم با قاعدہ تین وقت کھایا کرو گی۔ ہر رات دس بجے سو جایا کرو گی اور صبح پانچ بجے بیدار ہو جایا کرو گی۔"

"میں با قاعدہ تینوں وقت کھایا کروں گی۔ رات کے دس بجے سو جایا کروں گی اور صبح پانچ بجے بیدار ہو جایا کروں گی۔"

"اب تم مکمل طور پر سو رہی ہو۔ تمہارے ہونٹ بھی خاموش رہیں گے۔ نہ تم کوئی سوال سنو گی، نہ جواب دو گی۔ تمہارا دماغ بھی اب تمہاری آنکھوں کی طرح سوتا رہے گا۔ تم دنیا کی کوئی آواز نہیں سنو گی۔ بڑے سکون سے سوتی رہو گی۔ تم سو رہی ہو۔ گہری نیند سو رہی ہو۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور اپنی آواز بتدریج دھیمی کرتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑے رہ کر اس خوابیدہ حسن کو دیکھتا رہا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔

میں ایک اونچے سے اسٹول پر کھڑا ہوا روشندان سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی اب وہاں سے ہٹ جانا چاہئے تھا لیکن وہ خوابیدہ حسن دور سے پیارا لگ رہا تھا۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ صرف دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً نزدیک سے بھی سہانی ہو گی۔

مجھے اپنے پیچھے پروفیسر سامری کی آواز سنائی دی۔ "بہت ہو چکا حضرت! اب نیچے آ جائیے۔"

میں نے روشندان کی طرف سے پلٹ کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر اسٹول پر سے کود کر فرش پر آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "تماشہ کیسا رہا؟"

میں نے اس کے ساتھ ہسپتال کے کوریڈور میں چلتے ہوئے کہا۔ "میں نے اب تک ہپناٹزم کے متعلق سنا تھا اور پڑھا تھا۔ آج ایک عامل اور معمول کا عمل اور ردِعمل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تمہارا شکریہ!"

سامری نے کہا۔ "کوئی بھی ہپناٹزم جاننے والا تنویمی عمل کے دوران کسی کو کمرے کے اندر آنے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی کسی کے لئے اس عمل کو دیکھنے کی گنجائش چھوڑتا ہے۔ تم نے بہت ضد کی تھی اسی لئے میں نے اجازت دے دی۔ ویسے یہ بتاؤ کہ میں نے سوالات کیسے کئے؟"

میں نے کہا۔ "جواب نہیں ہے۔ تم تو کسی بہت ہی تجربہ کار پولیس انسپکٹر کی طرح سوالات کر رہے تھے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو بالکل یہی سوالات کرتا۔ بڑی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے ایک میڈیکل آفیسر کے کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے میں ایک ماہر نفسیات اور تین ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے ان کے درمیان ایک بڑا سا اسپیکر رکھا ہوا تھا۔ اس کا کنکشن اسی کمرے سے تھا جہاں سمیرا رحمان تنویمی عمل کے بعد گہری نیند سو رہی تھی۔ یعنی ماہر نفسیات اور ان ڈاکٹروں نے وہ ساری گفتگو سنی تھی جو پروفیسر سامری اور سمیرا رحمان کے درمیان ہوتی رہی تھی۔

سامری کو دیکھتے ہی ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ ہمارا کیس نہیں ہے۔ سمیرا رحمان دماغی مریضہ ہے۔ ہم نے پہلے اسے نیند کی دوائیں دیں۔ وہ بے اثر ہو گئیں۔ پھر اسے انجکشن لگائے۔ معلوم ہوا کہ وہ بیس پچیس منٹ کے لئے سوتی تھی۔ پھر وہ انجکشن بھی بے اثر ہو جاتے تھے اور وہ بیدار ہو جاتی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر! کیا سمیرا رحمان کو یہاں ہسپتال میں زیرِ علاج رکھا گیا تھا۔ یہاں دوائیں دی جاتی تھیں اور انجکشن لگائے جاتے تھے؟"

ڈاکٹر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، سمیرا رحمان ہماری پیشنٹ تھیں۔ گھر ہی میں رہ کر علاج کراتی تھیں۔ میں ان کا فیملی ڈاکٹر بھی ہوں۔ میں خود ان کے ہاں جا کر اسے انجکشن لگاتا تھا۔ جب صبح پہنچتا تھا تو یہی رپورٹ ملتی تھی کہ وہ رات کو سو نہیں سکی۔ انجکشن بے اثر ہو گئے۔ اس کی آنکھیں بھی بتاتی تھیں کہ وہ رات کو جاگتی رہی ہے۔ بے حد پریشان رہتی تھی لیکن اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتاتی تھی۔ آج ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اسی مقصد کے لئے ہم نے سمیرا رحمان کو مجبور کیا تھا کہ وہ ہسپتال آئے اور تنویمی عمل سے گزرے تاکہ اسے گہری نیند سلایا جا سکے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس عمل کے ذریعے ہم اس کی پریشانی کی وجہ بھی معلوم کر لیں گے۔"

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "پروفیسر! اس پر دو بار قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں اور وہ یہ بات چھپا رہی ہے۔ اس لئے وہ مجبور بھی ہے لیکن اب یہ بات ہم لوگوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ مشتبہ افراد بھی ہماری نظروں میں ہیں۔ ہم پولیس والوں سے اس سلسلے میں مدد لے سکتے ہیں۔"

سامری نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ایک تو یہ کہ یہ سمیرا رحمان کا ذاتی معاملہ ہے اور وہ اپنی سلامتی کے لئے یہ بات چھپا رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ واقعی پولیس والے بہت کھل کر تحقیقات کرتے ہیں۔ مشتبہ افراد کی کھچائی ایسے کرتے ہیں کہ اصل مجرم ہوشیار ہو جاتا ہے اور اپنے بچاؤ کے راستے پہلے ہی تلاش کر لیتا ہے۔ میں اس بات کا مشورہ آپ لوگوں کو نہیں دوں گا۔ ہم سب اس سلسلے میں بالکل خاموش رہیں تو بہتر ہے۔''

ماہر نفسیات نے پوچھا۔ ''پروفیسر! کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ قتل کر دی جائے؟''

''نہیں، میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص سے رابطہ قائم کرے جو پرائیویٹ جاسوس کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ وہ اصل قاتل تک پہنچ جائے گا۔ میں نے آپ لوگوں سے ان کا تعارف نہیں کرایا ہے۔ ان سے ملئے یہ مسٹر ابنِ شہاب ہیں۔ آپ لوگوں نے بیرسٹر لیلیٰ محسن کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یہ ان بیرسٹر صاحبہ کے خاص معاون ہیں۔ ان کے کیس کے سلسلے میں ان کے مؤکلوں کے متعلق تحقیقات کرتے ہیں اور اس کام میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔''

ان لوگوں نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے بھی مصافحہ کے دوران اپنی خوشی کا اظہار کیا تو پروفیسر سامری نے کہا۔ ''یہی مسٹر شہاب اب سمیرا رحمان کے قاتل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''

سامری کو یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ بات ان میں سے کسی کے ذریعے اصل قاتل تک پہنچ سکتی تھی۔ چونکہ سامری ہمارے طریقہ کار کو نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے ایسی بات کہہ گیا۔ جب میں اس کے ساتھ ہسپتال سے باہر آیا تو میں نے اس بات پر اعتراض کیا، وہ بولا۔ ''مجھے افسوس ہے اگر تم اشارہ دیتے تو میں یہ بات ہرگز اپنی زبان پر نہ لاتا۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ آئندہ میں محتاط رہوں گا۔''

پروفیسر سامری کا اصل نام قدرت اللہ ہے لیکن اس نے پیشے کے اعتبار سے اپنے مؤکلوں پر رعب اور دبدبہ طاری کرنے کے لئے ایک روایتی جادوگر سامری کا نام اپنایا ہوا تھا اور اسی نام سے مشہور ہو رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پارکنگ ایریا میں اپنی کار کے پاس آیا۔ بیرسٹر لیلیٰ محسن نے مجھے یہ کار دی تھی۔ وہ لاولد چنگیزی کے کیس کے دوران ہی مجھ پر اتنی مہربان ہوئی تھیں کہ پہلے اپنا سپر ہائی وے والا کاٹیج مجھے رہائش کے

لئے دیا تھا اور اب میرے لئے یہ نئی کار خرید لی تھی۔ پروفیسر سامری نے کار کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بڑی خوبصورت کار ہے۔''

میں لیلیٰ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ بے خیالی میں کہہ گیا۔ ''ہاں، بے حد خوبصورت ہے۔ عمر کچھ زیادہ ہے لیکن خوبصورتی کے پیچھے عمر چھپ جاتی ہے۔''

پروفیسر سامری نے تعجب سے مجھے دیکھتے ہوئے پھر کار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''عمر؟ تم اس کار کی عمر بتا رہے ہو یا کسی اور کی؟''

میں نے ایک دم سے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔ پھر سنبھل کر کہا۔ ''آں، ہاں! میں سمیرا رحمان کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں آیا کہ تم اس کے حسن کی تعریف کر رہے ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''بہت خوب! تم اسے تصور میں دیکھنے لگے ہو۔ پھر تو یقیناً اس کے قاتل کو بہت جلد ڈھونڈ نکالو گے۔ بس لگن کی بات ہوتی ہے اور تمہارے اندر یہ لگن پیدا ہو گئی ہے۔''

میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو اور مجھے ہپناٹزم کے متعلق کچھ بتاؤ۔''

وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر کار کے دروازے کو بند کیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''ہپناٹزم کے متعلق میں وہی بتاؤں گا جو تم کتابوں میں پڑھ چکے ہو۔ یہ علم بڑی محنت اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جب حاصل ہو جائے تو یہ علم کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ مثبت انداز میں کام کرتا ہے یا منفی انداز میں۔ کیونکہ کچھ لوگ اسے غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے ایسے ایسے جرم کئے جاتے ہیں کہ قانون بھی بے بس ہو جاتا ہے لیکن میں نے ابتدا ہی سے مثبت انداز میں اسے استعمال کیا ہے۔ میں ڈاکٹروں کی اس سلسلے میں مدد کرتا ہوں۔ ایسے مریض بھی ہوتے ہیں جن کا علاج کرنے سے پہلے ان کی ہسٹری شیٹ معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بہت سے مریض اپنی ہسٹری شیٹ صحیح نہیں بتاتے یا اگر بتاتے ہیں تو کچھ بھول جاتے ہیں۔ انہیں اپنے آباؤ اجداد کے متعلق پوری طرح معلوم نہیں ہوتا یا جو معلومات ان کے دماغ میں ہوتی ہیں۔ وہ اسے بھولے ہوئے رہتے ہیں۔ ایسے وقت ہم تنویمی عمل کے ذریعے ان کے ذہن کو کریدتے ہیں اور انہیں اپنا معمول بنا کر ان کی گمشدہ یادوں کو ان کے دماغ سے نکال کر مکمل ہسٹری شیٹ تیار کر لیتے ہیں۔''

میں نے متاثر ہو کر کہا۔ ''یہ تو بڑا ہی کارآمد علم ہے۔ میں نے اسی شہر میں کئی سائن بورڈ دیکھے ہیں۔ کہیں لکھا ہوتا ہے۔ عامل دلدار زیدی اور کہیں لکھتا ہوتا ہے، پروفیسر جوگیا شہزادہ۔ ایسے ہی کتنے سارے عامل سائن بورڈ لگائے دکان سجائے رکھتے ہیں۔ ان کی کیا حقیقت ہے؟''

''یہ بے حقیقت ہوتے ہیں۔ انسانی نفسیات کو کسی حد تک سمجھتے ہیں اور اپنے ہاں آنے والے گاہکوں کے مزاج کے مطابق باتیں کرتے ہیں۔ انہیں اپنی باتوں سے اور آنکھوں سے اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے متاثر کرتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے جیسا ہپناٹزم جاننے والا یہاں اور بھی کوئی ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ایک شخص ہے لیکن وہ اپنے علم کو بہت ہی غلط انداز میں استعمال کرتا ہے۔ مجھے اس کے متعلق رپورٹ ملی ہے۔ کبھی وہ میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اس کی خبر لوں گا۔ اس کا نام عامل حیات پاشا ہے۔''

''ہاں! میں نے بھی اس کا نام سنا ہے۔ ویسے سمیرا رحمان سے تو اب چھ گھنٹے کے بعد ہی ملاقات ہو سکے گی۔''

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ بڑی بے چینی ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ میں کام کے سلسلے میں جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں جن لوگوں پر اسے شبہ ہے، ان کے پتے نوٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں! چھ گھنٹے بعد وہ بیدار ہو گی، تب ہی ان کے متعلق کچھ بتا سکے گی۔''

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''سمیرا کو سب سے زیادہ اکبر پاشا پر شبہ ہے جو اس کا باپ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں نہ ہم پہلے اکبر پاشا کا ہی محاسبہ کریں۔ وہ اس طرح کہ اس کا پتہ معلوم کرنے کے بعد کسی طرح اسے گھیر کر اس پر تنویمی عمل کیا جائے۔ جب وہ ہمارے زیر اثر آ جائے گا تو تم اس کے دماغ کے اندر چھپی ہوئی تمام باتیں معلوم کر لو گے۔ اس طرح یہ حقیقت کھل جائے گی کہ وہی قتل کرنا چاہتا ہے یا بے گناہ ہے۔''

سامری نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''تمہارا آئیڈیا اچھا ہے لیکن تنویمی عمل کرنے سے پہلے اپنے معمول کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کا مزاج کیسا ہے اور وہ کتنی قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ جو لوگ سخت مزاج ہوتے ہیں اور ارادوں کے پکے ہوتے ہیں، ان پر بڑی مشکل سے تنویمی عمل کا اثر ہوتا ہے۔ پہلے ان کے اعصاب کو کمزور بنانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ

زیر اثر آتے ہیں۔ بہرحال اکبر پاشا کا پتہ معلوم ہو گا، تو دیکھیں گے کہ اسے کیسے گھیرا جا سکتا ہے اور کس طرح اس کے اعصاب کو کمزور بنایا جا سکتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''سمیرا سے کہاں ملاقات کرنا مناسب ہو گا؟''

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہوں! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ سمیرا کی نظروں میں جو لوگ مشکوک ہیں انہیں تمہاری ملاقات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات پہلے میرے دماغ میں آتی تو میں تنویمی عمل کے دوران سمیرا رحمان کو حکم دیتا کہ وہ فلاں وقت، فلاں جگہ پہنچ کر تم سے ملاقات کرے۔ تب وہ بیدار ہونے کے بعد غیر شعوری طور پر اسی جگہ تم سے ملاقات کرنے پہنچ جاتی۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بڑے کمال کا علم ہے۔ تم تو بڑی آسانی سے کسی کو بھی کہیں بھی ملاقات کے لئے بلا سکتے ہو۔''

وہ بولا۔ ''یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ کسی بھی عورت پر زبردستی تنویمی عمل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ تنویمی عمل کے لئے خود ذہنی طور پر مائل نہ ہو۔ جن پر جبراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ان کے اعصاب کو کمزور بنانا پڑتا ہے اور یہ ایک مشکل کام ہے۔ میں دیکھوں گا کہ تم اکبر پاشا کو کس طرح میرا شکار بنا کر لاتے ہو۔''

''یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اکبر پاشا کو کوئی بھی اعصاب شکن دوا دھوکے سے کھلائی جا سکتی ہے۔''

''بیشک دوا کھلائی جا سکتی ہے لیکن کھلائے گا کون؟ بات تو وہی ہوئی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟''

''میں باندھوں گا۔ ذرا وقت آنے دو۔''

☆======☆======☆

بیرسٹر لیلیٰ محسن ایک نوجوان بیوہ تھی۔ حسین بھی تھی اور ذہین بھی۔ بیرسٹروں کی ایسوسی ایشن سے لے کر عدالتِ عالیہ کے کمرے تک اس کی ذہانت اور شخصیت کا رُعب و دبدبہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک عورت تھی۔ اوپر سے پتھر اور اندر سے پھول تھی۔ اس کے مزاج میں سختی اور سنجیدگی تھی لیکن میرے لئے ذرا شوخ ہو چلی تھی۔ مغرور اور سربلند تھی اور دل کے ہاتھوں محبت کی دہلیز پر بھی جھک رہی تھی۔

جب میں نے اسے سمیرا کی داستان سنانے کے بعد کہا کہ میں اس سے ملنے والا

ہوں۔ تو اس نے فوراً ہی عورتوں والا سوال داغ دیا۔

"کیا وہ خوبصورت ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں، بالکل نہیں۔ بس ایک معمولی صورت وشکل کی عورت ہے۔"

"کیا نوجوان ہے؟"

"نوجوان تو نہیں، ہاں جوان ہے۔ شادی شدہ ہے۔ سُنا ہے، ایک بچے کی ماں ہے۔"

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

میں نے بیزار ہو کر کہا۔ "ارے! میں کوئی تمہارا شوہر ہوں کہ تم مجھ پر پابندی عائد کر رہی ہو۔"

وہ بولی۔ "اے، مجھے گھور کر نہ دیکھو۔ کیا میں تمہاری بیوی ہوں کہ تمہاری دھونس میں آؤں گی۔"

"دیکھو لیلیٰ! میں سمیرا سے تنہا مل سکتا ہوں۔ اگر تم بھی میرے ساتھ چلو گی تو بات پھیلتی چلی جائے گی۔ میں سمیرا سے ہونے والی ملاقات کو راز میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا! تو رازدارانہ ملاقاتیں شروع ہو رہی ہیں۔"

"تمہارے ایسے سوالات سن کر سمجھ میں آ رہا ہے کہ تمہارے مرحوم شوہر محسن صاحب کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔"

اُس نے گھور کر پوچھا۔ "کیا ہوا ہوگا؟"

میں نے کہا۔ "راوی بیان کرتا ہے کہ ایک بار ملک الموت مرحوم محسن صاحب کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "حضرت! زندہ رہنا چاہتے ہو یا منکر نکیر کے سوالات کے جواب دینا چاہتے ہو۔ اسی وقت مرحوم نے وفات پا جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تمہارے سامنے بیٹھ کر سمجھ رہا ہوں کہ شوہر لوگوں کو منکر نکیر کے سوالات آسان کیوں لگتے ہیں۔"

"اے، میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ تم میرے مرحوم شوہر کا لطیفہ بنا رہے ہو؟"

"میں نہیں بنا رہا تھا۔ دانشمندوں نے کہا ہے کہ تین بار قبول کہنے سے پہلے دنیا کی تمام بیویوں اور شوہروں کے متعلق رہنما لطیفے پڑھ لو۔ پھر دنیا کی کوئی عورت تمہیں شوہر بننے پر مجبور نہیں.......... کر سکے گی۔"

وہ غصّے سے بولی۔ "تم بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا میں تم سے

شادی کروں گی۔ ہرگز نہیں۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

اس کے ایسا کہتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے غصہ سے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو، بیرسٹر لیلیٰ محسن۔"

دوسری طرف کی آواز سن کر وہ ذرا چپ ہوئی۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ پھر فون پر پوچھا۔ "مسٹر سامری! ذرا یہ تو بتائیے، یہ سمیرا کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے۔ کیا حسین ہے؟ جوان ہے یا شادی شدہ اور بچوں کی ماں ہے؟"

وہ جواب سننے لگی اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ میں وہاں سے پلٹ کر جانا چاہتا تھا۔ وہ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "رُک جاؤ۔ کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے پلٹ کر کہا۔ "تم نے ابھی نکل جانے کے لئے کہا تھا مجھے نکل جانے دو۔"

میں پھر پلٹ کر جانے لگا، وہ بولی۔ "سامری وہ جگہ بتا رہا ہے، جہاں تم سمیرا سے ملاقات کر سکو گے۔"

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میں کسی حسین اور نوجوان دوشیزہ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا۔ میری نظروں میں تو ایک ہی صورت سمائی ہوئی ہے۔"

ایسا کہتے ہوئے میں نے دروازے کے پاس سے گھوم کر لیلیٰ کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر وہاں سے گھوم کر دروازے کو بند کرتے ہوئے کوٹھی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد میں نے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ کے قریب گاڑی روکی۔ بوتھ کے اندر جا کر پروفیسر سامری سے رابطہ قائم کیا۔ ریسیور کو کان سے لگائے دوسری طرف کی آواز سننے کا انتظار کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی جا رہی تھی۔ کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ آخر میں نے جھنجھلا کر ریسیور رکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ آواز آئی۔ "ہیلو!"

"میں ابنِ شہاب بول رہا ہوں۔ اتنی دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ تم کیا کر رہے تھے؟"

"وہ.......... یہ.......... دراصل بات یہ ہے کہ میں تمہارے فون کی توقع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی میں نے بیرسٹر لیلیٰ محسن کو سمیرا کا پتہ یعنی ملاقات کی جگہ بتا دی ہے۔ میں نے سوچا۔ پتہ نہیں اس وقت کون فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اہمیت نہیں دی۔ مسلسل گھنٹی بجنے سے پریشان ہو کر میں نے ریسیور اٹھایا۔ بہر حال بولو کیا بات ہے؟"

"وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں، سمیرا سے کہاں ملاقات ہوگی؟"

''یہ تو میں نے بیرسٹر صاحبہ کو بتا دیا ہے۔ شیر کے پنجرے کے پاس سمیرا ٹھیک پانچ بجے انتظار کرے گی۔''

''شیر کے پنجرے کے پاس اور دو چار عورتیں ہوں تو میں کیسے پہچانوں گا۔ سمیرا کو میں نے روشن دان سے جھانک کر دُور سے دیکھا ہے۔ جب تم اسے ٹرانس میں لے رہے تھے۔ دُور سے دیکھنے کی بات اور ہے۔ شاید میں اچھی طرح پہچان نہ سکوں۔ کوئی اور نشانی بتاؤ۔''

وہ ذرا دیر کے لئے چپ ہوا۔ فون بالکل خاموش تھا۔ جیسے اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا ہو۔ پھر اس نے جواب دیا۔ ''سمیرا کالے بارڈر کی گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہوگی۔''

میں نے ایک لمحہ ذرا چُپ رہ کر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''سمیرا کیا ٹھیک چھ گھنٹے بعد بیدار ہوگئی تھی؟''

''ہاں، میں اپنے کسی بھی معمول کو جو حکم دیتا ہوں، وہ اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ سمیرا ٹھیک چھ گھنٹے کے بعد بیدار ہوگئی تھی۔''

''کیا' تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ہے؟''

''نہیں۔ اس نے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا تھا۔ تب میں نے اسے بتایا کہ تم اصل قاتل کو ڈھونڈ نکالنے کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتے ہو۔ وہ سرِ عام تم سے ملاقات نہیں کرسکتی لیکن چُھپ کر ملاقات کرنے کی بھی ایسی کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آئی۔ لہٰذا چڑیا گھر مناسب رہے گا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ شیر کے کٹہرے کے سامنے کھڑی رہے گی۔''

''سامری! تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں اسے جانتا ہوں اور اسے ٹرانس میں لانے کے دوران وہاں قریب ہی موجود تھا۔ اگر تم اسے یہ نہ بتاتے تو وہ اپنے معاملات کے سلسلے میں میرے ساتھ مل بیٹھنے کے لئے اتنی جلدی آمادہ نہ ہوتی۔''

وہ فون پر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم ٹھیک سمجھے۔ میں نے بتایا اسے بتا دیا ہے کہ تم اس کے اندرونی حالات معلوم کرچکے ہو۔ کیا مجھے نہیں بتانا چاہئے تھا؟''

''نہیں بتانا چاہئے تھا۔ ویسے تم نے بیرسٹر صاحبہ کو یہ تو نہیں بتایا کہ سمیرا مجھ سے ملنے کے لئے گلابی ساڑھی پہن کر آئے گی۔''

''بیرسٹر صاحبہ نے سمیرا کی شناخت پوچھی ہوتی تو میں یہ بتا دیتا۔ ویسے یہ سوال تم نے

کیوں کیا؟''

''بس یونہی۔ یوں سمجھو کہ بیرسٹر صاحبہ گلابی رنگ ناپسند کرتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ کوئی مجھ سے گلابی ساڑھی پہن کر ملے۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ فی الحال خدا حافظ۔''

یہ کہہ کر میں نے ریسیور کو ہک سے لٹکا دیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا' فون پر ہونے والی اس گفتگو پر غور کرتا رہا۔ پھر بوتھ سے باہر آکر کار میں بیٹھا اور پانچ بجے تک وقت گزارنے کے لئے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ سمیرا کو چاہنے اور نہ چاہنے والوں کی فہرست میرے ذہن میں تھی۔ جمشید' ظفر' قادر جان اور اکبر پاشا۔ ان چاروں میں سے کوئی ایک قاتل ہوسکتا تھا۔ سمیرا کسی پر برائے نام شبہ کررہی تھی اور کسی پر اسے یقین کی حد تک شبہ تھا لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ جس پر معمولی سا شبہ ہوتا ہے' وہی بعد میں اصل مجرم ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے میں کسی کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ٹھیک پانچ بجے میں شیر کے کٹہرے کے سامنے پہنچا۔ وہ کالے بارڈر والی گلابی ساڑھی نظر آگئی۔ وہ ایسی ساڑھی تھی کہ ساری کی ساری گلاب کی طرح کھِل رہی تھی۔ شیر کے کٹہرے کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑی ہوئی تھی۔ آنے جانے والوں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے ان میں مجھے پہچان لینے کی کوشش کررہی ہو۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ''ہیلو! مجھے ابنِ شہاب کہتے ہیں اور تم یقیناً سمیرا رحمان ہو۔''

اس نے بڑے تکبر سے مجھے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں سیدھی میرے دل میں اتر رہی ہیں اور مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی قوت تھی جیسے قدرت حسین عورت کو عطا کرتی ہے۔ میں چند لمحوں کے لئے اس کے حسن میں کھو گیا۔ سحرزدہ ہوگیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر کسی معمول کے سامنے کھڑی ہو کر یہ کہے کہ تم میری آنکھوں سے متاثر ہو رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہیں تم سو رہے ہو اور تم میرے احکامات کے پابند ہو تو یقیناً اس کے سامنے کھڑا ہوا کوئی بھی شخص اس کا پابند ہوجائے گا۔ اس کا غلام بن کر رہ جائے گا۔ کچھ ایسا ہی حاکمانہ حسن اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

وہ ذرا ناگواری سے بولی۔ ''ہاں' میں سمیرا رحمان ہوں لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ

کوئی مجھے تم کہہ کر مخاطب کرے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی کو دولت منداور غریب دیکھ کر مخاطب نہیں کرتا ہوں۔ عمر کا لحاظ کرتا ہوں۔ تم چونکہ سمیرا رحمان کہلاتی ہو اور رحمان تمہارے مرحوم والد کا نام ہے اس لحاظ سے تم غیر شادی شدہ ہو اور مجھ سے کم عمر ہو۔ میں تمہیں آپ کہہ کر کیسے مخاطب کرسکتا ہوں۔''

وہ اپنی دھیمی آواز میں ذرا سختی پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر سامری کہہ رہے تھے کہ تم نے میرے ٹرانس میں آنے کے بعد میری پوری داستان سنی ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ظفر سے میری شادی ہو چکی ہے۔ میں غیر شادی شدہ نہیں ہوں۔ میں کسی کی بیوی ہوں۔ مجھے ادب سے مخاطب کرنا چاہئے۔''

''اگر تم ظفر کی بیوی ہو تو تمہارے نام کے ساتھ سمیرا ظفر ہونا چاہئے' سمیرا رحمان نہیں۔ پہلے خود اس بات کا فیصلہ کرلو کہ کنواری رہنا پسند کرتی ہو یا شادی شدہ کہلانا چاہتی ہو۔ جب فیصلہ کرلو تو اسی کے مطابق میں تمہیں مخاطب کروں گا۔ ابھی تو تم ہی چلنے دو۔''

اس نے مجھے دیکھا۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھنے لگا تو اس نے نظریں جھکالیں' پھر آہستگی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے تم ہی سہی لیکن میں زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کروں گی۔ ہم ضروری باتیں کریں گے اور فوراً ہی رخصت ہو جائیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم یہاں اس پبلک پلیس میں آئی ہو۔ کیا ظفر جمشید' قادر جان یا وہ اکبر پاشا' ان میں سے کوئی تمہارا تعاقب نہیں کر رہا ہوگا کوئی تمہیں اس وقت میرے ساتھ نہیں دیکھ رہا ہوگا۔''

''میں کوئی جاسوس تو نہیں ہوں کہ کسی تعاقب کرنے والے کا دھیان رکھوں یا اسے پکڑلوں۔ ہوسکتا ہے' کوئی میرے پیچھے یہاں تک چلا آیا ہو لیکن میں آخر کہاں تک چھپتی پھروں گی؟ تم سے ملنا بھی ضروری تھا اور اس سے بہتر جگہ ملنے کے لئے نہیں ہوسکتی تھی۔ تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔''

''میں اکبر پاشا' قادر جان' تمہارا اور تمہارے سسر کا ایڈریس معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے پرس کھول کر ایک چھوٹا سا تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ پھر اسے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں تمام پتے دَرج ہیں لیکن تم اُن سے مل کر کیا باتیں کرو گے؟''

''میں انہیں سمجھاؤں گا کہ ہم سب مسلمان ہیں اور مسلمان اپنے بھائی کو یا بہن کو قتل نہیں کرتا۔ ہمیں پانچ وقت کی نماز پڑھنا چاہئے' روزہ رکھنا چاہئے۔ اسلام نے جن راہوں پر چلنے کے لئے کہا ہے۔ ہمیں انہی راہوں پر چلنا چاہئے۔۔۔''

وہ گھور کر بولی۔ ''یہ کیا بکواس ہے۔ کیا تمہارے سمجھانے سے وہ لوگ سمجھ لیں گے۔''

''ہر انسان کو صرف اپنے متعلق سوچنا چاہئے کہ کیا اسے سمجھایا جائے تو وہ سمجھ لے گا۔ مثلاً تمہیں سمجھایا جائے کہ اتنی بھڑکدار گلابی ساڑھی پہن کر اپنے رُوپ کے جلوے دکھاتی نہ پھرو۔ برقعہ پہنا کرو۔ چادر اور چار دیواری کی حُرمت کا پاس رکھو۔ کیا تم اتنی اچھی باتوں پر عمل کرو گی؟''

وہ ایک دم سے بپھر کر بولی۔ ''تم کوئی نارمل آدمی نہیں' پاگل ہو۔ میں حیران ہوں کہ مسٹر سامری نے میرے معاملات میں تمہارا انتخاب کیسے کیا؟ میں اس سے ضرور پوچھوں گی۔''

''مسٹر سامری نے سوچ سمجھ کر ہی میرا انتخاب کیا ہے۔ اب میری بات تمہیں بری لگتی ہے تو یہ اور بات ہے۔ بہر حال میں یہ کام ہی کی باتیں کر رہا ہوں۔ ابھی میں تم سے ایک سوال اور کروں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

پہلے تو اس نے گھور کر دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں کہا۔ ''دیکھو میں تمہیں آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ اگر تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی تو میں اس وقت چلی جاؤں گی اور تمہیں اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''اچھی بات ہے۔ میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے نام لیوا شوہر مسٹر ظفر کس برانڈ کا سگریٹ پیتے ہیں؟''

اس نے پہلے تو تعجب سے مجھے دیکھا۔ پھر گھور کر پوچھا۔ ''یہ کیسا سوال ہے؟ اس سے تم کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

''میں سوال کر رہا ہوں۔ تم جواب دو۔ نتیجہ نکالنا میرا کام ہے۔''

''ظفر سگریٹ نہیں پیتا ہے۔''

''چلو، ظفر نہ سہی۔ قادر جان تو پیتا ہوگا۔''

''میں اس سے سخت نفرت کرتی ہوں۔ وہ سگریٹ کیا زہر بھی پیئے تو میری بلا سے۔''

"اس کا مطلب یہ ہے کہ قادر جان سے تم بالکل نہیں ملتی ہو۔ اب رہ گئے جمشید اور اکبر پاشا، جمشید سے تمہارا اسسر کا رشتہ ہے اور اکبر پاشا تمہارا باپ بننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ دونوں اگر سگریٹ پیتے ہوں گے تو تم ان سے فاصلے پر بیٹھتی ہو گی۔ قریب تو بیٹھ نہیں سکتیں؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "مجھے زیادہ نہ الجھاؤ۔ وحشت ہوتی ہے تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب بھی کس مرد کے پاس بیٹھو تو اپنا دامن سمیٹ لیا کرو۔ ساڑھی کے آنچل کو بھی اچھی طرح سمیٹ کر بیٹھا کرو نہیں تو سگریٹ کی راکھ آنچل پر گرتی ہے اور آنچل میں سوراخ ہو جاتا ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے ہڑبڑا کر ساڑھی کے آنچل کو اِدھر اُدھر سے دیکھنا شروع کیا۔ ایک جگہ سوراخ نظر آ گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی کے سگریٹ کی چنگاری سے وہ سوراخ بنا ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔ "میرا ملازم بہت ہی کم بخت ہے۔ کپڑے استری کرنے کے دوران بھی سگریٹ پیتا رہتا ہے۔ اسی نے اسے جلایا ہے۔"

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "ہم مشرقی لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں گھرانہ کیسا بھی ہو۔ کسی طبقے کی عورت ملازم سے اپنے کپڑے استری نہیں کراتی۔ کپڑے کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی کسی ملازمہ سے ہی یہ کام لے سکتی ہے یا خود کر سکتی ہے۔" سیمیرا یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ کسی ملازمہ نے اس ساڑھی پر اِستری پھیری ہے اور ایسا اس لئے نہیں کہہ سکتی تھی کہ ملازمائیں سگریٹ نہیں پیتی ہیں۔ اسی لئے اس نے ملازم کہہ دیا تھا۔

مجھے مسکراتے دیکھ کر وہ بھڑک گئی' آنکھیں دکھا کر بولی۔ "کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ تم اس طرح کیوں مسکرا رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں کسی سگریٹ پینے والے کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ تم آخر مجھے سمجھتے کیا ہو؟ میں کسی سگریٹ پینے والے کو منہ نہیں لگاتی۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا ہوں۔"

وہ غصے میں میری بات نہ سمجھ سکی۔ میں نے پوچھا۔ "بائی دی وے تم لوگوں کا کاروبار کیا ہے؟"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "پرنٹنگ پریس ہے۔"

"کیا بہت بڑا پریس ہے؟"

"ہاں! ہم سرکاری ٹھیکہ لیتے ہیں۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔"

"مگر تم ٹرانس میں آنے کے بعد مسٹر سامری سے کہہ رہی تھیں کہ تمہارے سسر اور تمہارے شوہر ظفر نے کاروبار میں خسارہ دکھایا تھا۔"

"جب تک میں نے شادی نہیں کی تھی' وہ کاروبار میں خسارہ دکھا رہے تھے۔ شادی کے بعد اچانک ہی سارے نقصانات ختم ہو گئے' اور منافع نظر آنے لگا۔ یہ باپ بیٹے کی چال تھی۔"

"اکبر پاشا کا دعویٰ ہے کہ وہ تمہارا باپ ہے۔ بہرحال اس کی بدمعاشی سے ظاہر ہے کہ وہ تم سے ماہانہ تگڑی رقم وصول کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تمہیں قتل کر دے گا تو اس کا فائدہ کیا ہو گا۔ وہ تو سراسر نقصان میں رہے گا۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یقین کی حد تک اسی پر شبہ ہے۔"

"اسی لئے کہتی ہوں کہ وہ ایک جھنجلایا ہوا شخص ہے اور ایسے آدمی کسی کو قتل کرتے وقت اپنا فائدہ نہیں دیکھتے۔ سوچتے ہیں کہ خود فائدہ نہ اٹھا سکے تو دوسرا بھی مال و دولت سے اور زندگی کی مسرتوں سے محروم رہے۔ شاید وہ یہی چاہتا ہو۔"

"اچھا تو سارا زور اکبر پاشا پر ہے وہی تمہیں قتل کر سکتا ہے۔"

"میں یقین سے یہی کہہ سکتی ہوں۔ وہ بہت کمینہ انسان ہے۔ ایک طرف بیٹی بیٹی کہتا ہے' خوشامدانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف دل میں کینہ رکھتا ہے۔ اس نے مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ اسے فائدہ نہ پہنچا تو وہ مجھے بھی فائدہ اٹھانے نہیں دے گا۔"

"کچھ قادر جان کے بارے میں بتاؤ۔"

"وہ ایک بہت منجھا ہوا باکسر ہے۔ اس سے سوچ سمجھ کر باتیں کرنا ورنہ ایک ہی گھونسے میں تمہیں سُلا دے گا۔"

"میری فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم اس سے متاثر کیوں ہوئیں؟ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں ایک عورت ہوں۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے چہرے میں' اس کی شخصیت میں اس کی باتوں میں مردانگی بہت زیادہ ہے۔"

"اگر میں ابھی جا کر اسے ایک گھونسے میں سُلا دوں' تو کیا تم میری مردانگی سے متاثر

ہو جاؤ گی۔‘‘

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے کہا۔ ’’ایسے نہ دیکھو‘ میں سمجھتا ہوں کہ مرد تو سبھی ہوتے ہیں۔ کسی میں مردانگی ظاہر ہو جاتی ہے۔ کوئی اپنی مردانگی کو شرافت کے پردے میں چھپائے رکھتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں خاص بات کیا تھی یا کیا ہے۔ جس سے تم متاثر ہوئیں۔‘‘

وہ ناگواری سے منہ پھیر کر بولی۔ ’’بس یونہی وہ مجھے اچھا لگا۔ میری ہر بات مان لیتا ہے۔ ذرا موٹے دماغ کا آدمی ہے۔ جیسے سمجھاتی ہوں سمجھ لیتا ہے۔‘‘

’’اچھا! تو اس میں شوہر بننے کی خوبیاں موجود ہیں۔‘‘

’’کام کی باتیں کرو۔‘‘

’’میں بھی پیدائشی شوہر ہوں۔ آئندہ کب اور کہاں ملاقات کرو گی؟ میں اپنی خوبیاں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

وہ ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’تم جس انداز میں گفتگو کرتے ہو‘ اس طرح کسی بھی لڑکی کا دل نہیں جیت سکو گے۔ جا کر آئینے میں اپنی صُورت دیکھو اور باتیں کرنے کا ڈھنگ سیکھو۔‘‘

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ میں نے اسے نہیں روکا۔ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ لوگوں کی بھیڑ میں گم ہونے لگی تو میں نے اس تہہ کئے ہوئے چھوٹے سے کاغذ کو کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ جس میں مشکوک افراد کے پتے لکھے ہوئے تھے۔ فون نمبر بھی دَرج تھے۔

اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ایک اچھا خوبرو نوجوان مجھے دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے کہا۔ ’’میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ پر نظر پڑی۔ مجھے لگتا ہے میں آپ سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں۔ میری یادداشت بہت کمزور ہے کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ہم کہاں ملے تھے؟‘‘

میں نے اُسے دیکھتے ہوئے اور سر کھجا کر سوچتے ہوئے کہا۔ ’’ہم بھی خوب ملے ہیں۔ اتفاق سے میری یادداشت بھی کمزور ہے آیئے ہم تھوڑی دُور سوچتے چلیں۔ قریب ہی ایک پان سگریٹ کی دکان ہے‘ سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔ میں آپ کو بھی آپ کی پسند کا سگریٹ پلاؤں گا۔‘‘

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ’’سوری! میں سگریٹ نہیں پیتا۔‘‘

یہ سنتے ہی میں نے اچانک اس کی طرف پلٹ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’آہا‘ ظفر صاحب! یاد آ گیا کہ ہم کب اور کہاں ملے تھے؟‘‘

میں نے اچانک ہی اس انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ بے اختیار اس نے بھی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر بوکھلا کر پوچھا۔

’’آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا؟‘‘

’’میری یادداشت واپس آ گئی ہے۔ ہم پچھلے سال ہونولولو میں ملے تھے۔‘‘

وہ انکار میں سر جھٹک کر بولا۔ ’’کبھی نہیں۔ میں ملک سے باہر کبھی نہیں گیا۔‘‘

’’ارے جانے بھی دیجئے! آپ کی یادداشت تو کمزور ہے۔ آپ کو کیا یاد رہے گا کہ آپ کبھی ملک سے باہر گئے تھے یا نہیں۔‘‘

وہ جھینپ کر بولا۔ ’’آپ بہت گہرے آدمی ہیں۔ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ شاید سمیرا نے میرا حلیہ بتا دیا تھا۔‘‘

’’سمیرا تمہاری کون ہے؟‘‘

’’وہ میری بیوی ہے۔ میں معلوم کرنے آیا ہوں کہ وہ کس سلسلے میں آپ سے ملاقات کرنے آئی تھی؟‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہاں ہماری ملاقات ہو گی؟‘‘

’’مجھے پہلے سے نہیں معلوم تھا۔ اس کا تعاقب کرنے کے بعد میں نے آپ دونوں کو یہاں دیکھا۔‘‘

’’اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اکثر اپنی بیوی کا تعاقب کرتے رہتے ہو۔ تمہیں اس پر شبہ ہے۔‘‘

’’دیکھیں! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ آپ خود سوالات کر رہے ہیں۔‘‘

’’میرا پیشہ ہی ایسا ہے کہ میں سوالات کرتا ہوں اور جواب حاصل کرتا ہوں۔ پھر ان جوابات کی روشنی میں کسی مجرم تک پہنچتا ہوں۔‘‘

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ’’کیا آپ جاسوس ہیں؟‘‘

’’جاسوس تو نہیں ہوں مگر یہ کام کرتا ہوں۔ اب میرے سوال کا جواب دو۔ کیا تمہیں اپنی بیوی پر کسی سلسلے میں شبہ ہے؟‘‘

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہاں! میں اکثر سوچتا ہوں کہ میری بیوی معمولی شکل وصورت کی ہوتی اور ایک گھریلو زندگی گزارنے والی عورت ہوتی تو میں کتنا خوش نصیب ہوتا۔ حد سے زیادہ حسین عورت مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کے ہزاروں دیوانے پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ گھر سے باہر پھسلنے لگتی ہے۔ میں اسی لئے اس کا پیچھا کرتا رہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کن لوگوں سے ملتی ہے اور اس کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں؟''

''اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ سمیرا کا کردار اچھا نہیں ہے اور وہ تمہارے اعتماد کو دھوکہ دے رہی ہے۔ تب تمہارا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کیا تم اسے چھوڑ دوگے؟''

وہ چپ چاپ چند قدم تک چلتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ''نہیں شاید میں اسے مرتے دم تک نہ چھوڑوں۔ پتہ نہیں' اس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ وہ بہت اچھی ہے۔ حسین اور پُرکشش ہے۔ اپنی اداؤں سے دل جیت لیتی ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا ایسی عورت میں نے نہ تو کبھی دیکھی ہے نہ دیکھوں گا۔''

''جب تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسے چھوڑ نہیں سکتے تو پھر اس کے ذاتی معاملات کو کریدنے سے کیا فائدہ۔ کیوں تعاقب کرتے ہو؟''

''میں سوچتا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے لیکن دل نہیں مانتا۔ یہ دل کہتا ہے کہ میری سمیرا معصوم اور بھولی بھالی ہے۔ دوسرے مرد اسے بہکاتے ہیں۔ اگر کبھی بہکانے کا ایسا وقت آئے گا۔ تو میں عین وقت پر اس کے سامنے پہنچ جاؤں گا اور اپنی سمیرا کو ان شیطانوں کے پنجے سے چھڑا کر پھر اپنی زندگی میں واپس جاؤں گا۔''

مجھے ظفر کی حماقت پر ہنسنا چاہئے تھا۔ پتہ نہیں یہ مرد شوہر بننے کے بعد احمق کیوں بن جاتے ہیں۔ انہیں اپنی ماں اور بہنوں سے زیادہ بیوی معصوم اور بے قصور نظر آتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی تیز طرار کیوں نہ ہو۔ سمیرا کے متعلق میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس حد تک تیز طرار ہے اور کتنوں کو بیوقوف بنا رہی ہے لیکن بیوی کی حیثیت سے وہ قابلِ اعتبار نہیں تھی۔ اس کے ایک نہیں ہزاروں پروانے تھے۔ وہ کتنوں کے لئے جلتی ہوگی اور کتنوں کو جلاتی ہوگی۔ ابھی اس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ میں اسے دیکھنے کے بعد اندازے سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے اندر جادو بھرا ہوا ہے۔ ایسے ایک نہیں کئی ہوں گے جو اس کے عشق میں ناکام ہو کر اور جھنجھلا کر اسے قتل کر دینا چاہتے ہوں گے۔ اس پر اگر دو بار حملہ ہوا تھا تو کم ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا سمیرا پر دو بار قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔''

اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں اسی لئے میں اور گھبراتا ہوں۔ وہ تنہا باہر نکل جاتی ہے۔ میری بات نہیں مانتی اور اِدھر میرا دل نہیں مانتا تو میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں۔''

''تمہارا شبہ کس پر ہے؟''

''میرا ایک رقیب ہے جو ہماری شادی سے پہلے سمیرا سے محبت کرتا تھا۔ وہ عشق میں ناکام ہو گیا ہے۔ اس لئے سمیرا کا جانی دشمن بن گیا ہے۔''

''اور کوئی شخص جس پر تمہیں شبہ ہو؟''

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا' پھر انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''میں اور کسی کو نہیں جانتا۔''

اس کی یہ بات درست معلوم ہوئی۔ کیونکہ جو اکبر پاشا سمیرا کا باپ بننے کا دعویٰ کر رہا تھا وہ ظفر اور جمشید سے چھپا ہوا تھا۔ سمیرا نے اس کے متعلق ان باپ بیٹوں کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا سمیرا کے دل میں اب بھی قادر جان کے لئے کوئی جگہ ہوگی؟''

''بالکل نہیں۔ قادر جان تو زبردستی آسیب بنا ہوا ہے۔ میں اور سمیرا ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیار کرتے آ رہے ہیں۔ میرے اور اس کے والد بہت پرانے دوست تھے۔ پھر بزنس پارٹنر بن گئے تو دوستی اور مستحکم ہو گئی۔ ہماری شادی کے بعد تو اب یہ ناقابلِ شکست رشتہ ہو گیا ہے۔''

''مجھ سے پہلے سمیرا اب تک کن لوگوں سے ملتی رہی ہے۔ چونکہ تم تعاقب کرتے رہے ہو۔ اس لئے تمہاری معلومات بہت زیادہ ہوں گی۔''

اس نے کہا۔ ''قادر جان سے دو بار مل چکی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔ اچانک ہی اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ورنہ وہ دانستہ اس سے ملنے نہیں جاتی۔ میں اس کی زبان پر بھروسہ کرتا ہوں۔ دوسرا شخص ایک پروفیسر سامری کہلاتا ہے میں نے اس سے بھی اسے ملتے دیکھا ہے۔''

میں نے انجان بن کر کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ پروفیسر سامری ہپناٹزم کا ماہر ہے۔''

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا واقعی! اس کا مطلب تو یہ ہے کہ سمیرا اس کے پاس کوئی عمل کرانے جاتی ہے۔''

"تمہارے دماغ میں یہ بات کیوں آئی کہ وہ عمل کرانے ہی جائے گی۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں بھی اس کے خلاف عمل کراتا ہوں۔"

میری دلچسپی اس سے بڑھ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کس سے عمل کراتے ہو؟ کیسے عمل کراتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "یہاں ہمارے شہر میں ایک بہت بڑا عامل ہے۔ اس کا نام حیات پاشا ہے۔ میں نے اس کے پاس جا کر اپنا دُکھڑا سنایا تھا اور کہا تھا کہ میں اپنی حسین بیوی کو صرف اپنے ہی دائرۂ اختیار میں رکھنا چاہتا ہوں' کوئی ایسا عمل کیا جائے کہ وہ کسی دوسرے نہ ملے۔ صرف میری ہو کر رہے۔"

ہم ایک اوپن ریستوران میں کھلی فضا میں پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک کرسی کھینچ کر میز کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹھو! عامل حیات پاشا نے یقیناً سمیرا کے متعلق تمہیں ایسی باتیں بتائی ہوں گی کہ تمہارا سکون مزید برباد ہو گیا ہو گا۔ تم اور زیادہ اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہاں! اس عامل نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ پہلے تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ میں معلومات کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی عامل سے ملتی ہے یا نہیں۔ ابھی آپ کی زبان سے پروفیسر سامری کا پتہ چلا ہے۔ مجھے عامل حیات پاشا کی بات سچ نظر آرہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میری بیوی میرے خلاف عمل کرا رہی ہے۔ مجھے اس نے سحرزدہ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے میں اس کی ہر بات مان لیتا ہوں اور اس کے کسی حکم سے انکار نہیں کرتا۔"

"عامل حیات پاشا نے تم سے کس قسم کے سوالات کئے تھے؟"

اس نے پہلے دو تین سوال کئے۔ جب میں نے جواب دیئے تو وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "تم بیوی کے غلام ہو' اس لئے صحیح جواب نہیں دے سکو گے۔ میں تم پر عمل کروں گا۔ تم ٹرانس میں آؤ گے۔ میرے معمول بنو گے تب تمہارے دماغ کے چور گوشوں سے صحیح جوابات ملیں گے۔ اس نے دوسرے دن مجھے ناشتہ کئے بغیر خالی پیٹ اپنے گھر آنے کے لئے کہا۔ جب میں وہاں گیا تو اس نے مجھے ایک بستر پر لٹا دیا۔ پتہ نہیں اس نے کیا کیا کہ میں اس کی آنکھوں میں گم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے میرے دماغ سے صحیح معلومات حاصل کی

ہیں۔"

"مثلاً کیسی معلومات حاصل کی ہیں؟"

وہ ذرا ہچکچایا' پھر بولا۔ "اس نے جو کچھ بھی کہا ہے۔ میں اسے بکواس سمجھتا ہوں۔ صرف ایک ہی بات ابھی درست نکلی ہے کہ سمیرا پروفیسر سامری کے ذریعے عمل کرا رہی ہے۔"

"یہ تو تم کہہ چکے ہو۔ عامل حیات پاشا نے جو بکواس کی ہے وہ میں سُننا چاہتا ہوں۔"

وہ کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ پھر میز پر جھک کر بولا۔ "وہ مجھے قاتل ثابت کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے میز پر جھک کر تعجب سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ کیسے ثابت کرنا چاہتا ہے؟"

"وہ بکواس کر رہا تھا کہ میں سمیرا کو دہشت زدہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے اس پر قاتلانہ حملے کرتا ہوں مگر اسے قتل نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔ دہشت زدہ اس لئے کرتا ہوں کہ وہ آزادی سے گھومنا پھرنا بند کر دے اور صرف میرے ہی پاس رہا کرے۔ یہ بات عامل حیات پاشا نے مجھے ٹرانس میں لانے کے بعد میرے دماغ سے معلوم کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم ان معلومات کو بکواس کیوں کہہ رہے ہو' جبکہ سمیرا پر دو بار قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ مجھ پر الزام عائد کیا جا رہا ہے۔ میں کبھی سمیرا کو دہشت زدہ نہیں کر سکتا۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے۔ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے وہ عامل میرے کاندھے پر بندوق رکھ کر کسی دوسرے کے ذریعے سمیرا پر قاتلانہ حملے کرا رہا ہے۔"

"حیات پاشا کو تم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے کوئی میرا دشمن ہے جسے میں پہچان نہیں سکتا۔ وہ مجھے سمیرا کے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قادر جان ایسا کر رہا ہو۔ اس نے عامل حیات پاشا کو اچھی خاصی رقم دی ہو' اسے اپنی مٹھی میں لے رکھا ہو اور اس کے ذریعے مجھے پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتا ہو۔"

میں نے پوچھا۔ "تم سمیرا پر صرف دہشت زدہ کرنے کے لئے قاتلانہ حملے کر رہے

ہو جیسا کہ حیات پاشا کہتا ہے۔ تو پھر تم قاتل تو نہیں کہلاؤ گے۔ تمہیں سزا تو ہوگی لیکن پھانسی کے تختے تک یہ لوگ نہیں پہنچا سکیں گے۔"

"آگے آپ نے سنا ہی نہیں۔ عامل حیات پاشا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کا معمول بن کر اپنے دماغ میں چھپی ہوئی باتیں اسے بتا رہا تھا اور میرے دماغ میں ایک بات یہ بھی چھپی ہوئی ہے کہ میں اپنے باپ کو قتل کروں گا۔"

میں نے حیرانی سے اور بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اپنے باپ جمشید کو قتل کرو گے؟"

وہ جھنجھلا کر بولا۔ "میں کیوں قتل کروں گا۔ کیا میں پاگل ہوں؟ کیا میں اپنے باپ سے نفرت کرتا ہوں۔ ہرگز نہیں لیکن وہ عامل کہتا ہے کہ میں نے اس کا معمول بننے کے دوران یہ بات اس سے کہی ہے۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

میں اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا آپ مجھ پر شبہ کر رہے ہیں؟"

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا اگر تم شبہ سے بالاتر رہنا چاہتے ہو تو میرے ایک مشورے پر عمل کرو۔ پھر ساری بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ حقیقت کیا ہے؟"

"میں ضرور آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔ میں خود چاہتا ہوں کہ بات بالکل صاف ہو جائے۔ آپ یقین کریں کہ میں پریشانی سے راتوں کو سو نہیں سکتا ہوں۔"

"تمہاری پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ میں پروفیسر سامری سے کہوں گا کہ وہ تم پر عمل کرے اور تمہیں ٹرانس میں لانے کے بعد تمہارے دماغ سے صحیح معلومات حاصل کرے۔ اگر عامل حیات پاشا نے تمہارے دماغ کو اپنے کسی حکم کا پابند بنایا ہوگا اور تم سے کوئی مجرمانہ عمل کرانا چاہتا ہوگا تو پروفیسر سامری تمہارے دماغ سے وہ ساری باتیں اگلوا لے گا، بولو! منظور ہے؟"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "مجھے منظور ہے۔ میں اپنی پریشانی دُور کرنا چاہتا ہوں۔ خواہ کسی طرح بھی دُور ہو۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی فون کر کے سامری سے تمہارے لئے کوئی وقت مقرر

کروں گا۔ پھر تمہیں اطلاع دوں گا۔ اپنا فون نمبر بتاؤ۔"

وہ اپنا نمبر بتانے لگا۔ میرے ہاتھ میں وہ تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہوا تھا جو سمیرا دے گئی تھی۔ میں نے میز کے نیچے اسے آہستگی سے کھول کر دیکھا۔ سمیرا نے اپنے گھر کا جو پتہ لکھا تھا۔ فون نمبر بھی وہی تھا، جو ظفر بتا رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "صدر کی ایک بلڈنگ میں عامل حیات پاشا کے نام کا ایک سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔ کیا تم وہیں اس سے ملنے گئے تھے؟"

"پہلی بار میں وہیں گیا تھا۔ دوسری بار اس نے عمل کرنے کے لئے مجھے اپنی رہائش گاہ میں بلایا تھا۔"

"مجھے اس کی رہائش گاہ کا پتہ بتاؤ۔"

"وہ سلطان آباد کے علاقے میں رہتا ہے۔ مسجدِ خضرا کے سامنے والی گلی میں چوتھا مکان ہے۔ مکان کے دروازے پر اکبر پاشا نام کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔"

اکبر پاشا کا نام سنتے ہی میں نے ظفر کو دیکھا۔ وہ بالکل انجان تھا یہ نہیں جانتا تھا کہ اکبر پاشا وہی ہے جو سمیرا کو بلیک میل کر رہا ہے اور حیات پاشا اسی مکان میں رہتا تھا۔ جس میں اکبر پاشا کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اب معاملہ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ کیا اکبر پاشا اور حیات پاشا ایک ہی شخص ہو سکتے ہیں۔ نام دو تھے یا پھر دونوں آپس میں رشتہ دار تھے۔ باپ بیٹے ہوں گے، یا بھائی ہوں گے۔ دونوں کے نام کے آخر میں پاشا کا لفظ آتا تھا۔ اب اکبر پاشا کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ سمیرا کا باپ بننے کا دعویٰ کر رہا تھا اور اپنی اس بیٹی کو اس بزنس کا واحد حقدار بنانے کے لئے ایک طرف تو جمشید کو قتل کرانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف ظفر کو اس کے باپ کے قتل کے الزام میں پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ عامل حیات پاشا کے علم سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ہپناٹزم کے ذریعے یا کسی اور عمل کے ذریعے ظفر کو اس نے سحرزدہ کر دیا تھا۔

ہپناٹزم کے ذریعے جو لوگ سحرزدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے عامل کے احکامات کے پابند ہو جاتے ہیں۔ وہ بظاہر نارمل نظر آتے ہیں لیکن اندر ہی اندر وہ غیر شعوری طور پر ان احکامات کے پابند رہتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر سامری نے سمیرا کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں سے قطع نظر تین وقت کھائے گی اور رات کو صبح تک آرام سے سو جایا کرے گی۔ پروفیسر سامری کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام دن نارمل رہنے کے باوجود جب کھانے کا وقت آئے گا تو غیر

شعوری طور پر ان احکامات پر عمل کرے گی، رات کو سونے کا وقت آئے گا تو انہی احکامات کے مطابق سوجایا کرے گی۔ اسی طرح ظفر کے متعلق سوچا جا سکتا تھا کہ عامل حیات پاشا نے جمشید کو قتل کرنے کے لئے اس کے دماغ میں کوئی وقت مقرر کر دیا ہوگا۔ جب وہ وقت آئے گا تو ظفر غیر شعوری طور پر اپنے باپ کو قتل کر دے گا۔ دنیا والے اسے نارمل سمجھیں گے اور وہ بے چارا خود نہیں سمجھے گا کہ وہ ہپناٹزم کا مارا تھا۔ سحرزدہ تھا اور غیر شعوری طور پر کیا کر گزرا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ تو آئے گا اور نہ ہی وہ دنیا والوں کو سمجھا سکے گا۔

ہپناٹزم یوں تو بڑا ہی خطرناک علم ہے۔ سیدھے سادے لوگوں پر عمل کے ذریعے انہیں مجرم بنا دیا جاتا ہے اور قانون کے دائرے میں اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ سب کچھ کسی عمل کے ذریعے ہوا۔ قانون تو محض ثبوت اور گواہوں کو دیکھتا ہے۔ اس علم کے منفی نتائج کے پیشِ نظر ایسے لوگوں پر پابندی عائد کر دینی چاہئے جو بڑے بڑے سائن بورڈ لگا کر لوگوں کو پھانستے ہیں اور ان پر منفی قسم کے عمل کرتے ہیں۔

سمیرا نے جو کاغذ مجھے دیا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں اکبر پاشا کا وہی سلطان آباد والا پتہ لکھا ہوا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اکبر پاشا وہی شخص ہے جو میری فہرست میں ہے اور جس سے میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد میں ظفر سے رخصت ہو کر پروفیسر سامری کے ہاں گیا۔ وہاں اس سے میں نے ظفر کے متعلق گفتگو کی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ پھر اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''تمہارا خیال درست ہے۔ اس پر بھی تنویمی عمل کر کے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ عامل حیات پاشا نے اس کے دماغ میں قتل کا کون سا وقت مقرر کیا ہے اور یہ کام جلد سے جلد ہونا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ قتل کا وقت آج یا کل کا ہو۔ میں کل صبح کا وقت دے سکتا ہوں اور ابھی سمیرا کو فون پر اطلاع دے دیتا ہوں کہ وہ ظفر کو کل صبح ناشتہ نہ کرنے دے اور خالی پیٹ میری رہائش گاہ میں لے آئے۔ ہسپتال میں تو یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سمیرا کا کیس ہسپتال والا کیس تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ اسی رہائش گاہ میں اس پر تنویمی عمل کیا جائے لیکن میں موجود رہنا چاہتا ہوں۔''

سامری نے کہا۔ ''یہ بڑی مصیبت ہے۔ میں اس عمل کے دوران کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ کوئی تیسرا شخص کمرے میں موجود نہیں رہتا۔ صرف ایک عامل اور دوسرا معمول ہوتا ہے۔ اب سمیرا بھی یہی ضد کرے گی کیونکہ وہ ظفر کے متعلق ہمیشہ اسی کھوج میں

رہتی ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا سوچتا ہے؟ کن لوگوں سے ملتا ہے؟ وہ چاہے گی کہ معمول بننے کے بعد ظفر کی زبان سے جو کچھ بھی نکلے' وہ اپنے کانوں سے سنے۔''

''تو کیا ہرج ہے؟ بھئی کسی طرح ایسے کمرے میں تنویمی عمل کا انتظام کرو جہاں میں اور سمیرا چھپ کر یہ تماشا دیکھ سکیں اور اپنے کانوں سے ظفر کی باتیں سن سکیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے دماغ سے کیا نکلتا ہے؟''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا' پھر بے بسی سے سر ہلا کر بولا۔ ''اچھی بات ہے کل میں اس کا انتظام کروں گا۔ ابھی میں سمیرا کو فون کرتا ہوں۔''

میں وہاں سے اٹھتا ہوا بولا۔ ''اب میں اکبر پاشا سے ملنے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں عامل حیات پاشا سے ملاقات ہو جائے یا ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں شخصیتیں ایک ہی ہوں۔ بہرحال میں جا رہا ہوں۔''

سامری نے اپنے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا۔ ''صبح چھ بجے تک چلے آنا تاکہ ظفر کے آنے سے پہلے تمہیں اور سمیرا کو کہیں چھپایا جائے۔''

میں نے اس کے سامنے رکھے ہوئے ایش ٹرے کو دیکھا تو اس میں بے شمار سگریٹ کے ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا تنویمی عمل کرنے والے اتنے زیادہ سگریٹ پیتے ہیں؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہمیں سگریٹ سے پرہیز کرنا چاہئے اس کی وجہ سے آواز کی کوالٹی میں فرق آجاتا ہے۔ پھر بھی احتیاط کے باوجود ایسی لت پڑ گئی ہے کہ چھٹتی نہیں ہے۔''

میں مسکراتے ہوئے اس سے رخصت ہوا۔ باہر آ کر کار میں بیٹھتے وقت میرے دماغ میں سمیرا کی ساڑھی کا آنچل لہرا رہا تھا جس میں سگریٹ کی چنگاری سے سوراخ پڑ گیا تھا۔ کیا یہ سامری کے سگریٹ سے ایسا ہوا تھا؟

میں نے کار اسٹارٹ کی۔ پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا آہستہ آہستہ......... سلطان آباد کی طرف جانے لگا۔ راستے میں سمیرا اور سامری کے متعلق کتنے ہی سوالات ذہن میں ابھرتے رہے۔ جب سمیرا مجھ سے ملنے کے لئے شیر کے کٹہرے کے پاس آئی تھی تو کیا اس سے پہلے وہ سامری کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے قریب کہ دامن داغدار ہو جاتا ہے' آنچل جل جاتا ہے۔ سگریٹ کی چنگاری آر پار ہو جاتی ہے؟

میں نے وقت کا حساب کیا۔ جب میں نے ٹیلی فون بوتھ کے اندر داخل ہو کر سامری سے رابطہ قائم کرنے کے بعد سمیرا سے ملاقات کی۔ اسی وقت سمیرا، سامری کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کیونکہ سامری نے ایک آدھ بار گفتگو کے دوران خاموشی اختیار کی تھی۔ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر یوں ہاتھ رکھ دیا تھا کہ دوسری طرف سے بالکل خاموشی رہی تھی۔ یقیناً وہ سمیرا سے پوچھ پوچھ کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ کہاں ملے گی؟ کیسے ملے گی؟ جب میں نے پوچھا کہ میں سمیرا کو کس طرح پہچانوں گا؟ اُس نے پاس بیٹھی ہوئی سمیرا کو دیکھا ہوگا۔ کالے بارڈر کی گلابی ساڑھی کو دیکھتے ہی اس نے ریسیور پر کہہ دیا تھا کہ سمیرا اس قسم کی ساڑھی پہن کر مجھ سے ملنے آئے گی۔

فون پر گفتگو کے دوران میں نے سامری سے پوچھا تھا کہ کیا سمیرا سے اس کی ملاقات ہوئی تھی؟ تب اس نے جواب دیا تھا کہ ٹرانس میں آکر بیدار ہونے کے بعد سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ صرف فون پر رابطہ قائم ہوا تھا اور فون پر ہی سمیرا نے بتایا تھا کہ وہ پانچ بجے شیر کے کٹہرے کے پاس ملاقات کرے گی۔ ایسا کہنے والے والی یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ کون سا لباس پہنے گی۔ کس رنگ کا لباس پہنے گی۔ شلوار سوٹ پہنے گی یا ساڑھی پہنے گی۔ بالوں میں کون سا پھول لگائے گی؟ کس رنگ کی لپ اسٹک ہوگی؟ ملاقات کرنے والی اتنی تفصیل کبھی نہیں بتاتی۔ پھر سامری کو کیسے معلوم ہوا تھا کہ وہ گلابی ساڑھی پہن کر آنے والی تھی؟ اس کا جواب یہی ہے کہ سمیرا اس وقت سامری کے پاس اسی ساڑھی میں موجود تھی۔

☆=====☆=====☆

میں نے سلطان آباد پہنچنے کے بعد ایک لمبا راستہ اختیار کیا تاکہ اطمینان سے سمیرا اور سامری کے متعلق سوچتا رہوں۔ اگر میں اس موجودہ کیس کو سحرزدہ کے عنوان سے سمجھنے کی کوشش کروں تو پہلے دو کردار سامنے آتے ہیں۔ ایک پروفیسر سامری، دوسرا عامل حیات پاشا۔ یہ دونوں ہپناٹزم کے ماہر تھے۔ عامل حیات پاشا ہوسکتا ہے کہ ہپناٹزم نہ جانتا ہو، کوئی دوسرا عمل جانتا ہو۔ جس کے ذریعے اس نے ظفر کو تسخیر کیا تھا۔ بہرحال یہ دونوں ایسے تھے جو سحرزدہ کر رہے تھے۔ ایک نے میری آنکھوں کے سامنے سمیرا کو اپنے عمل کے ذریعے سحرزدہ کیا تھا۔ دوسرا اپنے گھر بلا کر ظفر کو سحرزدہ کر چکا تھا لیکن اس پہلو سے ہٹ کر دیکھا جائے تو سمیرا ایک بہت زبردست عامل تھی اس کا حُسن ایسا جادو بھرا تھا کہ ایک طرف اس نے ظفر کو سحرزدہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف قادر جان اس کا دیوانہ تھا۔ تیسری طرف پروفیسر سامری اس کی قربت سے بہلتا تھا۔ یہ سب کے سب سحرزدہ تھے اور سحرزدہ کرنے والا حُسن سمیرا کا تھا۔

یہ کیس سمیرا کی مظلومیت سے شروع ہوا۔ اس پر دو بار قاتلانہ حملے کئے گئے۔ اس بات کی تصدیق ظفر سے بھی ہوگئی تھی اور حالات بھی یہی بتا رہے تھے کہ جب اکبر پاشا اور حیات پاشا ایک ہی شخص ہیں یا ایک دوسرے کے عزیز ہیں تو یقیناً اکبر پاشا یہی کوشش کر رہا ہوگا کہ ظفر کو سحرزدہ کرانے کے بعد ایک طرف تو سمیرا پر دہشت زدہ کرنے کے لئے قاتلانہ حملے کئے جائیں۔ دوسری طرف بیٹے کے ہاتھ سے باپ کو قتل کرا دیا جائے تاکہ باپ بیٹے اس بزنس سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں اور سمیرا اس کاروبار کی واحد مالک ہو اور اس سے وہ فائدہ بھی حاصل کرتا رہے۔

سمیرا اب کسی طرح مظلوم نہیں رہی تھی کیونکہ اسے قتل کرنے سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اب اسے جان کا خطرہ نہیں تھا۔ دہشت سے نیند نہیں آتی تھی، بھوک نہیں لگتی تھی۔ اس کا علاج سامری نے تنویمی عمل کے ذریعے کر دیا تھا۔ اب جو ہستی مظلوم نظر آ رہی تھی۔ وہ

ظفر تھا۔ ظفر کو تسخیر کرنے کے بعد اس کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ باپ کا قاتل بن کر پھانسی کے تختے تک پہنچ جائے گا اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے سب سے زیادہ توجہ ظفر پر دینی چاہئے اور میں جو کچھ بھی کروں جتنی چھان بین ہو' جتنے لوگوں سے میں ملاقات کروں تو ظفر کو خاص اہمیت دیتا رہوں۔

رات کے نو بجے میں نے اپنی کار اکبر پاشا کے مکان کے سامنے روکی۔ پھر کار سے اتر کر اس کے دروازے پر گیا۔ وہاں کال بیل کا بٹن نہیں تھا۔ میں نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں مسٹر اکبر پاشا اور حیات پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس بوڑھے نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا' پھر کہا۔ ''فرمائیے میں اکبر پاشا آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔''

میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام ابنِ شہاب ہے۔ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں رسمی باتیں کرنے کا قائل نہیں ہوں کہ مصافحہ کرتے وقت یہ کہوں کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ بھلا خوشی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ میں آپ کو جانتا تک نہیں ہوں۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ کون سی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اجنبیوں کے درمیان کوئی اہم بات ہو ہی نہیں سکتی۔''

''جی ہاں! نہیں ہو سکتی۔ مگر کبھی ہو جاتی ہے۔ میں سمیرا رحمان کے سلسلے میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ' اب سمجھا۔ آپ سمیرا رحمان کی طرف سے کچھ باتیں کرنے آئے ہیں آیئے' اندر تشریف لے آیئے۔''

میں کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی زیادہ خوشحال زندگی نہیں گزار رہا ہے۔ عامل حیات پاشا عملیات کے ذریعے جو کماتا ہوگا۔ اسی سے گزارہ ہو رہا ہوگا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کے وہ حیات پاشا صاحب کہاں ہیں۔ میں ان سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ مجھ سے سمیرا کے سلسلے میں باتیں کرنے آئے ہیں' مجھ سے ملیں۔ حیات پاشا سے آپ کو کیا لینا ہے؟''

''حیات پاشا کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ جو کچھ بھی کہوں گا' آپ دونوں کے سامنے ہی کہوں گا۔''

اس نے چپ چاپ مجھے دیکھا' کچھ سوچا پھر کہا۔ ''کیا آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟''

مجھے صبح سے فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ سحرزدہ ہونے والوں کے کیس میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں آج کا اخبار نہیں پڑھ سکا۔ ویسے کوئی خاص خبر ہے؟''

''جی ہاں! یہاں شہر میں جتنے بھی نوری علم یا کالا جادو جاننے والے دکان کھولے بیٹھے ہیں' سب کی دکانوں پر چھاپے مارے گئے ہیں اور انہیں سرکار کی طرف سے بند کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاضرات کا علم جاننے والے ایک عامل نے کسی شخص کو ہدایت دی تھی کہ اسے کس قسم کا منتر پڑھنا چاہئے اور کس طرح ایک بکرے کی تازہ کلیجی لے جا کر سمندر کے کنارے عمل کرنا ہے۔ اس کے اس معمول نے عمل کرنے کے دوران کچھ غلطی کر دی' عمل الٹا ہو گیا اور اس نے اپنے ہی کسی آدمی کا خون کر دیا ہے۔ پولیس والے تمام ایسے لوگوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں جو اس قسم کے عمل کرتے ہیں۔ ان میں میرا بیٹا حیات پاشا بھی شامل ہے۔ اس کی دکان پر بھی تالا لگا دیا گیا ہے۔''

''اچھا! تو حیات پاشا آپ کا بیٹا ہے۔ وہاں تالا لگانے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ کے صاحبزادے تو یہاں بھی اپنے گاہکوں کو بلا کر عمل کرتے ہیں جیسا کہ ظفر پر کیا گیا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''آپ ظفر کے سلسلے میں نہیں' سمیرا کے سلسلے میں باتیں کرنے آئے ہیں۔''

''جی ہاں! لیکن سمیرا اور ظفر الگ نہیں ہیں۔ میاں بیوی ہیں۔ اگر ایک کے متعلق گفتگو کی جائے گی تو دوسرے کا بھی ذکر آئے گا۔ کیا آپ سمیرا کو بلیک میل کر رہے ہیں؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا یہ بات سمیرا نے بتائی ہے؟''

''جی ہاں! ورنہ مجھے کیسے معلوم ہوتا؟''

''آپ کون ہیں اور ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ کیا پولیس سے آپ کا کوئی تعلق ہے؟''

''جی نہیں۔ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔ آپ نے بیرسٹر لیلیٰ محسن کا نام سنا ہوگا۔

میں اس کا ایک خاص معاون ہوں۔ اسے اپنے کیس کے سلسلے میں تحقیقات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوگوں کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ تو یہ خدمات وہ مجھ سے لیتے ہیں اور انہی خدمات کے لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''کیا سمیرا بیرسٹر صاحبہ کی مؤکلہ ہے؟''

''جی ہاں! یہی سمجھ لیں۔ آپ بلیک میل کر رہے ہیں؟''

''سمیرا نے بتایا ہوگا کہ بلیک میلنگ کس وجہ سے ہے؟''

''ہاں! بہت ہی بھونڈی وجہ ہے۔ آپ اسے بدنام کرنا چاہتے ہیں کہ وہ رحمان صاحب کی بیٹی نہیں' آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کے پاس کیا اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے؟''

''جب میرے اور سمیرا کے درمیان بات بڑھے گی' سمجھوتہ نہیں ہوگا۔ تب میں وہ ثبوت دنیا والوں سامنے پیش کروں گا۔ ابھی میں ضروری نہیں سمجھتا۔''

''چلئے' آپ ثبوت پیش نہ کریں مگر میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا واقعی آپ سمیرا کے اصل والد ہیں؟''

''یہ سمیرا پر منحصر ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھتی ہے؟ میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے حیات پاشا سے اس کی شادی ہو جائے۔ وہ انکار کر رہی ہے۔ انکار کی صورت میں' میں اس کی والدہ سے جو ماضی میں تعلقات رہے ہیں' اسے ظاہر کردوں گا۔ اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ سمیرا کی پیدائش میں میرا بھی حصہ ہے۔''

''یہ تو بہت ہی گری ہوئی حرکت ہوگی۔ ماضی میں اگر کبھی سمیرا کی والدہ سے میل جول رہا ہے تو اس ملاقات کو بدنام نہیں کرنا چاہئے۔''

''یہ بات آپ سمیرا کو جا کر سمجھائیں کہ وہ مجھے بدنام کرنے کا موقع نہ دے۔ سیدھی سی بات ہے۔ میرے بیٹے سے شادی کر لے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ ظفر کی بیوی ہے۔''

''وہ اس سے طلاق لے سکتی ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے سمیرا کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور اسے بہو بنانا چاہتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ دولت مند تو نہیں ہے۔''

''ہم بھی بہت زیادہ دولت مند نہیں ہیں۔ ہاں وہ بہو بن جائے گی تو مرحوم رحمان اور جمشید کے کاروبار سے جو منافع حاصل ہوگا اس کا آدھا حصہ سمیرا کو ملے گا اور سمیرا سے

ہمارے پاس آئے گا۔ یہی اتنی سی بات ہے۔''

''سمیرا نے ہمیں نہیں بتایا کہ آپ اسے اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔''

''وہ تو یہ بات بھی چھپاتی ہے کہ میں اس کا باپ بننے کا دعویٰ کر رہا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو کیسے بتا دیا؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تنویمی عمل جانتا ہوں۔ اپنے عمل کے ذریعے اس سے معلوم کیا ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''مجھے بچہ نہ سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ پروفیسر سامری سے ملتی ہے۔ پروفیسر سامری نے اس سے یہ بات اگلوائی ہوگی اور اس کی باتوں کا کچھ حصہ تمہارے کانوں تک پہنچا دیا ہوگا۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہاں! یہی بات ہے۔''

اُس نے کہا۔ ''دیکھئے' سمیرا سے جا کر کہہ دیجئے کہ بات نہ بڑھائے سیدھی سی بات ہے کہ میرے بیٹے سے شادی کر لے۔ ادھر ظفر اور جمشید کو اس بات پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ وہ مالک پہلے سے ہیں۔ اب یہاں میرا بیٹا سمیرا کے ذریعے اس کاروبار میں حصہ دار بن جائے گا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہم سب مل کر آرام سے صلح صفائی کے ساتھ کاروبار کرتے رہیں گے۔''

''تعجب ہے۔ وہ کاروبار ایسا کیا ہے۔ جس کے لئے اتنے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ سمیرا تو کہتی ہے کہ بس ایک پرنٹنگ پریس ہے۔''

''جی ہاں' صرف ایک پرنٹنگ پریس ہے لیکن آمدنی اتنی ہے کہ آنکھیں کھلی رہ جائیں۔ یوں لگتا ہے جیسے چھپر پھاڑ کر دولت مل رہی ہو۔ ایسے منافع والے کاروبار کو کوئی بھی دانش مند چھوڑنا پسند نہیں کرے گا اور ہم بے وقوفوں میں سے نہیں ہیں۔''

''تو اس کاروبار کو اپنانے کے لئے آپ ایک بیٹے کے ہاتھوں سے باپ کو قتل کرانا چاہتے ہیں۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''یہ میرے لئے ایک نئی اطلاع ہے کہ میں ایسا کر رہا ہوں۔''

''آپ کے بیٹے حیات پاشا نے کیا ظفر کو دماغی طور پر تسخیر نہیں کیا ہے۔ کیا اسے اس حکم کا پابند نہیں بنایا ہے کہ وہ ایک خاص وقت اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے گا؟''

"میں اپنے بیٹے حیات پاشا کی شادی سمیرا سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح حیات پاشا اور ظفر ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ رقیب ایک دوسرے کے خلاف کیا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں جانتا اور اگر کچھ کرتے ہیں تو اس سلسلے میں مَیں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ رقیبوں کا معاملہ ہے۔"

"آپ یہ نہ بھولیں کہ پولیس والے عامل حضرات پر پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔ ایک اُلٹے عمل کا کیس بہت ہی بھیانک ہوا ہے۔ اگر اس کے بعد میں یہ الزام عائد کردوں کہ عامل حیات پاشا' ظفر نامی ایک شخص کے ذریعے اس کے باپ کو قتل کرانا چاہتا ہے اور اس نے اس کے دماغ کو اپنے عمل کے ذریعے تسخیر کیا ہے۔ تب آپ کی اور آپ کے بیٹے کی پوزیشن کیا رہ جائے گی۔"

اس نے پریشان ہو کر مجھے دیکھا پھر کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میرے بیٹے نے ظفر کے دماغ کو تسخیر نہیں کیا ہے۔"

"آپ کیا جانیں۔ یہ دو رقیبوں کا معاملہ ہے۔ ابھی آپ ہی کہہ رہے تھے کہ رقیبوں کی باتیں رقیب ہی جانتے ہیں۔"

"اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے بیٹے پر اتنا بڑا الزام عائد کیا جائے گا۔"

"آپ سب جانتے ہیں۔ آپ ظفر کو اور جمشید کو اس کاروبار سے ہٹا دینے کے لئے ایسا کر چکے ہیں۔ اپنے بیٹے کے ذریعے اس کے دماغ کو تسخیر کیا ہے۔ اب اگر میں پہلے سے یہ رپورٹ کرادوں کہ ظفر سحر زدہ ہے اور اسے سحر زدہ کرنے والا حیات پاشا ہے تو پولیس والے پہلے سے محتاط رہیں گے۔ جب ظفر ایسی واردات کے لئے اپنے باپ کی طرف بڑھے گا تب یہ بات ثابت ہو جائے گی۔"

"ہرگز نہیں۔" اکبر پاشا نے غصے سے کہا۔ "یہ الزام بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ظفر میرے بیٹے کو پھانسنے کے لئے خواہ مخواہ سحر زدہ بن گیا ہو۔"

"کوئی خواہ مخواہ سحر زدہ تو بن سکتا ہے مگر اپنے باپ کو قتل کرنے کے متعلق کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر ظفر جھوٹ کہہ رہا ہے اور وہ سحر زدہ نہیں ہے تو اس کی حقیقت کل کھل جائے گی۔"

"یہ حقیقت کیسے کھلے گی؟"

"ایسے کہ میں نے پروفیسر سامری سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ وہ کل ظفر کو ٹرانس میں

لائے گا۔ اس پر تنویمی عمل کرے گا اور تمہارے بیٹے نے اپنے عمل کے ذریعے ظفر کے دماغ میں جو مجرمانہ باتیں بھر دی ہیں وہ تمام باتیں پروفیسر سامری اس کے دماغ سے اگلوا لے گا اور یہ سب کچھ میں پولیس والوں کی موجودگی میں کروں گا تاکہ یہ ریکارڈ رہے۔ اب بتاؤ۔"

اکبر پاشا اپنی جگہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اسی وقت ایک جوان دوسرے کمرے سے نکل کر ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔ مجھے پھانسنے کے لئے یہ چالیں چلی جا رہی ہیں۔ سمیرا اور پروفیسر سامری کی آپس میں دوستی ہے۔ پروفیسر سامری' ظفر کو ٹریپ کرنے کے بعد اسے اپنا معمول بنائے گا۔ اپنے فائدے کی باتیں اس کے دماغ میں گھسا دے گا اور میرے خلاف ایسی باتیں اس کے ذہن میں نقش کر دے گا کہ وہ وہی باتیں اپنی زبان سے بولتا رہے گا اور پولیس والے مجھے مجرم سمجھتے رہیں گے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم حیات پاشا ہو آؤ یہاں بیٹھو۔ میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ جب پروفیسر سامری' ظفر کو اپنا معمول بنا رہا ہوگا۔ اس پر تنویمی عمل کر رہا ہوگا اور ایسے وقت میں وہاں موجود رہوں گا۔ پولیس والے اس عمل کی پوری رپورٹ اسپیکر کے ذریعے سنتے رہیں گے تب پروفیسر سامری اپنے مطلب کی باتیں ظفر کے دماغ میں کیسے گھسائے گا؟ کیا ایسا کوئی طریقہ کار ہے کہ دیکھنے والے کچھ دیکھتے رہیں اور عمل کرنے والا کچھ اور عمل کر جائے؟"

"آں' وہ بات یہ ہے کہ..........." وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ جواب سوچتا رہ گیا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ایسا تو کوئی طریقہ کار نہیں ہے لیکن ہاں! یہ ٹیلی پیتھی جاننے والے ایسا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کچھ دیکھتے رہیں اور وہ سوچ کے ذریعے اپنے معمول سے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرا لیتے ہیں لیکن ہپناٹزم میں ایسا نہیں ہوتا۔"

اکبر پاشا نے اپنے بیٹے کی طرف بے بسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر بیٹے وہ ہمارے ساتھ کوئی فراڈ تو کر سکتے ہیں نا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسے فراڈ کر سکتے ہیں؟ ہم فراڈ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھیں گے۔ ہم تنویمی عمل کے دوران وہاں موجود رہیں گے پھر کیسے کوئی دھوکہ کیا جا سکتا ہے۔ بات تو وہی سچ ہوگی جو ایک سحر زدہ کی زبان سے نکلے گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ ظفر اس وقت سحر زدہ نہ ہو۔ سمیرا اور پروفیسر سامری نے اسے پہلے

سے سکھا پڑھا رکھا ہو اور اس پر تنویمی عمل کرنے کا ڈھونگ رچایا جائے۔"

میں نے کہا۔"ہاں! ایسا ممکن ہے لیکن ایک بات آپ کو سمجھنا چاہئے وہ یہ کہ سمیرا نے اکبر پاشا کے متعلق ظفر کو کچھ نہیں بتایا کہ کس طرح آپ اسے اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں اور اس طرح حیات پاشا ظفر کا رقیب بن گیا ہے اگر ظفر کو یہ معلوم ہوتا تو وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ عمل کرانے کے لئے ایسے عامل کے پاس دوڑا چلا آتا جو اس کا رقیب بن گیا ہے۔"

اکبر پاشا نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔"ہاں! سمیرا نے ظفر سے یہ بات چھپائی ہے اور ظفر اس معاملے میں بالکل انجان ہے۔ وہ نہیں جانتا ہے کہ میرا بیٹا اس کا رقیب ہے اور میں اس کی بیوی کو اس سے طلاق دلا کر اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔"

"اب آپ ہی فرمائیں کہ ظفر کو کیسے سکھایا پڑھایا جائے گا۔ وہ خواہ مخواہ سحرزدہ کیوں ہوگا؟ اگر پروفیسر سامری تنویمی عمل سے پہلے ظفر کو چپ چاپ یہ سکھائے کہ اسے عمل کے دوران حیات پاشا کے خلاف فلاں فلاں باتیں کہنی ہوں گی۔ تب ظفر یقیناً سوال کرے گا کہ وہ خواہ مخواہ حیات پاشا کے خلاف کیوں باتیں کہے گا؟ وہ ایک انجان سا نوجوان ہے اور میں اس سے باتیں کر کے اندازہ لگا چکا ہوں کہ وہ نہایت شریف انسان ہے۔ وہ خواہ مخواہ آپ کے بیٹے کے خلاف دانستہ کوئی بات نہیں کہے گا۔"

اکبر پاشا نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا۔"آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ دنیا کے سارے خطرناک جادوؤں سے بڑھ کر حُسن کا جادو ہوتا ہے اور ظفر سمیرا کے حُسن کا سحرزدہ ہے۔ جو وہ بولتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اسی پر عمل کرتا ہے۔ وہ پروفیسر سامری کی باتوں میں نہیں آئے گا لیکن سمیرا کی باتوں پر اندھا دھند عمل کرے گا۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"آپ جو کچھ بھی جانتے ہوں، پولیس والے صرف وہی جاننا اور اسی کو ماننا پسند کریں گے جو ایک سحرزدہ کی زبان سے ادا ہوگا اور اسے کل ریکارڈ کیا جائے گا۔ اگر آپ کے بیٹے حیات پاشا نے ظفر کے دماغ کو تسخیر کیا ہے اور اس کے بعد جمشید کے قتل کے لئے کوئی وقت اس کے دماغ میں مقرر کر دیا ہے تو ابھی میرے سامنے تسلیم کر لیں۔ ہم سب مل کر پروفیسر سامری کے پاس جائیں گے۔ سمیرا کو بلائیں گے۔ پھر آپس میں سمجھوتہ کر لیں گے اور یہ معاملہ پولیس کے سامنے جانے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے آپس کے جھگڑے پہلے ختم کر دیں اور خصوصاً آپ سمیرا کو بلیک میل نہ کریں۔"

وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔"اچھی بات ہے۔ میں ابھی سمیرا سے رابطہ قائم کروں گا اور اس سے سمجھوتے کی کوئی راہ نکالوں گا۔ ہم اپنا معاملہ خود ہی نمٹا لیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ آئندہ آپ کو اس سلسلے میں کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

☆======☆======☆

جب میں لیلیٰ محسن کو کوٹھی کے سامنے پہنچا تو رات کے پونے گیارہ ہو رہے تھے۔ یہ وقت سونے کا ہوتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ بیرسٹر لیلیٰ محسن راتوں کو دیر تک جاگتی ہے اور جو کیس اس کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ان کے متعلق اسٹڈی کرتی رہتی ہے۔

ملازمہ نے میرے لئے دروازہ کھولا۔ اب میں اس گھر کا جیسے اہم فرد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہاں کے ملازم بھی مجھے پہچانتے تھے۔ میں بغیر کسی روک ٹوک کے آتا جاتا رہتا ہے۔

جب میں لیلیٰ کے کمرے میں پہنچا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر ناراضگی سے بولی۔"تم تو منہ پھیر کر چلے گئے تھے۔ اب کیوں آئے ہو؟"

میں نے آگے بڑھتے ہوئے اس کی میز کے پاس پہنچ کر کہا۔"تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، وہ بولی۔"میں بہت مصروف ہوں چلو، جاؤ یہاں سے۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم بہت بڑی بیرسٹر ہو اور ہمیشہ مصروف رہتی ہو لیکن دل کے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر ساری مصروفیات قربان کر دی جاتی ہیں۔"

اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا۔"اے خبردار! مجھ سے عشقیہ باتیں نہ کرنا۔ تمہارے فراڈ کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ جب کوئی مطلب ہوتا ہے تو مجھ سے محبت بھری باتیں شروع کر دیتے ہو۔ دیکھو شہاب! اگر تم............"

وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ پھر جھنجھلا کر بولی۔"توبہ ہے۔ تمہیں شہاب کہتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے والد محترم کو مخاطب کر رہی ہوں۔ تم کوئی اپنا نام کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

میں نے اپنے دل کی جگہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔"محبت کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ تم مجھے جس نام سے پکارو گی۔ میں کھنچا چلا آؤں گا۔"

"تو پھر میں تمہیں احمق کہہ کر پکارا کروں گی۔"

"سوچ لو شادی کے بعد مسز لیلیٰ احمق کہلاؤ گی۔"

"بکواس مت کرو۔ میں اور تم سے شادی کروں گی؟ صورت دیکھی ہے اپنی؟"

"میں روز ہی صورت دیکھنے آتا ہوں۔ تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا؟"

"میں اپنی نہیں تمہاری صورت دیکھنے کے لئے کہتی ہوں۔"

"مجھے تو تمہارے سوا اپنی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ یقین کرو، میں تمہارے چہرے کے ایک ایک اتار چڑھاؤ کو سمجھتا ہوں۔ جب مجھے دیکھتی ہو تو تمہاری آنکھوں میں ایسی محبت، ایسی اپنائیت چھپی ہوتی ہے، جسے میں ہی محسوس کرتا ہوں۔ خواہ تم لاکھ چھپانے کی کوشش کرو۔"

اس نے نظریں جھکا لیں۔ پھر کہنے لگی۔ "خدا کے لئے مجھے عشقیہ باتوں میں نہ الجھاؤ۔ مجھے کام کرنے دو۔ یا کوئی کام کی بات ہے تو فوراً بولو اور یہاں سے جاؤ۔"

"پہلی کام کی بات تو یہ ہے کہ سپر ہائی وے کی نئی آبادی میں جو کاٹیج تم نے مجھے رہنے کے لئے دیا ہے۔ وہاں ٹیلی فون نہیں ہے۔ اس لئے میں یہاں تھوڑا وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ سمیرا اور سامری وغیرہ کی طرف سے ضرور میرے نام کا ٹیلی فون آئے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں سمیرا کے علاوہ ظفر سے اور اکبر پاشا اور اس کے بیٹے حیات پاشا سے ملاقات کر چکا ہوں۔ تمام لوگوں سے جو گفتگو کی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو بات سامنے آرہی ہے وہ بہت الجھی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب لوگ مل کر کیا چکر چلا رہے ہیں۔ پہلے ان کے کاروبار کو سمجھنا ہوگا۔ سبھی یہ کہتے ہیں کہ ایک پرنٹنگ پریس ہے جس کی آمدنی لامحدود ہے۔ یعنی چھپر پھاڑ کر دولت مل رہی ہے۔"

لیلیٰ نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "پرنٹنگ پریس کا کام اچھا چلتا ہے تو بڑی معقول آمدنی ہوتی ہے لیکن لامحدود آمدنی والی بات میری سمجھ میں نہیں۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے پرنٹنگ پریس کو ایک پردہ بنا رکھا ہے اور اس پردے کے پیچھے کوئی غیر قانونی کاروبار ہو رہا ہے۔"

لیلیٰ نے پوچھا۔ "یعنی بات صرف یہاں تک نہیں ہے کہ سمیرا رحمان کو بھوک نہیں لگتی، نیند نہیں آتی اور یہ کہ اس پر دو بار قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ اس سے الگ ہٹ کر دوسری بات ہے۔"

میں نے سر ہلا کر کہا۔ "سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پر قاتلانہ حملے کیوں ہوئے؟ جواب

یہی ملتا ہے کہ پہلے ان کے کاروبار کو سمجھا جائے کاروبار سمجھ میں آجائے تو ان کی چکر بازیاں بھی کھل کر ہمارے سامنے آجائیں گی۔"

میں نے لیلیٰ کو تفصیل بتائی کہ کس طرح حیات پاشا نے ظفر کو اپنے عمل کے ذریعے ٹریپ کیا ہے اور اس کے دماغ میں تنویمی عمل کی یہ گرہ باندھ دی ہے کہ اسے ایک مخصوص وقت میں اپنے باپ کو بھی قتل کرنا ہے۔

لیلیٰ حیرانی سے یہ ساری باتیں سُن رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "میں نے اکبر پاشا کو دھمکی دی کہ کل صبح پولیس والوں کے سامنے ظفر پر تنویمی عمل کیا جائے گا اور اس عمل کے ذریعے وہ ساری باتیں اگلوائی جائیں گی، جو حیات پاشا نے اس کے دماغ میں گرہ کے طور پر باندھ دی ہیں۔ اب دونوں باپ بیٹے قانون کی گرفت میں آجائیں گے۔ اکبر پاشا اور حیات پاشا دونوں گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے آخر میں یہی کہا کہ وہ سمیرا سے مل کر سمجھوتے کی کوئی راہ نکالیں گے۔ گویا انہیں یقین ہے کہ سمیرا سمجھوتہ کرلے گی۔"

لیلیٰ نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔ اگر ان کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا اور یہ آپس کے جھگڑے کو بھول کر کسی ایک بات پر متفق ہو جائیں گے تو پھر بات ہمیشہ کے لئے چھپ جائے گی۔ ہم ان کے اصل کاروبار تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

لیلیٰ نے کہا۔ "ہماری تمہاری دوستی اسی بنیاد پر ہوئی ہے کہ میں قانون سے کھیلنا جانتی ہوں اور تم مجرموں تک پہنچنا جانتے ہو۔ جو مجرم قانون کے ہاتھوں سے بچ جاتے ہیں۔ ہم ان کا محاسبہ کریں گے اور انہیں ان کی سزا تک پہنچائیں گے۔ اگر ان لوگوں کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا تو پھر ہم ان تک پہنچ سکیں گے۔ ان کی اصلیت تک پہنچنا تمہارا کام ہے۔ تم انہیں بے نقاب کرو۔ انہیں کس طرح سزا دی جائے گی اس کا فیصلہ میں کروں گی۔ میں انہیں قانون کے کٹہرے تک پہنچا دوں گی۔"

میں نے کہا۔ "بڑے بڑے ڈاکٹر، پروفیسر سامری کی عزت کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہسپتال میں کوئی مینٹل کیس ہوتا ہے۔ کوئی دماغی مریض آتا ہے تو پروفیسر سامری کے ذریعے اس کی نفسیاتی الجھنوں کو سلجھایا جاتا ہے۔ سمیرا کے سلسلے میں بھی ڈاکٹروں نے پروفیسر سامری کی مدد حاصل کی تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ آج صبح ہسپتال میں سمیرا اور پروفیسر سامری کی عامل اور معمولہ کی حیثیت سے پہلی ملاقات نہیں تھی۔ بلکہ یہ

دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے رہے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پروفیسر سامری کو اپنے اعتماد میں لے کر اس کے ذریعے ان کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ سامری سمیرا کا دیوانہ ہے یعنی آج صبح اس نے سمیرا کو سحرزدہ کیا تھا۔ اس سے پہلے ہی سمیرا اسے سحرزدہ کر چکی ہے اور وہ اس کا بے دام کا غلام بنا ہوا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ اگر سامری ہمارے کام آسکتا تو ہم ظفر کو ضرور تنویمی عمل کے لئے مجبور کرتے اور سامری اسے اپنا معمول بنا کر اصل راز اگلوالیتا' خاص کر یہ بات کہ ان کا کاروبار کس نوعیت کا ہے؟"

لیلیٰ نے سوچنے کے انداز میں کہا۔ "ہوں! ایک ہپناٹزم کا ماہر ان میں سے کسی ایک کے دماغ میں گھس کر یہ راز معلوم کر سکتا ہے اور تمہارے اندازے کے مطابق سامری ہمارے لئے ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ سمیرا کا دیوانہ ہے۔ دوسری طرف عامل حیات پاشا جو یہ علم جانتا ہے وہ بھی اپنے مفاد کی خاطر ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔"

میں نے کہا۔ "بس ایک تدبیر ہے اور وہ یہ کہ کوئی تیسرا عامل پیدا کیا جائے۔"

"وہ کیسے پیدا ہوگا؟"

"ہاں! ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی۔"

وہ ایک دم سے بپھر گئی۔ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ پھر گھونسہ دکھا کر بولی۔ "اے! میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ تم سنجیدگی سے گفتگو نہیں کر سکتے؟"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ لیلیٰ ریسیور اٹھانا چاہتی تھی کہ میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ٹھہرو! پہلے کیسٹ ریکارڈر کا پلگ اس سے منسلک کرو۔"

اس نے غصے کے باوجود میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی ہمارے مطلب کا فون آیا ہوگا۔ جب اس نے کیسٹ ریکارڈر کا پلگ ٹیلی فون سے منسلک کر دیا۔ تب میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو! میں ابنِ شہاب بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے سمیرا کی آواز سنائی دی۔ "میں سمیرا رحمان ہوں۔ رات بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ میں تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ تم کہاں سے فون کر رہی ہو؟"

"اتنی رات کو اور کہاں سے کروں گی۔ میں اپنے بیڈروم میں ہوں۔ وہ اکبر پاشا

میرے پاس آیا تھا اور مجھ سے صلح کرنی چاہتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ مجھے بلیک میل نہیں کرے گا۔ اس نے وہ تصویر جو کبھی کسی تقریب میں میری ماں کے ساتھ اتاری تھی۔ مجھے واپس کر دی ہے اور چند خطوط بھی دیئے ہیں۔ جنہیں میں نے جلا ڈالا ہے۔ اب وہ ہمارے راستے میں نہیں آئے گا۔ اس لئے میں اس معاملے کو ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تمہارا آج کا سارا دن ہمارے لئے برباد ہوا۔ اگر چاہو تو میں اس کا معقول معاوضہ تمہیں ادا کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں کام مکمل کئے بغیر معاوضہ نہیں لیتا اور یہ کام ابھی ادھورا ہے۔ تم معاملہ ختم کرو گی تو یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا۔ کل صبح ظفر پر تنویمی عمل ضرور کیا جائے گا۔ میں ابھی سامری سے بات کروں گا۔ اگر وہ تنویمی عمل کے لئے راضی ہوگیا تو بڑی اچھی بات ہے۔ اگر اس نے بھی کسی قسم کا بہانہ کیا یا ٹالنے کی کوشش کی تو میں سرکاری طور پر ایک اور ہپناٹزم کے ماہر کو لاؤں گا۔"

سمیرا ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا تم ظفر کی مرضی کے خلاف اس پر تنویمی عمل کر سکو گے؟"

"ہاں! یہ نہ بھولو کہ میں بیرسٹر لیلیٰ محسن کا خاص معاون ہوں۔ لیلیٰ محسن قانونی دائرے میں رہ کر کورٹ کے ذریعے یہ اجازت نامہ حاصل کریں گی کہ مسٹر ظفر کوئی غیر قانونی کاروبار کر رہے ہیں۔ ان سے اصلیت اگلوانے کے لئے ان پر تنویمی عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سے قانون کو بہت مدد ملے گی۔"

اس نے حقارت سے پوچھا۔ "اونہہ! کیا قانون تنویمی عمل سے حاصل کئے ہوئے نتائج کو قبول کر لے گا؟"

"کیوں نہیں۔ بیرسٹر لیلیٰ محسن ایسے ریکارڈ پیش کریں گی جن کے ذریعے یہ ثابت ہو جائے گا کہ تنویمی عمل کے ذریعے ذہنی الجھنوں کا حل کس طرح تلاش کیا جاتا ہے اور دماغ میں چھپی ہوئی باتوں کو کس طرح شعور کے خانوں میں لا کر مریضوں کی بیماری کی اصل وجہ معلوم کی جاتی ہے اور جب اصلی وجہ معلوم ہوتی ہے تو بعض اوقات بہت سے جرائم پر سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ ایسے بہت سے کیسز ہیں۔ یہ تو تم بھی جانتی ہو۔ ہسپتال کے وہ تمام ڈاکٹر بھی گواہوں کے طور پر پیش کئے جائیں گے جنہوں نے تمہارے علاج کے لئے پروفیسر سامری کو منتخب کیا تھا۔"

میری بات سن کر فون پر تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا سو گئیں؟''

دوسری طرف سے اس نے کہا۔ ''دیکھو مسٹر شہاب! میں..........''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''شہاب میرے والد کا نام ہے۔''

''پھر تمہیں کس نام سے پکاروں؟''

''ابنِ شہاب!''

''اچھا' تو مسٹر ابنِ شہاب! تم اپنا معقول معاوضہ لے کر خاموش کیوں نہیں ہو جاتے۔ کیوں خواہ مخواہ ہمارے معاملات میں ٹانگ اَڑا رہے ہو؟ ہم کوئی ناجائز کاروبار نہیں کرتے ہیں۔ تم اگر دلچسپی لو گے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''میں معقول معاوضہ لے کر ان معاملات سے الگ ہو سکتا ہوں لیکن تم میرا معاوضہ شاید ادا کرنے سے ہچکچاؤ گی۔''

''میں ضرور ادا کروں گی۔ تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں چاہتا ہوں۔''

لیلیٰ مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ سمیرا نے دوسری طرف سے کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے۔ کیا تم مجھے کوئی سستی عورت سمجھتے ہو؟''

''تم بہت مہنگی ہو۔ اسی لئے تو مہنگا معاوضہ طلب کر رہا ہوں۔ دیکھو بہت زیادہ پارسا بننے کی کوششِ نہ کرو۔ آج شام کو پانچ بجے سے پہلے جب سامری مجھ سے فون پر باتیں کر رہا تھا تو اس وقت تم اسے دیوانہ بنا رہی تھیں' اس کے بہت قریب موجود تھیں۔ اتنے قریب کہ اس کے سگریٹ کی چنگاری سے تمہاری ساڑھی کا آنچل جل گیا۔ تم اس حقیقت سے ڈھیٹ بن کر انکار کردو لیکن میں ایک جاسوس ہوں اور بہت دور رہ کر بھی بہت قریب پہنچ جاتا ہوں۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ میں حُسن پرست ہوں۔ مجھے پرستشِ کا موقع نہیں دو گی تو کل ظفر پر تنویمی عمل ضرور کیا جائے گا اور اس کے لئے کورٹ سے اجازت نامہ حاصل ہو جائے گا۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تھوڑی دیر بعد فون کر کے مجھے جواب دینا۔''

اس نے دوسری طرف سے کہا۔ ''ٹھہرو! ریسیور نہ رکھنا۔ میں مانتی ہوں کہ تم سے دوستی کرنی چاہئے۔ تم کام کے آدمی ہو۔ اس تنویمی عمل کو روک دو۔ میں نہیں چاہتی کہ سرکاری طور پر ظفر کے ساتھ ایسا ہو۔''

''سمیرا! تم نے ظفر سے یہ بات کیوں چھپائی کہ عامل حیات پاشا تم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے باپ اکبر پاشا نے تمہیں بلیک میل کرتے ہوئے یہ شرط رکھی ہے کہ تم عامل حیات پاشا کی بیوی بن جاؤ۔ یعنی اکبر پاشا کی بہو بن جاؤ۔ پھر وہ آئندہ تمہیں بلیک میل نہیں کرے گا اور وہ بلیک میل کس وجہ سے کر رہا ہے۔ وہ وجہ بھی تم نے ظفر کو نہیں بتائی' آخر کیوں؟''

دوسری طرف سے اس نے کہا۔ ''بس یونہی! عورت ہر بات اپنے مرد کو نہیں بتاتی۔ ظفر بہت شکی ہے۔ وہ مجھ سے بدظن ہو جائے گا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ وہ باپ بیٹے مجھے کاروبار سے دُودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں گے۔ اگر میں الگ ہونا نہیں چاہوں گی تو اس کاروبار میں خسارہ دکھانا شروع کر دیں گے یا وہ کاروبار ہی کسی وجہ سے بند کر دیں گے۔ پھر ساری آمدنی رُک جائے گی۔''

''اگر تم ظفر کو یہ بتا دیتیں کہ حیات پاشا اس کا رقیب ہے' تو وہ بے چارہ کبھی تنویمی عمل کے لئے حیات پاشا کے پاس نہ جاتا۔ اب وہ سحرزدہ ہے۔ حیات پاشا نے اس کے دماغ کو تسخیر کیا ہے۔ کیا وہ بے چارہ اپنے باپ کا قاتل نہیں بن جائے گا؟''

سمیرا نے کہا۔ ''تم اس بات کی فکر نہ کرو۔ میں ایسا وقت نہیں آنے دوں گی۔ معاملہ اب ختم ہو رہا ہے۔ اکبر پاشا اور اس کا بیٹا.......... حیات پاشا یہ شہر ہی چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا اور ظفر کے دماغ میں قتل کرنے کے لئے تنویمی عمل کی جو گرہ باندھی گئی ہے' اسے پروفیسر سامری کھول دیں گے۔''

''سمیرا! تم لوگوں کا کاروبار کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن تم اس کاروبار کو کس طرح چلاؤ گی؟ یہ میں جان گیا ہوں۔''

''کیا جان گئے ہو؟''

''یہی کہ ایک طرف ایک باپ بیٹے ہیں۔ یعنی ظفر اور جمشید دوسری طرف دوسرے باپ بیٹے ہیں۔ یعنی حیات پاشا اور اکبر پاشا۔ اب دونوں طرف نظر رکھتے ہوئے تمہیں فیصلہ کرنا تھا کہ کن لوگوں کو اپنے پارٹنر کی حیثیت سے قبول کرتی رہو گی۔ فیصلہ کن انداز میں یا تو حیات پاشا اور اکبر پاشا ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹ جائیں یا اگر وہ ڈھیٹ بن کر' کمبل بن کر لپٹے رہے تو ظفر اور جمشید کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ باپ کے قتل کے الزام میں بیٹے کو پھانسی کے تختے تک پہنچایا جائے۔ تم دو میں سے کسی ایک پارٹی کو الگ کر دینا

چاہتی تھیں اور اب اکبر پاشا شکست کھا کر الگ ہو رہا ہے۔''

''دیکھو مسٹر شہاب! سوری مسٹر ابن شہاب! تم پھر ہمارے معاملات پر گفتگو کر رہے ہو۔ یہ بحث ختم کر دو۔ میں تمہارا معاوضہ ادا کردوں گی اور اس کے لئے کل کوئی وقت مقرر کروں گی۔''

''میں آج کا کام کل پر نہیں ڈالتا۔ تم آج اور ابھی مجھ سے ملو گی۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں اپنے شوہر اور سسر کو کیا جواب دوں گی کہ اتنی رات کو گھر سے نکل کر کہاں جارہی ہوں۔ تم میری مجبوری کو سمجھو۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تم مجبور ہو تو احتیاطاً کل ظفر پر تنویمی عمل ضرور کیا جائے گا؟ اور یہ سب پولیس والوں کی موجودگی میں ہوگا۔ جب دوسرے تیسرے دن تم میرا معاوضہ ادا کر دوگی تو ہم یہ کیس واپس لے لیں گے۔ پولیس والوں کو سمجھانا بیرسٹر لیلیٰ محسن کا کام ہے۔''

اس نے کہا۔''کیا تم بیرسٹر لیلیٰ سے میرے معاوضہ کا ذکر کرو گے؟ یہ کیس پولیس والوں سے کیسے واپس لو گے؟''

میں نے کہا۔''ایسے معاملات میں کچھ کہنا نہیں پڑتا۔ سب کام پیسے سے ہوتا ہے۔ بیرسٹر لیلیٰ محسن ہوں یا پولیس والے ہوں۔ سبھی دولت حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے دھندوں سے لگے رہتے ہیں۔''

فون پر چند لمحوں کے لئے خاموشی رہی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔''مجھے منظور ہے۔ کل صبح ظفر پر تنویمی عمل کیا جائے گا۔ تم صبح نو بجے ظفر کی باتوں کو ریکارڈ کرنے کے انتظامات کر لینا اور کچھ؟''

''کچھ نہیں۔ جب یہ کام ہو جائے گا تو ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے اور تم دیکھو گی کہ میں کس طرح تمہارے کام آتا ہوں' شکریہ۔''

یہ کہہ کر میں نے کریڈل پر ہاتھ رکھا اور کاغذ نکالا۔ جس میں سمیرا کے گھر کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس نمبر کے مطابق ڈائل کو گھمایا۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں ریسیور کان سے لگائے سننے لگا۔ گھنٹی دیر تک بجتی رہی۔ کوئی اسے نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سمیرا اپنی خوابگاہ میں نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے ریسیور اٹھایا۔ ظفر کی اونگھتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔''ہیلو! کون ہے؟ اتنی رات کو کون ڈسٹرب کر رہا ہے؟''

''میں نے تمہیں ایک اہم اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے۔ اتنی گہری نیند کیا سو

رہے ہو؟ ذرا اٹھ کر دیکھو۔ تمہاری بیوی خواب گاہ میں نہیں ہے۔''

''ایں' کیسے نہیں ہے؟'' اس کی نیند بھری آواز سنائی دی۔''اچھا' ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔''

خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ریسیور پر کہا۔''تم کون ہو؟ بکواس کرتے ہو۔ میری بیوی اپنی خواب گاہ میں سو رہی ہے۔''

میں نے کہا۔''ابھی ریسیور نہ رکھنا۔ یہ بتادو۔ کیا تم دونوں ایک خواب گاہ میں نہیں سوتے ہو؟ اگر وہ دوسری خواب گاہ میں سوتی ہے تو تم اسے دور سے نہ دیکھو۔ قریب جا کر دیکھو۔ وہاں سمیرا نہیں ہے۔''

''مگر مجھے تو وہ بستر پر سوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔''

''بے وقوف کے بچے! سمیرا اس وقت میری خواب گاہ میں سو رہی ہے۔ پھر وہاں کیسے ہو سکتی ہے؟ جاؤ اچھی طرح دیکھ لو۔''

یہ کہہ کر میں نے بدمعاشوں کے انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ریسیور کو رکھ دیا۔ لیلیٰ نے گھور کر پوچھا۔''یہ کیا بدمعاشیاں کر رہے ہو۔ آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟''

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کیسٹ ریکارڈر سے اس کیسٹ کو نکالا۔ جس میں میری اور سمیرا کی گفتگو ریکارڈ ہو چکی تھی۔ پھر اسے لے کر میں نے کہا۔''میں ظفر سے ملنے جا رہا ہوں' تم سے اب صبح ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک تمہارے ذمے جو کام سونپ کر جا رہا ہوں اُسے ضرور انجام دینا۔ تم ابھی پولیس افسران سے رابطہ قائم کرو اور یہ رپورٹ درج کراؤ کہ ظفر ایک سحرزدہ شخص ہے۔ جس پر تنویمی عمل کیا گیا ہے۔ اس پر کل صبح دوبارہ تنویمی عمل کر کے اس کے دماغ سے بہت سی چھپی ہوئی باتوں کو معلوم کیا جائے گا۔ اس کے لئے قانون کے محافظوں کی موجودگی لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جو کچھ ظفر کہے گا اور عامل جو کچھ اس سے اُگلوائے گا دونوں کی باتوں کو کسی کیسٹ میں ریکارڈ ہونا چاہئے۔ یہ تمام انتظامات صبح نو بجے تک ہو جائیں تو بہتر ہے کیا تم ایسا کر سکو گی؟''

اس نے سر ہلا کر کہا۔''جاؤ۔ بے فکر رہو' میں سارے کام انجام دے دوں گی۔ ویسے یہ بتاؤ۔ ابھی تم نے فون پر جو باتیں کیں۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ سمیرا اپنی خواب گاہ میں نہیں ہے۔ یہ تم نے کیسے معلوم کیا؟''

''میں نے سمیرا سے باتیں کرنے کے بعد تمہارے سامنے ہی اس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ وہاں بہت دیر تک فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ اگر سمیرا وہاں سے بات کر رہی تھی، تو یقیناً فون کے پاس ہوتی لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ وہاں صرف ظفر شاید خواب آور دوا کھانے کے بعد سو رہا تھا۔ مسلسل گھنٹی کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔''

''سمیرا اتنی رات کو آخر کہاں ہوگی؟''

میں نے کہا۔ ''پروفیسر سامری نے اسے اپنی معمولہ بنانے کے بعد حکم دیا تھا کہ وہ رات کو دس بجے سو جایا کرے گی اور صبح پانچ چھ بجے بیدار ہوگی۔ جس نے اسے سونے کا حکم دیا تھا۔ وہی اسے سلا رہا ہوگا۔''

یہ کہہ کر میں لیلیٰ کے کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

وہی پُراسرار ماحول تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی اور نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ نیم روشنی بھی تھی۔ کیونکہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے روشنی بند کمرے کے اندھیرے کو کسی حد تک دور کر رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ جس پر ظفر چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔

جس پلنگ پر وہ پڑا ہوا تھا اس کے نیچے فرش پر میں لیٹا ہوا تھا۔ ایسے جیسے کہ وہ میری موجودگی کو نہ جانتا ہو۔ سامری نے مجھ سے کہا تھا کہ ظفر کے آنے سے پہلے میں اس کمرے میں آ کر چھپ جاؤں۔ لہٰذا میں نے چھپنے کے لئے یہی جگہ منتخب کی تھی۔ دوسرے کمرے میں ایک پولیس آفیسر اور چار سپاہی موجود تھے۔ ان کے علاوہ بیرسٹر لیلیٰ محسن سمیرا رحمان' اکبر پاشا اور اس کا بیٹا حیات پاشا موجود تھے۔ وہ دونوں باپ بیٹے یہ شہر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ سمیرا سے کچھ سمجھوتہ ہو گیا تھا لیکن ہم نے انہیں جانے سے پہلے ہی پولیس والوں کے ذریعے روک دیا تھا اور انہیں یہاں آ کر دوسرے کمرے میں بیٹھنے پر مجبور کیا تھا۔

اس کمرے میں اسپیکر کے ذریعے اس بات کا انتظام کیا گیا تھا کہ پروفیسر سامری اور ظفر کے درمیان عامل اور معمول کی حیثیت سے جو باتیں ہوتی رہیں گی وہ دوسرے کمرے میں بھی سنی جاتی رہیں اور ریکارڈ ہوتی رہیں۔ اس وقت پروفیسر سامری اپنے کمرے میں تھا۔ شاید وہی ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن رہا تھا اور اپنے چہرے پر ہلکا سا ایسا میک اپ کر رہا تھا۔ جو اپنے معمول پر پہلی نظر میں تاثر قائم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ شاید اس لیے

تنویمی عمل سے پہلے اپنے ہونے والے معمول کو ایک خالی' ویران' خاموش اور تقریباً پُراسرار کمرے میں تنہا لٹا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس ماحول سے متاثر ہوتا رہے۔ آنے والے لمحات کے متعلق سوچتا رہے اور پہلے ہی سے کچھ سہما سہما سا رہے۔

آخر اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ ذرا سا سر گھما کر دیکھا تو سامری کے پاؤں نظر آئے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلنگ کے پاس آ گیا تھا۔ پہلے وہ ظفر کے سرہانے آ کر کھڑا ہوا تھا۔ پھر اپنی گمبھیر اور گونجتی گرجتی ہوئی دھیمی سی آواز میں بولا۔ ''ظفر! مجھے امید ہے کہ تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہے ہو گے۔ دنیا کی تمام فکروں اور تمام پریشانیوں سے آزاد ہو گے۔ اس وقت اپنے ذہن کو آمادہ کرو کہ جو شخص تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ وہی تمہارا سب کچھ ہے۔ تمہارا مالک ہے۔ تمہارا مختار ہے اور تمہارا عامل ہے۔ وہ جو عمل کرے گا' جو احکامات تمہیں دے گا۔ تم اس پر عمل کرو گے اور جو سوال کرے گا اس کا صحیح اور سچا جواب دو گے۔''

ظفر چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ ابھی وہ کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں تھا کیونکہ وہ ابھی ٹرانس میں نہیں آیا تھا۔ پروفیسر کا معمول نہیں بنا تھا۔ مجھے پروفیسر کے پاؤں پنڈلی تک نظر آ رہے تھے۔ وہ پاؤں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پلنگ کے پائنتی گئے۔ پھر وہاں سے گھوم گئے۔ یعنی اب پروفیسر سامری گھوم کر ظفر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اُس نے کہا۔ ''ظفر! تم بالکل پُرسکون ہو۔ تمہارے دماغ میں صرف ایک ہی ہستی ہے۔ جو اس وقت تمہارے سامنے موجود ہے۔ مجھے دیکھو' میری آنکھوں میں جھانکو۔''

میں نے پلنگ کے نیچے سے اپنے دائیں طرف دیکھا۔ دُور ایک دیوار پر پروفیسر سامری کے دونوں اٹھے ہوئے بازوؤں کا سایہ نظر آیا۔ لبادے کی ڈھیلی ڈھالی آستین اس کی استخوانی کلائی سے نیچے جھول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی آسیب اس کمرے کے در و دیوار پر چھا گیا ہو۔ پھر مجھے سامری کی آواز سُنائی دی۔ وہ بڑی گمبھیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''شاباش! اسی طرح میری آنکھوں میں دیکھتے رہو۔ میری آنکھیں ایک سمندر ہیں جو دیکھنے والوں کو تنکے کی طرح بہا کر لے جاتی ہیں۔ تم ان آنکھوں کے سمندر میں بہہ رہے ہو' ڈوب رہے ہو۔ اب تم ان آنکھوں سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکو گے' تم مجھے دیکھتے رہو گے۔ دیکھتے جاؤ گے۔ حتیٰ کہ تمہاری پلکیں آہستہ آہستہ جھکنے لگیں گی اور تمہاری آنکھیں نیند کے لئے

بند ہو جائیں گی۔''

وہ بول رہا تھا۔ خالی کمرے میں اس کی آواز ہولے ہولے گونج رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں بھی بیٹھے ہوئے لوگ اس آواز سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سامری نے کہا۔ ''ہاں! اب تمہاری پلکیں جھک رہی ہیں۔ تم نیند کی وادیوں میں گم ہونے والے ہو۔ اس سے پہلے یاد رکھو کہ تمہارا ذہن نیند کے دوران میرے سوالوں کا جواب دینے کے لئے بیدار رہے گا۔ تم میرے احکامات کے پابند رہو گے' شاباش!''

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر سامری کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''اب تم سو رہے ہو اور اب تم میرے سوالوں کا جواب دو گے۔''

ظفر کی بہت دھیمی سی آواز سنائی دی۔ ''میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔''

''تم اس وقت سو چکے ہو۔ مگر تمہارا ذہن صرف میرے لئے جاگ رہا ہے۔ تم میری آواز سنو گے اور دنیا کی کوئی آواز تمہارے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔''

ظفر نے اس بات کو دُہرایا۔ ''میرے کانوں میں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچے گی۔ میں صرف تمہاری آواز سنتا رہوں گا۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام ظفر علی ہے۔''

''کیا آج سے پہلے تم پر کسی نے تنویمی عمل کیا تھا؟''

''جی ہاں' کیا تھا۔''

''اس عامل کا نام بتاؤ۔''

''اس کا نام عامل حیات پاشا ہے۔''

''حیات پاشا نے تمہارے دماغ میں جو باتیں بٹھائی ہیں اسے تفصیل سے بیان کرو۔''

''عامل حیات پاشا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ہم کس قسم کا کاروبار کرتے ہیں؟ میں نے جواب دیا۔ بظاہر ہمارا ایک پرنٹنگ پریس ہے لیکن اِس کے پسِ پردہ ہم جعلی نوٹ چھاپتے ہیں۔''

اس کی یہ بات دوسرے کمرے میں پہنچی تھی۔ اس کے ساتھ سمیرا کی چیخ سنائی دی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟ پروفیسر سامری! تم نے اسے کیسے ٹرانس میں لیا

ہے۔ کیسے عمل کر رہے ہو؟ وہ غلط باتیں کہہ رہا ہے۔''

پولیس آفیسر کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''سمیرا! اگر تم اپنی خیریت چاہتی ہو تو آئندہ درمیان میں نہ بولنا۔ خاموش بیٹھی رہو۔ ورنہ ہم تمہارے ساتھ بُری طرح پیش آئیں گے۔''

میں فرش پر رینگتا ہوا پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ اس وقت سامری کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آتے ہی میں نے دیکھا۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ حیرانی سے آنکھ بند کئے ہوئے ظفر کے چہرے کو تک رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''مسٹر سامری! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ چلئے آگے سوال کیجئے۔ آپ کو تو ابھی بڑے عجیب وغریب جوابات سنائی دیں گے۔''

یہ کہتے ہوئے میں فرش پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کپڑے جھاڑنے کے بعد جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکالا۔ پھر اس کا رُخ سامری کی طرف کر دیا۔ سامری نے پریشان ہو کر کہا۔ ''مسٹر شہاب! یقین کرو' میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ ان کا کاروبار جعلی نوٹوں کا ہے۔''

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک سمیرا نے تم سے بھی یہ بات چھپائی ہو گی۔ وہ تمہیں اپنا آلہ کار بنانے کے لئے اپنے حسن سے سحرزدہ کرتی رہی اور تم سحرزدہ ہوتے رہے۔ اب یہ ظفر جو تمہارے سامنے لیٹا ہوا ہے۔ اسے تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ تمہارے تنویمی عمل کا شکار نہیں ہوا ہے۔ ٹرانس میں نہیں آیا ہے۔ کیوں ظفر؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ظفر نے آنکھیں کھول دیں پھر اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ''آپ درست کہہ رہے ہیں۔ سمیرا اور مسٹر سامری نے آج صبح ہی یہ سکھا دیا تھا کہ مجھے ٹرانس میں نہیں آنا ہے۔ صرف ٹرانس میں آنے کی ایکٹنگ کرنی ہے۔ آنکھیں بند کر کے جن سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ وہ جواب مجھے طوطے کی طرح رٹا دیئے گئے تھے۔''

پروفیسر سامری نے کہا۔ ''یہ درست ہے لیکن بخدا میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان حرکتوں کے پیچھے جعلی نوٹ چھاپنے کا اتنا بڑا جرم ہو رہا ہے۔ میں تو صرف سمیرا.........''

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ تم صرف سمیرا کے حُسن کے دیوانے تھے۔ اب تم اس جرم میں ملوث تھے۔ یا نہیں تھے۔ اس کا جواب تم عدالت میں دیتے رہنا۔ فی الحال خاموش رہو۔ ہاں ظفر! تم شروع سے یہ قصہ بیان کرو۔ ہمارے

قانون کے محافظوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی۔''

ظفر نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔''میرے والد جمشید اور سمیرا کے والد رحمان پتہ نہیں کتنے عرصے سے اس کوشش میں تھے کہ جعلی نوٹ چھاپنے کے انتظامات کئے جائیں۔ میرے والد بہت اچھے ڈیزائنر ہیں بہت اچھے نقال ہیں۔ ڈرائنگ اتنی اچھی کامیابی سے بناتے ہیں کہ اصل اور نقل کا امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے والد نے سو روپے کے ایک نوٹ کی ہو بہو نقل کی تھی اور اس کی پلیٹ رحمان صاحب نے بنائی تھی۔ دونوں ہی بہت بڑے کاریگر تھے اور اپنے اپنے فن کے استاد تھے۔

''وہ دونوں بزرگ مجھے اور سمیرا کو اپنے معاملات میں شریک کرتے تھے اور اس دھندے کی تمام باریکیاں ہمیں سمجھاتے تھے۔ ہمیں ٹریننگ دیتے تھے کہ جب یہ نوٹ شائع ہو جائیں گے تو انہیں کس طرح مارکیٹ میں پھیلانا چاہئے۔ بہرحال کچھ عرصے بعد جب ہم سو سو کے نوٹ چھاپنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو ان سے رحمان صاحب کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ملک الموت نے انہیں دبوچ لیا اور وہ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ ان کی جگہ سمیرا آ گئی۔ وہ تو پہلے ہی سے تھی۔ ہم ان نوٹوں کو ٹھکانے لگانے کے طریقہ کار پر غور کرنے لگے اور موقع کی تلاش میں رہنے لگے کہ کس طرح آہستہ آہستہ تھوڑے تھوڑے سے نوٹ بازار میں پھیلائے جائیں۔

انہی دنوں میں نے سمیرا کو ایک نوجوان انجینئر کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ سمیرا قادر جان سے بھی دوستی رکھتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی ملتی ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا۔ میں نے اعتراض کرنا شروع کیا تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر محبت سے مجھے سمجھانے لگی۔ میں اس کے آگے بے بس ہو جاتا تھا۔ اس کی ہر بات کو تسلیم کر لیتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔'تم اس انجینئر سے ملنے کیوں گئی تھیں؟'

''اس نے جواب دیا۔''میں اپنے دھندے کے سلسلے میں گئی تھی۔ اس انجینئر سے بہت بڑی معلومات حاصل کی ہیں۔ ہمارا انڈر گراؤنڈ پریس جس علاقے میں ہے' وہاں کی ندی کا ایک پل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ انجینئر کہہ رہا تھا کہ سیلاب آئے گا تو پانی بہہ کر ہمارے پریس کی طرف آئے گا۔ اب تم بتاؤ اس تہہ خانے میں جو سو روپے کی پلیٹیں بنی ہوئی ہیں۔ چھاپنے کا جتنا سامان ہے اور چھپے ہوئے جتنے نوٹ رکھے ہوئے ہیں وہ سب کے

سب ضائع ہو جائیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم سیلاب آنے سے پہلے ہی ان تمام چیزوں کو وہاں سے منتقل کر دیں۔''

''میرے والد نے سمیرا کی رائے سے اتفاق کیا۔ اسی رات میں اور سمیرا ایک چھوٹی سی ویگن کار لے کر اس علاقے میں گئے جہاں بظاہر تو ہمارا کاغذوں کا گودام تھا لیکن اس کے تہہ خانے میں ایک چھوٹا سا پریس تھا۔ چھوٹی سی مشین تھی۔ ہم نے اس مشین کو وہاں سے اکھاڑ کر ویگن کار کے پچھلے حصے میں رکھا اور نوٹوں کے بنڈل کو بوریوں میں بھر دیا۔ اس کے اوپر کاغذ کی تہیں جما دیں۔

''وہ فضول سے کاغذات بہت زیادہ تھے۔ ان کے اندر سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں چھپائی گئی تھیں۔ جتنے نوٹ چھاپ کر رکھے گئے تھے۔ وہ سارے کے سارے ویگن کار کے ایک ہی ٹرپ میں نہیں لے جائے جا سکتے تھے۔ لہٰذا جتنے نوٹ ہم لے جا سکتے تھے۔ اتنے پہلی ٹرپ میں لے کر اپنی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ وہاں میرے والد نے تمام چیزوں کو سرونٹ کوارٹر میں لے جا کر مقفل کر دیا۔ اس وقت صبح ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ نیند پوری کرنے کے بعد دوسری ٹرپ کے لئے اسی گودام کی طرف جائیں گے۔ بہرحال ہم سونے کے بعد تقریباً ایک بجے بیدار ہوئے۔ میرے والد نے اخبار کی یہ خبر سنائی کہ شہر میں ایک بہت بڑے لیڈر کو سرِ عام قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لئے پولیس والے بہت سختی سے ہر ایک کی چیکنگ کر رہے ہیں۔ جو لوگ بریف کیس اور چرمی بیگ وغیرہ لے کر چلتے ہیں۔ رکشے' ٹیکسی یا دوسری گاڑیوں میں جاتے ہیں۔ ان کی ڈگی وغیرہ کھول کر چیکنگ کی جاتی ہے کہ وہ کوئی آتشیں اسلحہ لے جا رہے ہوں۔ شہر کے بدلے ہوئے حالات نے ہمیں پریشان کر دیا۔ میں نے کہا۔''ہمیں محتاط رہنا چاہئے کچھ روز تک ہم اپنے گودام کی طرف نہیں جائیں گے اور نہ ہی وہاں سے مال لے آئیں گے۔

''سمیرا نے میری مخالفت کی۔ وہ اتنی دولت وہاں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ میں تو ہر حال میں وہ روپے لے کر آؤں گی۔ اگر کل ہی بارش شروع ہو گئی اور وہاں سیلاب آ گیا تو کیا ہو گا؟ ہمارے اندازے کے مطابق وہاں سو سو کے تقریباً پچاس ہزار نوٹ ہیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تب اس نے ایک تدبیر بتائی کہ وہ نوٹ کس طرح لائے جا سکتے ہیں۔ تدبیر اچھی تھی۔ جب میں اس کے ساتھ چھوٹی سی ویگن کار میں بیٹھ کر گودام کے تہہ خانے میں پہنچا تو

وہاں اس نے نوٹوں کی کئی گڈیاں اپنے پیٹ پر باندھ لیں۔ اتنے سلیقے سے باندھا کہ وہ حاملہ عورت نظر آنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب تب میں اس کی زچگی ہونے والی ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا کر لئے اور کہا۔ دیکھو! جب کوئی پولیس والا ہمیں روکے گا تو میں اسی طرح اسے بے وقوف بناؤں گی۔ کوئی میرے پیٹ کو ہاتھ نہیں لگائے گا، ہے نا؟''

''ہم اس چھوٹی سی ویگن کار میں بیٹھ کر واپس اپنی کوٹھی کی طرف آنے لگے۔ قانون کے ہاتھ بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ وہ دور دور تک پہنچتے ہیں لیکن مجرم بھی کم چالاک نہیں ہوتے اپنے جرم کو چھپانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ پولیس کی ایک جماعت نے ہماری گاڑی کو روکنے کا حکم دیا۔ میں نے روک دیا۔ اسی وقت سمیرا تکلیف سے کراہنے لگی۔ پولیس والے ویگن کار کے کھلے حصے کی تلاشی لے رہے تھے۔ پھر انہوں نے اسٹیئرنگ سیٹ کی طرف دیکھا۔ سمیرا کو دیکھنے کے بعد پولیس آفیسر نے ادب سے کہا۔ سوری محترمہ! ہم اپنے فرض سے مجبور ہیں۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔

''میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں بہت خوش تھا۔ سمیرا کی تعریفیں کر رہا تھا کہ اس نے کتنی چالاکی سے پولیس والوں کو بیوقوف بنایا تھا۔ اسی خوشی میں، میں گاڑی کو تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا ہم جلد سے جلد اپنی کوٹھی میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ افضل کالونی کے ایک موڑ پر دوسری طرف سے ٹرک آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اسٹیئرنگ کو زور سے گھمایا تا کہ ٹرک کی زد سے نکل جاؤں۔ مگر ہماری گاڑی گھوم کر ایک چھوٹے سے بک اسٹال سے ٹکرا گئی۔ گاڑی رک گئی۔ میں بری طرح اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ وہ ڈیش بورڈ سے ٹکرا گئی۔ خیریت ہوئی کہ ہم زیادہ زخمی نہیں ہوئے۔ آس پاس کے لوگ ہمیں بچانے کے لئے آئے مگر ہم پہلے ہی محفوظ تھے۔ لوگوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ میں گاڑی کو پیچھے کی طرف ڈرائیو کر کے دکان سے الگ کرنے لگا۔ اس کے بعد دکاندار کو اپنے پاس بلایا تا کہ اس کے نقصان کی تلافی کر سکوں۔ وہ میرے پاس آیا اور وہ اکبر پاشا ہی تھا۔

''اکبر پاشا نے کھڑکی سے جھانک کر پہلے مجھے پھر سمیرا کو دیکھا۔ میں نے کہا۔ ہماری وجہ سے تمہاری دکان کا بہت نقصان ہوا ہے۔ تم جو ہرجانہ کہو گے ہم ادا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

''سمیرا ڈیش بورڈ پر جھکی ہوئی گہری گہری سانس لے رہی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اسے دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ اپنے زخموں پر اور اپنی تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اکبر پاشا نے اس کی طرف دیکھا، مسکرایا، پھر کہا۔ ''اجی آپ سے کیا نقصان کی تلافی کرانا ہے۔ بس جو مال لے جا رہے ہو، اس میں سے آدھا مجھے دے دیجئے۔''

''میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ یہاں سے جلدی کھسک جائیے اور مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیجئے۔ ورنہ لوگوں پر یہ انکشاف ہو جائے گا کہ آپ کی عورت کے پیٹ کے ساتھ جو کپڑا بندھا ہوا ہے وہ کھل گیا ہے اور نوٹ سیٹ کے نیچے گرے ہوئے ہیں۔

''وہ جواب کا انتظار کئے بغیر گاڑی کے دوسری طرف سے گھوم کر اس دروازے کی طرف آیا، جہاں سمیرا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''سمیرا میری طرف کھسک آؤ۔ اس شخص کو بیٹھنے کا موقع دو۔ ہمارا بھید کھل چکا ہے۔''

''سمیرا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اپنے پیٹ کے ساتھ بندھے ہوئے کپڑے کو دیکھا جو ڈھیلا ہو گیا تھا اس کے بعد اس نے اکبر پاشا کی طرف دیکھا۔ وہ دروازہ کھول کر اس سے لگا کھڑا تھا تا کہ وہ ذرا سا ادھر کھسکے تو بیٹھ سکے۔ سمیرا کو مجبوراً اسے جگہ دینی پڑی۔ اکبر پاشا نے بیٹھتے ہوئے دکان کی طرف دیکھ کر کہا۔ بیٹے! فوراً ہی دکان بند کرو اور گاڑی کے پیچھے آ کر بیٹھ جاؤ۔ بہت ضروری کام ہے۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔

''ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑا تا کہ دکان بند ہو سکے۔ بہر حال اس کے بیٹے حیات پاشا نے دکان کو بند کیا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے میں آ کر بیٹھ گیا۔ تب میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ آگے جا کر اکبر پاشا نے کہا۔ ''میں تمہارا راز دار بن کر رہوں گا۔ جو دولت تم اسمگل کر رہے ہو۔ اس کا مجھے آدھے کا پارٹنر بنا لو اور اپنے دھندے کے متعلق صاف صاف بتا دو، انکار کرو گے تو سمجھ لو میں بہت برا آدمی ہوں۔''

''اس نے جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا۔ میں نے کن انکھیوں سے چاقو کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم ہمارے ساتھ ہماری کوٹھی میں چلو۔ وہاں ہمارے والد ہیں۔ ان کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لینا۔

''اس نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے بیٹے کو ساتھ رکھا ہے۔ دراصل

میرا بیٹا بہت بڑا عامل ہے۔ ہپناٹزم کا ماہر ہے۔ یہ صدر میں اپنی دکان آٹھ بجے بند کرنے کے بعد میرے پاس آتا ہے پھر ہم باپ بیٹے اپنے گھر جاتے ہیں۔ اس وقت میں اپنے بیٹے کو اس لئے ساتھ لے جا رہا ہوں کہ جب میں تمہارے ساتھ تمہاری کوٹھی میں جاؤں گا تو یہ باہر دور کھڑا رہے گا۔ اگر میں اس کوٹھی سے واپس نہ ہو سکا اور مجھے مار ڈالا گیا یا نقصان پہنچایا گیا۔ تب یہ اپنے آدمی لے کر آئے گا اور تم لوگوں کی ایسی تیسی کر دے گا۔"

ظفر اپنی اور سمیرا کی ہسٹری بیان کر رہا تھا۔ جو دوسرے کمرے میں سنی جا رہی تھی اور ریکارڈ بھی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "داستان مختصر کرتے ہوئے یہ بتاؤ کہ تم لوگوں نے اکبر پاشا کو یہ بتا دیا کہ جعلی نوٹ چھاپنے کا کاروبار کرتے ہو؟"

ظفر نے کہا۔ "بتانا ہی پڑا۔ کیونکہ وہ آدھے آدھے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ہم نے اس سے کہا۔ پہلے پانچ ہزار روپے لے کر جاؤ اور انہیں بازار میں پھیلاؤ۔ اگر یہ کامیابی سے خرچ ہو گئے تو پھر تمہیں اگلے ماہ دس ہزار دیئے جائیں گے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ہم بہت کم تعداد میں نوٹ چھاپتے ہیں۔ زیادہ چھاپنے میں زیادہ پھیلانا بھی پڑتا ہے اور اس میں خطرہ ہے۔ وہ ہماری بات مان کر اس رات چلا گیا تھا۔

"وہ ہمارے کاروبار میں آدھے کا حقدار بننا چاہتا تھا۔ اپنے طور پر چالیں چلنے لگا۔ سمیرا کو پریشان کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ سمیرا مجھ سے طلاق لے لے اور اس کے بعد حیات پاشا سے شادی کر لے جب وہ اس کی بہو بن جائے گی تب اس کاروبار کے حصے میں اس کے بیٹے کا حق ہوگا۔"

میں نے ظفر سے کہا۔ "ٹھہرو ظفر! پہلے یہ بتاؤ۔ کیا سمیرا نے تم سے یہ کہا تھا کہ حیات پاشا بھی اس کا عاشق ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

ظفر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں! یہ بات سمیرا نے نہیں آپ نے مجھے کل رات بتائی تھی۔ سمیرا مجھ سے بہت سی باتیں چھپایا کرتی تھی اور میں اس کی محبت میں اور اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں سب کچھ بھول جایا کرتا تھا۔ کوئی شکایت نہیں کر سکتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "بہتر ہے کہ اب ہم دوسرے کمرے میں چلیں جہاں سمیرا بیٹھی ہوئی ہے۔ سمیرا سے پوچھا جائے کہ وہ اپنے شوہر ظفر سے بہت سی باتیں چھپاتی تھی اور کیسی چالیں چلتی رہی تھی۔"

ظفر پلنگ سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ سامری ہمارے آگے آگے چلتے ہوئے کمرے سے

باہر نکلا۔ میں اور ظفر اس کے پیچھے دوسرے کمرے میں پہنچے۔ وہ کمرہ بڑا تھا اور وہاں تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے یعنی وہی پولیس افسر، سپاہی، بیرسٹر لیلیٰ محسن، سمیرا، اکبر پاشا اور حیات پاشا۔ میں نے سمیرا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چہرے کی چاندنی پھیکی پڑ گئی تھی۔ وہ بدحواسی میں کبھی اِس کو، کبھی اُس کو دیکھ رہی تھی۔ جب ظفر کمرے میں داخل ہوا تو اس نے غصے سے اس کو دیکھا۔ اس کی نظروں میں شکایت بھی تھی اور وہ ایسی محبت سے دیکھ رہی تھی جیسے پھر اپنا جادو چلا کر ظفر کا بیان بدلوانا چاہتی ہو۔

ظفر اس سے نظریں چراتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ "سمیرا! ہمارے سوالوں کا جواب دیتی رہو۔ بتاؤ کہ تم نے اپنے شوہر سے یہ بات کیوں چھپائی۔ جس طرح تمہاری دوستی کبھی قادر جان سے تھی اسی طرح حیات پاشا سے بھی تمہاری دوستی رہی۔ اس کے بعد تم نے سامری سے دوستی کی۔ سامری کا ذکر بعد میں آئے گا۔ پہلے تم حیات پاشا کے بارے میں بتاؤ؟"

وہ ہچکچانے لگی۔ کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ ہم میں سے کسی پر اپنے حسن کا جادو چلا کر حالات کا رخ بدل دو گی اور تمہارا جرم ثابت نہیں ہوگا۔ اس جرم کا سب سے بڑا گواہ موجود ہے۔ جسے ہم قانونی طور پر وعدہ معاف گواہ بنا کر پیش کریں گے۔ دوسرا ثبوت وہ تمام چھپے ہوئے نوٹ اور چھاپنے کی مشین ہے جو تم لوگوں کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں مقفل ہے جب صبح تم ظفر کو ساتھ لے کر نکلیں اور اِدھر سامری کی طرف آنے لگیں تو اُدھر پولیس والوں نے سرونٹ کوارٹر کے اس حصے کو اپنے طور پر مقفل کر کے اپنی مُہر لگا دی ہے۔ کوئی اسے کھول نہیں سکے گا۔ اب بتاؤ؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں نے جو کچھ بھی کیا' اچھا کیا یا بُرا کیا۔ سب دولت کے لئے ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جتنے جعلی نوٹ چھپے ہوئے ہیں' وہ سرونٹ کوارٹر میں رہیں۔ میں انہیں خرچ کرنا چاہتی تھی۔ ادھر اکبر پاشا اڑا ہوا تھا کہ اسے آدھا حصہ ملنا چاہئے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے کاروبار کی ساری باتیں اسے معلوم ہو جائیں۔ مثلاً نوٹ چھاپنے کی مشین کہاں ہے؟ کدھر یہ کام ہوتا ہے اور اب تک کتنے نوٹ چھاپے جا چکے ہیں؟ ہم نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ میں ایسے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میرا بیٹا بہت بڑا عامل ہے۔ ہپناٹزم کا ماہر ہے۔ ظفر کو اس کے پاس بھیجا جائے۔ وہ ظفر کو ٹرانس میں لائے گا اور اس کے دماغ میں چھپی

ہوئی تمام باتیں معلوم کرلے گا۔''

سمیرا نے نظریں اٹھا کر اکبر پاشا کی طرف دیکھا' پھر کہا۔''ایک طرف اکبر پاشا جمشید کو مجبور کرتا تھا کہ اسے کاروبار میں آدھے کا حقدار بنایا جائے۔ دوسری طرف مجھ سے تنہائی میں ملتا تھا اور مجھے جمشید وغیرہ کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ کہتا تھا اگر میں اس کی بہو بن جاؤں گی تو جمشید مجبور ہو جائے گا۔ میں آسانی سے ظفر سے طلاق لے سکتی ہوں۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ الجھ گئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ تب میرے دماغ نے سمجھایا کہ مجھے حالات کے مطابق چلنا چاہئے۔ جس طرف پلہ بھاری ہوگا' اس طرف جھک جاؤں گی اور جسے نقصان پہنچا کر ختم کرنا ہوگا' اسے ختم کردوں گی۔ اسی لئے میں ظفر کو بھی کوئی بات صاف طور سے نہیں بتاتی تھی۔ جو چھپانے کی بات ہوتی تھی' اسے چھپا لیتی تھی۔''

میں نے سمیرا سے پوچھا۔''تمہارے کہنے سے ظفر تنویمی عمل کے لئے حیات پاشا کے پاس گیا تھا؟''

''ہاں! میں نے ظفر کو سمجھا دیا تھا کہ وہ تنویمی عمل کے لئے خود کو مائل نہ کرے اور قوت ارادی کو برقرار رکھے تو حیات پاشا اس پر ہپناٹزم کے ذریعے غالب نہیں آسکے گا اور اُسے تنویمی نیند سُلا کر اپنے مطلب کی باتیں نہ تو دماغ میں ٹھونس سکے گا' نہ ہی صحیح معلومات حاصل کرسکے گا۔ وہ جو کچھ بھی پوچھے تو ظفر اپنے کاروبار کے متعلق غلط معلومات فراہم کرے۔ ظفر کو میں نے اچھی طرح سکھا پڑھا کر حیات پاشا کے پاس بھیج دیا تھا۔''

میں نے ظفر کی طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا۔''اب تم بتاؤ کہ حیات پاشا نے تنویمی عمل کے دوران تم سے کیا پوچھا تھا اور کون سے احکامات تمہارے دماغ میں ٹھونسے تھے؟''

ظفر نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے حیات پاشا کی طرف دیکھا' پھر کہا۔''یہ عامل بڑی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ تنویمی عمل کے ذریعے میرے دماغ پر غالب آچکا ہے۔ اِدھر میں پورے ہوش وحواس میں تھا اور اس پر یہ ظاہر کررہا تھا کہ میں اس کا معمول بن چکا ہوں۔''

میں نے کہا۔''ظفر ذرا اختصار سے بتاؤ کہ حیات پاشا نے تنویمی عمل کے دوران تم سے کیا کہا تھا؟''

ظفر نے صوفے پر سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے کہا۔''حیات پاشا نے مختلف سوالوں کے

ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہم جعلی نوٹ چھاپنے کا کاروبار کس طرح کرتے ہیں۔ جس طرح ایک خفیہ کاروبار کیا جاتا ہے۔ میں نے اسی طرح جواب دیا لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ نوٹ چھاپنے کی مشین اور سو سو کے تقریباً پچاس ہزار نوٹ ہم نے کہاں چھپا کر رکھے ہیں۔ اسے میں نے دوسری جگہ بتادی۔ پھر اس نے میرے دماغ کو اس حکم کا پابند بنایا کہ میں سمیرا پر قاتلانہ حملے کروں گا' لیکن قتل نہیں کروں گا اسے صرف دہشت زدہ کرتا رہوں گا۔ میں نے اس کی بات مان لی تھی کیونکہ میں اس کا معمول بنا ہوا تھا۔ پھر اس نے میرے دماغ میں یہ حکم ٹھونس دیا کہ میں اپنے باپ کو قتل کروں گا۔''

حیات پاشا نے چیخ کر کہا۔''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ غلط بیانی کے ذریعے ہمیں پھانسنا چاہتا ہے۔ ہمارا اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی میں نے ہپناٹزم کے ذریعے اسے ایسے احکامات دیئے تھے۔''

شاید اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی پولیس آفیسر نے تڑاخ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کردیا۔ پھر کہا۔''جس سے جو سوال کیا جائے، وہی جواب دے۔ باقی سب لوگ چپ چاپ سنتے رہیں۔''

یہ کہہ کر آفیسر نے ظفر کی طرف دیکھا۔ ظفر نے کہا۔''دراصل اکبر پاشا نے میرے باپ کو پندرہ دن کی مہلت دی تھی اور کہا تھا۔ اگر پندرہ دن کے اندر اسے آدھے کا حصہ دار نہ بنایا گیا تو وہ پولیس میں تو رپورٹ نہیں کرے گا کیونکہ اس سے اسے فائدہ حاصل نہیں ہوگا لیکن کوئی ایسی چال چلے گا جس سے ہم اسے پارٹنر بنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اِسی لئے حیات پاشا نے تنویمی عمل کرنے کے دوران پندرہ دن کے بعد کا ایک دن مقرر کیا تھا اور مجھے حکم دیا تھا کہ اس رات میں اپنے باپ کی خواب گاہ میں جا کر اسے قتل کردوں گا۔''

میں نے اکبر پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''یہاں تمام لوگوں کے بیانات ختم ہونے کے بعد تمہارے گھر کی تلاشی لے جائے گی۔ سمیرا نے اب تک تمہیں دس' پندرہ ہزار روپے دیئے ہیں تاکہ تمہارا منہ بند رکھا جائے وہ سارے سو سو کے نوٹ جعلی ہیں۔ تمہارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد تھوڑے بہت نوٹ تو ضرور وہاں سے نکلیں گے۔ لہٰذا تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جعلی نوٹوں کے اس کاروبار میں تم شامل نہیں رہے ہو۔ اس لئے کوئی اعتراض کئے بغیر اب یہ بتادو کہ تم جمشید کو قتل کیوں کرانا چاہتے تھے اور سمیرا پر محض دکھاوے کا قاتلانہ حملہ کیوں ضروری تھا؟''

وہ جواب دینے پر مجبور تھا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں پولیس آفیسر کو دیکھا۔ جو اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ''ہاں جناب! میرا قصور ہے۔ میں ان کے کاروبار میں آدھے کا حصہ دار ہونا چاہتا تھا۔ میں نے سمیرا اور جمشید وغیرہ کو دھمکی دی تھی کہ میری بات نہ ماننے پر ان کے سامنے بُرے نتائج آئیں گے۔ سمیرا کو دہشت زدہ کرنے کے لئے میں نے اپنے بیٹے کے ذریعے قاتلانہ حملے والی بات ظفر کے دماغ میں بٹھا دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ٹرانس میں نہیں آیا ہے اور ڈھونگ رچا رہا ہے۔ بہرحال دوسری طرف میں جمشید کو قتل کرانا چاہتا تھا تاکہ اس کاروبار کا ایک پارٹنر ختم ہو جائے اور اس قتل کے الزام میں ظفر بھی پھانسی کے تختے پر چڑھ جائے۔ پھر سمیرا آزاد ہو گی اور میرے بیٹے سے شادی کرلے گی۔ اس کے بعد ہم تنہا اس کاروبار کے مالک ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''سمیرا! اب آگے تم کہو۔''

وہ کہنے لگی۔ ''ظفر نے آ کر مجھے بتا دیا تھا کہ جھوٹے تنویمی عمل کے ذریعے انہیں کن احکامات کا پابند بنایا گیا ہے۔ تب میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ میں اس بات کا واویلا مچاؤں گی کہ مجھ پر قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں۔ میں یہ بھی ظاہر کروں گی کہ میری بھوک مر گئی ہے اور نیند اُڑ گئی ہے۔ پھر ڈاکٹر میرا علاج کریں گے۔ میں ان کی دواؤں کو ناکام ثابت کروں گی اور اس سے پہلے پروفیسر سامری سے دوستی کروں گی تاکہ وہ تنویمی عمل مجھ پر کرے اور میں یہ بات معمولہ بن کر ڈاکٹروں پر اور کسی ایک ذمہ دار آفیسر پر ظاہر کر دوں کہ اکبر پاشا نامی ایک شخص مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ بلیک میلنگ کی میں نے دوسری بات بتائی تھی۔ اصل وجہ چھپالی تھی۔''

میں نے سمیرا سے کہا۔ ''قصہ مختصر یہ کہ تم نے سامری سے دوستی کی پھر؟''

وہ بولی۔ ''یہ دوسرے لوگوں کی طرح پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر عاشق ہو گیا۔ یہ مجھے کیا سحرزدہ کرتا' میں اسے سحرزدہ کرنے لگی۔ جب سامری پوری طرح دیوانہ ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میری ہر اچھی اور بُری بات مان لے گا تب میں نے اسے بتایا کہ میں کن الجھنوں میں گرفتار ہوں؟ میں نے اُسے ساری باتیں بتائیں صرف جعلی نوٹ چھاپنے والی بات چھپالی۔ میں نے اسے یہ سمجھا دیا کہ ہمارے پرنٹنگ پریس سے اتنی آمدنی ہوتی ہے کہ میں اور کسی شخص کو اس کا پارٹنر بنا کر نقصان کی طرف نہیں جانا چاہتی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہر طرح سے میری مدد کرے گا۔ ایسے ہی وقت بیرسٹر لیلیٰ محسن نے سامری اور مسٹر ابن

شہاب کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ یہ بات ہمارے معاملے سے بالکل الگ تھی لیکن ابن شہاب نے پروفیسر سامری کے ہپناٹزم والے علم سے دلچسپی ظاہر کی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سامری عامل بن کر کسی کو بھی کس طرح معمول بناتا ہے۔ کس طرح اپنے احکامات کا پابند کر لیتا ہے اور کس طرح ذہنی مریضوں کے دماغ کے اندر پہنچ کر ان کے مرض کی اصل وجہ معلوم کر لیتا ہے۔''

میں نے سمیرا سے پوچھا۔ ''کیا مسٹر سامری نے تمہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ جب تم سامری کی معمولہ بنو گی میں چھپ کر یہ تماشا دیکھتا رہوں گا۔''

سمیرا نے تائید میں سر ہلایا اور کہا۔ ''ہاں! سامری نے مجھے پہلے سے بتا دیا تھا۔ میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ بیرسٹر لیلیٰ محسن قانون سے کھیلتی ہے۔ اس کے آدمی کو یہ تماشا دکھانا مناسب نہیں ہے۔ وہ میری رُوداد سنے گا تو اکبر پاشا اور جمشید وغیرہ کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اس پر سامری نے مجھے سمجھایا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ اگر اس طرح ابنِ شہاب کے ذریعے دو میں سے ایک کانٹا نکل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کوئی بات بگڑے گی تو وہ مسٹر شہاب سے دوستی کے ناطے بگڑے ہوئے کام کو بنالے گا۔ میں نے اطمینان ظاہر کیا۔ پھر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکٹر اور ابنِ شہاب وغیرہ میرے معمولہ بننے کا تماشا دیکھیں گے۔ میں سامری کی معمولہ بن گئی۔''

میں نے کہا۔ ''ان سارے بیانات سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ہپناٹزم کا عمل شروع سے نہیں تھا۔ سامری اگرچہ ہپناٹزم کا ماہر ہے لیکن وہ فراڈ کرتا رہا۔ ڈاکٹروں کو بھی بے وقوف بنایا گیا اور دونوں عاشق اور معشوق ہسپتال کے اسی کمرے میں عامل اور معمولہ کا کھیل کھیلتے رہے۔ حیات پاشا بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ اس نے پوری کامیابی سے ہپناٹزم کا عمل کیا ہے اور ظفر کے دماغ کو تسخیر کیا ہے۔ آج اس وقت بھی سمیرا اور سامری مطمئن تھے کہ ظفر کو سکھا سکھایا معمول بنا کر ہمیں بے وقوف بنا دیں گے لیکن ظفر جواب تک اس کے حسن سے سحرزدہ رہا اب اس کے طلسم سے نکل آیا ہے۔''

پروفیسر سامری نے کہا۔ ''آفیسر! ان تمام لوگوں کے بیانات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ میں جعلی نوٹوں کے کاروبار میں ملوث نہیں رہا۔''

آفیسر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک تم اس کاروبار میں شریک نہیں تھے لیکن سمیرا کے آلہ کار بن کر اس کی مدد کر رہے تھے۔ تم انجان تھے لیکن اپنے علم کو غلط طریقے سے

استعمال کر رہے تھے۔ ہسپتال کے ڈاکٹروں کو بھی تم نے بے وقوف بنایا۔ ابھی میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ یہاں آ کر بیٹھا ہوا ہوں اور تمام لوگوں کے بیانات ریکارڈ کر رہا ہوں تو تم دوسرے کمرے میں ظفر کے ساتھ وہی عامل اور معمول کا جھوٹا کھیل کھیلنے والے تھے۔ یہ تو ظفر نے پانسہ پلٹ دیا۔ کیسے پلٹ دیا؟ وہ مسٹر ابن شہاب بتائیں گے۔''

اب میں یہ نے کہنا شروع کیا۔ ''آفیسر! یہ سمیرا بڑی چالباز ہے اکبر پاشا اور اس کے بیٹے نے ظفر کے دماغ کو اپنے طور پر تسخیر کیا تھا اور یہ بات دماغ میں بٹھا دی تھی کہ یہ اپنے باپ کو قتل کرے گا۔ یہی بات حیات پاشا اور اکبر پاشا کے لئے مصیبت بن گئی۔ میں نے اکبر پاشا کے ہاں جا کر اسے سمجھایا کہ سمیرا کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے اگر کسی دوسرے عامل کے ذریعے پھر ایک بار ظفر پر تنویمی عمل کیا جائے اور اس کے دماغ سے یہ اگلوا لیا جائے کہ عامل حیات پاشا نے اسے کن احکامات کا پابند بنایا ہے، تو دونوں باپ بیٹے قانون کی گرفت میں آ جائیں گے۔ ادھر سمیرا نے اگر کسی طرح جمشید کو قتل کرا دیا تو یہ بات بھی عامل حیات پاشا کے سر جائے گی کہ اس نے دماغی طور پر ظفر کو ٹریپ کرانے کے بعد ایسی واردات کی ہے۔ جب اکبر پاشا نے دیکھا کہ یہ بری طرح پھنس رہا ہے تو اس نے کل رات سمیرا سے سمجھوتہ کر لیا۔ شاید سمیرا نے اسے کچھ رقم دی اور یہ رقم لینے کے بعد شہر چھوڑ کر اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ معاملہ تو ختم ہو رہا ہے۔ یہ پتہ نہیں کون سا ناجائز کاروبار کر رہے تھے جو ہمیشہ کے لئے چھپا رہ جائے گا اور ان کا سمجھوتہ قانون کے لئے ایک چیلنج بن جائے گا۔ یہ کبھی گرفت میں نہیں آ سکیں گے۔ تب میں نے ظفر کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ رات کو سمیرا کا فون آیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر غلطی کی کہ یہ اپنے بیڈ روم سے فون پر باتیں کر رہی ہے اور مجھے شبہ تھا کہ یہ پروفیسر سامری کے پاس اپنا وقت گزار رہی ہوگی۔ میں نے اس سے گفتگو ختم کر کے اپنے شبہ کی تصدیق کی۔ سمیرا کے فون نمبر پر ڈائلنگ کی۔ پتہ چلا کہ وہاں ظفر اکیلا ہے اور وہ اسے خواب آور دوا کھلا کر چلی گئی ہے۔ کیوں ظفر ذرا تم بتاؤ کہ تمہیں خواب آور دوا کیوں کھلائی گئی؟''

ظفر نے کہا۔ ''ادھر میں کچھ دنوں سے پریشان تھا۔ ایک تو کاروبار میں اکبر پاشا شریک ہونا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ میری حسین بیوی کے بہت سے طلب گار پیدا ہو گئے تھے۔ جہاں میں نظر اٹھا کر دیکھتا تھا وہاں میرا ایک رقیب نظر آتا تھا۔ ادھر سمیرا مجھے بڑی محبت سے بہلا پھسلا کر موم کر دیتی تھی۔ رات کو میں پہلو بدلتا رہا۔ اس نے مشورہ دیا کہ نیند

کی ایک آدھ گولی کھا کر سونا چاہئے۔ کل رات بھی اس نے مجھے نیند کی دو گولیاں کھلائیں اور میں سو گیا لیکن دماغ کی پریشانیاں اتنی تھیں کہ دو گولیوں کا خاص اثر نہیں ہوا۔ جب فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی۔ تب میری نیند ٹوٹ گئی اور شہاب صاحب سے باتیں ہوئیں۔ ان کے ذریعے معلوم ہوا کہ میری بیوی سمیرا مجھے گہری نیند سلا کر کسی عاشق کے پاس گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد شہاب صاحب میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے وہ کیسٹ سنایا جوان کے اور سمیرا کے درمیان فون پر گفتگو کے دوران ریکارڈ کیا گیا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ میں کیوں ایک عورت کے حسن کا اس قدر دیوانہ ہوں کہ ہمیشہ بے وقوف بنتا رہتا ہوں اور یہ مجھے اُلّو کا پٹھا سمجھ کر اپنے دوسرے عاشقوں کے پاس راتیں گزارتی ہے۔ اسی وقت میں نے شہاب صاحب سے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا کہ جو کچھ کہیں گے۔ میں اسی پر عمل کروں گا اور میں نے اسی پر عمل کیا۔''

سمیرا نے غصے سے پوچھا۔ ''تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارا باپ بھی جیل میں جائے گا۔''

''سب کچھ سوچ لیا تھا۔ ہم نے خلافِ قانون کام کیا ہے۔ ہم مجرم ہیں اور سب سے بڑا مجرم تو میں ہوں کہ حسن سے سحرزدہ ہوتا رہا۔ نیکی، شرافت اور ایماندارانہ زندگی کی طرف مائل نہ ہو سکا۔ اب ابنِ شہاب کے ذریعے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے اور قانون کا ساتھ دے رہا ہوں تو میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ میرا ضمیر اب مجھے ملامت نہیں کرے گا۔ میں اب ایک مکمل مرد ہوں۔ ایسا مرد جو عورت کا غلام نہیں ہوتا۔''

میں نے بیرسٹر لیلیٰ محسن کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر بولی۔ ''آفیسر! میں نے اپنا بہت سا وقت یہاں صرف کیا ہے۔ مجھے دوسرا کام بھی ہے۔ آپ بیانات تیار کر کے رکھیں۔ میں کسی وقت تھانے میں آ کر دستخط کر دوں گی۔ ابن شہاب بھی میرے ساتھ آئیں گے۔ کیا اجازت ہے؟''

آفیسر نے اٹھ کر ادب سے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ دونوں کی وجہ سے مجھے ایک بہت بڑا کیس ملا ہے۔ میں تھانے میں شام کو آپ کا انتظار کروں گا۔''

میں اور لیلیٰ اس کمرے سے باہر آئے۔ پھر خاموشی سے چلتے ہوئے سامری کی کوٹھی

سے نکلے۔ پورچ میں ہماری کار کھڑی تھی۔ میں نے اسٹیرنگ سیٹ سنبھال لیا۔ وہ میرے بازو والی سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ایک بات بتاؤ! کیا ہپناٹزم کوئی کامیاب علم نہیں ہوتا؟''

میں نے کہا۔ ''بہت کامیاب علم ہوتا ہے۔ یہ پروفیسر سامری کتنے ہی ذہنی مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا ہے لیکن حسین عورت کے آگے یہ علم دُم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ دیکھونا بے چارا سامری کیسا دُم کٹا ہو گیا۔ خدا عورتوں سے بچائے۔''

وہ آنکھیں دکھا کر بولی۔ ''اے! منہ سنبھال کر باتیں کرو۔ میں بھی عورت ہوں۔ کیا مجھے بھی سمیرا جیسی عورت سمجھا ہے۔ میری طرف دیکھو اور جواب دو۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں۔ میں نے اپنی آنکھوں میں خمار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری آنکھیں سمندر ہیں۔ میں ان آنکھوں میں ڈوب رہا ہوں۔ یہ مجھے سحر زدہ کر رہی ہیں۔ مجھے اپنا معمول بنا رہی ہیں۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔ ہائے میں تو دُم کٹا ہو گیا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

☆======☆======☆

اصل رُوپ

ایک حسین ساحرہ کا عبرت انگیز قصہ
جس نے سب کو سحر زدہ کر رکھا تھا۔
تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانی۔

مغرب کی نماز کے بعد سمیرا کی منگنی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ تمام قریبی رشتے داروں کو دعوت نامے بھیج دیئے گئے تھے لیکن مغرب کی نماز سے ایک گھنٹہ پہلے بہت بڑی ٹریجڈی ہوگئی۔ شام کو سمیرا کی خوبصورت ایرانی بلی چھت پر گئی تھی پھر وہاں سے اوراوپر عالمِ بالا کی طرف پرواز کرگئی۔

بلیاں مرتی ہی رہتی ہیں۔ اس گھر کے مردوں پر بلی کی موت کا کوئی اثر نہ ہُوا، البتہ عورتیں متاثر ہوگئیں کہ منگنی کے مبارک موقع پر ایک بلی کا مرنا بدشگونی ہے۔ سمیرا رو رہی تھی اور غصے سے تلملا رہی تھی۔ رونا اس بات پر آ رہا تھا کہ وہ اس کی چہیتی بلی تھی۔ غصہ اس بات کا تھا کہ کسی نے اسے مار ڈالا تھا۔

اس کے ڈیڈی اور انکل نے اُسے سمجھایا کہ بیٹی صبر کرو گھر کے کسی فرد نے اسے نہیں مارا ہے، اور چھت پر باہر کا کوئی آدمی آکر اسے نہیں مار سکتا تھا۔ پڑوس کی چھت سے کسی بلّے نے آکر اسے ہلاک کیا ہے۔

سمیرا ایک ضدی لڑکی تھی۔ اپنی بلی کے قاتل کو معاف نہیں کرسکتی تھی، خواہ وہ بلا ہو یا انسان۔ وہ اپنے ڈیڈی کا ریوالور لے کر چھت پر گئی تا کہ کوئی بھی بلا نظر آئے تو اُسے شوٹ کردے۔ وہ اپنے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ جب بھی اسے غصہ آتا تو وہ اسی طرح ریوالور ہاتھ میں لے کر دندناتی پھرتی تھی۔ کچھ نہیں ملا تو ملازموں کو ہی شوٹ کرنے کی دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔ ویسے سب جانتے تھے کہ ریوالور چلانا تو دور کی بات ہے وہ گولی چلنے کی آواز سن کر ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔

جب وہ چھت پر چلی گئی تو اس کی آنٹی یا ہونے والی ساس نے کہا۔ ''یہ شگون اچھا نہیں ہے۔ منگنی کی تاریخ بدل دی جائے تو بہتر ہوگا۔''

سمیرا کے باپ نے کہا۔ ''اگر آج منگنی نہ ہوئی تو پھر کبھی نہ ہوسکے گی۔ آپ تو جانتی ہیں بھابی کہ سمیرا ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ اب تک کتنے ہی لڑکوں کو اس نے پسند کیا،

دوستی کی، ان کے ساتھ ہنستی بولتی رہی مگر جب شادی کی بات آئی تو اس نے انکار کردیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا بیٹا واجد اسے پسند آگیا ہے۔ وہ شادی کے لئے بھی راضی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فوراً ہی منگنی نہ کی گئی تو ہوسکتا ہے کہ پھر اس کا ارادہ بدل جائے، میں تو چاہتا ہوں کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے اصول پر عمل ہو۔ آج منگنی اور اگلے ماہ شادی......''

واجد کے باپ نے تائید کی۔ ''ٹھیک ہے بھائی جان! آپ اگلے ماہ کی کوئی تاریخ مقرر کردیجئے۔ ہم بارات لے آئیں گے۔''

سمیرا کی ماں نے ڈرتے ڈرتے اعتراض کیا۔ ''مگر سمیرا کا موڈ آج ٹھیک نہیں ہے۔ اُس کی چہیتی بلی......''

سمیرا کے باپ نے ڈانٹ دیا۔ ''اُس کی بلی مرگئی ہے، ماں تو نہیں مرگئی ہے کہ منگنی اور شادی سے انکار کردے گی۔ میں ابھی جا کر پوچھتا ہوں کہ اس کی مرضی کیا ہے؟''

وہ اپنی بیٹی سے پوچھنے کے لئے چھت پر چلا گیا۔ سمیرا کی ماں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے واجد کی ماں سے کہا۔ ''جب میں چھوٹی سی تھی، اس وقت میرے ننھیال میں ایک ایسا واقعہ ہُوا تھا۔ میری نانی اماں بتاتی ہیں کہ ایک بدروح آتی تھی اور کتے بلیوں کا خون چوس کر چلی جاتی تھی۔ میں نے چھت پر جا کر دیکھا ہے۔ سمیرا کی بلی کی گردن کا گوشت اُدھڑا ہُوا تھا مگر خون نظر نہیں آیا۔ کسی نے چوس لیا ہوگا۔''

واجد کی ماں خوف سے لرز گئی۔ واجد کے باپ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں تو بھابی جان۔ وہ آپ کے ننھیال والی بدروح کا کیا بنا؟ آپ کی نانی اماں نے تو اسے دیکھا ہوگا؟''

سمیرا کی ماں نے جواب دیا۔ ''بیشک انہوں نے دیکھا تھا۔ وہ بدروح بعد میں جوان لڑکیوں کا خون پینے لگی تھی۔ یہ آج کل کی لڑکیاں بدروحوں اور بھوتوں سے ذرا نہیں ڈرتیں۔ سمیرا کو دیکھو، اکیلی چھت پر چلی گئی ہے۔ کبھی اس کے باپ نے بھی ریوالور چلایا تھا۔ اگر سچ مچ وہاں کوئی جن بھوت ہُوا تو وہ تنہا جوان لڑکی کیا کرے گی۔''

واجد نے تسلی دی۔ ''آنٹی۔ انکل وہاں گئے ہیں، وہ سمیرا کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔''

آدھ گھنٹے بعد سمیرا کے ڈیڈی تنہا واپس آگئے۔ انہوں نے خوشخبری سُنائی کہ سمیرا راضی ہے اور آج ہی منگنی کی رسم ادا ہوجائے گی۔ اس کی والدہ نے کہا۔

''منگنی یہاں نیچے ہوگی۔ وہ اوپر کیا کررہی ہے؟''

''وہ قاتل بلّے کا انتظار کر رہی ہے۔''

''اگر بلّے کی بجائے کوئی بھوت آ گیا تو؟''

''بھوت تمہاری جیسی جاہل عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ذرا ضدی ہے۔ بلا وِلا کوئی نہیں آئے گا۔ وہ مایوس ہو کر خود ہی چلی آئے گی، اچھا ہے، چھت پر ہوا خوری ہو رہی ہے۔''

باتوں ہی باتوں میں ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ کچھ مہمان آنے لگے۔ اس بار واجد ڈرائنگ روم سے نکل کر کاریڈور میں آیا۔ کاریڈور کے آخری سرے پر ایک زینہ اوپری منزل کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے پھر ایک تنگ و تاریک زینہ چھت کی طرف لے جاتا تھا۔

وہ چھت پر پہنچا تو سمیرا وہاں ٹہل رہی تھی۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور چاندنی میں اس کے چہرے کی چاندنی کچھ اور کھل گئی تھی۔ شام کو روتی رہی تھی اس لئے آنکھیں دھل کر روشن ہو گئی تھیں اور سیدھی دل پر دستک دیتی تھیں۔ اس وقت اس نے نارنجی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ منی بلاؤز کے نیچے پیٹ کی چکناہٹ، کمر کا خم اور کولہوں کا ابھار نگاہوں کو پکارتا تھا۔ ایک تو وہ حسین تھی، اوپر سے دولت مند بھی تھی۔ اس لئے ضرورت سے زیادہ حسین نظر آتی تھی۔ اس کے کتنے ہی چاہنے والے تھے، کتنوں کو وہ طرح دے گئی تھی۔ ایک واجد ہی ایسا خوش نصیب تھا جو منگنی کی منزل تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی پہنچا نہیں تھا۔ ایرانی بلی کی موت نے یہ خدشہ پیدا کر دیا تھا کہ منزل سراب بھی بن سکتی ہے۔

چھت پر ایک کمرہ نما چار دیواری تھی جس کے دروازے سے زینہ نچلی منزل کی طرف گیا تھا۔ واجد اس دروازے پر کھڑا ہُوا بڑی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چار دیواری کے سائے میں واضح طور سے نظر آ رہا تھا۔ سمیرا کی نظر اُس پر گئی تو اُس نے فوراً ہی ریوالور تان کر پوچھا۔

''کون ہے وہاں؟''

''تمہارا واجد!'' وہ مسکراتا ہُوا چاندنی میں آ گیا۔

سمیرا چھت کی منڈیر سے ٹیک لگا کر بولی۔ ''کیا مہمان آ گئے؟''

''کچھ آ گئے ہیں، کچھ آنے ہی والے ہیں۔ اب تمہیں نیچے چلنا چاہئے۔ وہ بلا اب نہیں آئے گا۔''

وہ ناراضی سے بولی۔ ''کیا تم چاہتے ہو کہ وہ نہ آئے اور میں بلی کا انتقام نہ لے

سکوں؟''

''آں؟'' وہ بوکھلا کر بولا۔ ''تمہیں ضرور انتقام لینا چاہئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ منگنی کی رسم ادا ہونے کے بعد ہم دونوں یہاں آئیں گے اور بلے کا انتظار کریں گے۔''

''منگنی کے بعد تم پیار و محبت کی باتیں کرو گے یا بلے کا انتظار کرو گے؟''

سمیرا کے سوال نے اُسے الجھا دیا۔ اگر وہ پیار محبت کی بات کہتا تو انتقام کی اہمیت ختم ہو جاتی۔ اگر انتقام کے لئے کہتا تو محبت کی اہمیت کم ہو جاتی۔ منگنی کا وقت قریب تھا۔ اس امیر زادی کا دل جیتنا ضروری تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! دونوں باتیں ضروری ہیں۔ جب ہم منگنی کے بعد یہاں آئیں گے تو چاند کچھ اور جوان ہو جائے گا۔ چاندنی تمہاری آنکھوں میں اترے گی، ہماری زبان پر محبت گنگنائے گی۔ میرے سینے میں دل دھڑکتا رہے گا اور تمہارے ہاتھوں میں ریوالور لرزتا رہے گا۔ محبت اور بارود ایک جگہ نہیں رہتی۔ میں دعا کروں گا کہ بلا جلد ہی آ جائے۔''

سمیرا نے پوچھا۔ ''تم دعا کرنے کی بجائے مہمانوں کو لطیفے نہیں سنا سکتے؟ کل ہی تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تمہیں سوڈیڑھ سو لطیفے یاد ہیں۔ تم ایک ایک کر کے، ٹھہر ٹھہر کر سناؤ گے تو مہمان دو تین گھنٹے تک مجھے بھول جائیں گے۔ اتنی دیر میں وہ بلا ضرور آ جائے گا۔ اگر نہیں آئے گا تو میں تمہارے لطیفوں کا اسٹاک ختم ہوتے ہی چلی آؤں گی۔ ٹھیک ہے ناں! اینی آبجکشن؟''

وہ بھلا اس کے مشورے پر اعتراض کیسے کر سکتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ صرف ڈیڑھ سو لطیفوں کی بات ہے۔ وہ کسی طرح روتے گاتے سنا دے گا۔ اس کے بعد وہ اُس کی بن جانے کے لئے ڈرائنگ روم میں آ جائے گی۔ اُس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''تمہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا ہے مگر تمہارے حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔''

اُس نے چار دیواری سے لگی ہوئی چارپائی کو بچھاتے ہوئے کہا۔ ''تم کب تک کھڑی رہو گی۔ تھک جاؤ گی۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔''

''تم میری فکر نہ کرو، یہاں سے جلدی جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے بلانے کے لئے پھر کوئی یہاں آ جائے۔ یہاں تم لوگوں کے آ جانے سے شاید وہ بلا بدک جاتا ہے۔''

''اچھی بات ہے، جاتا ہوں اور یہاں کسی کو آنے نہیں دوں گا۔ تم بھی اپنا وعدہ یاد

رکھنا، جلدی چلی آنا..........''

''جلدی نہیں۔ تین گھنٹے۔'' سمیرا نے کہا۔

''اچھا۔ تین گھنٹے بعد ہی سہی۔ مگر آ جانا''

وہ نیچے چلا گیا۔ سمیرا بڑبڑانے لگی۔ ''سب ہی خودغرض ہیں کسی کو میری پیاری پوسی کی موت کا صدمہ نہیں ہے۔ میری دلجوئی کے لئے ایک زبان سے افسوس کرتے ہیں اور دوسری زبان سے منگنی کی خوشیاں منانا چاہتے ہیں۔ اُونہہ۔''

وہ پھر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ چاند کی روشنی میں آس پاس کی چھتیں ویران نظر آ رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی گلابی سردی تھی، اس لئے چھتوں پر کوئی سونے نہیں آتا تھا۔ وہ ٹہلنے کے دوران منڈیر سے نیچے جھانک کر آس پاس کے مکانوں کو دیکھتی رہی۔ مکانوں کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ اسے اپنے مکان کی سب سے نچلی کھڑکی سے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ شاید واجد نے اس کے حکم کے مطابق لطیفہ گوئی شروع کر دی تھی۔

پھر مرد اور عورتوں کے ملے جلے قہقہے خاموش ہو گئے۔ ذرا دیر کے لئے گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس سے زیادہ گہرا اور موت کا سا سناٹا سمیرا کے آس پاس تھا۔ موت کی سی خاموشی میں اسے اپنی پوسی کی موت بے چین کر رہی تھی۔ جب تک وہ انتقام نہ لیتی، اسے قرار نہ آتا۔ اس نے دور دور کی چھتوں پر نظریں دوڑائیں۔ آخر طویل انتظار کے بعد وہ نظر آ گیا۔

وہ آ رہا تھا۔ رحمت چاچا کی چھت پر چاروں پنجوں کے بل چیتے جیسی مستانی چال چلتا آ رہا تھا۔ وہ بڑے قد کا بلا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ دونوں آنکھیں دور سے ریڈیم ڈائل کی طرح چمک رہی تھیں سمیرا کے ریوالور کی نال اُٹھ گئی۔ انگلی ٹریگر تک پہنچ گئی۔ بس اس قاتل بلّے کے ذرا قریب آنے کا انتظار تھا۔

وہ رحمت چاچا کی چھت پر سے چھلانگ لگا کر سمیرا کی چھت پر آیا اور منڈیر پر دوڑنے لگا۔ سمیرا نے اسے نشانے پر رکھ کر ٹریگر دبایا اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کان کے اندر انگلی ٹھونس لی تھی لیکن فائرنگ نہ ہو سکی۔ ٹریگر نہ دب سکا۔ پتہ چلا کہ اُس نے سیفٹی کیچ نہیں ہٹایا تھا۔ اس نے جلدی سے سیفٹی کیچ کو ہٹایا۔ اتنی دیر میں بلا چھلانگ لگا کر منڈیر سے چاردیواری کی چھت پر پہنچ گیا اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شاید وہ چھت پر دبک کر بیٹھ گیا تھا۔

سمیرا دوڑتی ہوئی چاردیواری کے ایک طرف آئی اور سر اٹھا کر چھت کی جانب

دیکھنے لگی لیکن وہ چھت اس کے قد سے اونچی تھی۔ بلا ادھر سے نظر نہیں آیا۔ وہ چاردیواری کے دوسری طرف آئی۔ وہاں چارپائی کے اوپر چڑھ کر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اپنے پڑوسی مرزا صاحب کے مکان کی طرف دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

دونوں مکانوں کے تقریباً چھ فٹ کا فاصلہ تھا دونوں کی چھتوں پر جو منڈیریں بنی ہوئی تھیں ان پر لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہوا تھا۔ کسی نے اُس چھت سے اس چھت پر آنے کے لئے وہ تختہ بچھایا تھا لیکن ایسا کون کر سکتا تھا؟ مرزا صاحب کا مکان پچھلے ایک ہفتے سے خالی پڑا تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ ایک ماہ کے لئے خیرپور گئے ہوئے تھے۔

سمیرا نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا کہ شاید وہ اپنی فیملی کے ساتھ واپس آ گئے ہوں۔ مگر نہیں۔ ان کے مکان کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ روشندان سے پتہ چل رہا تھا کہ وہاں ہر رات بدستور تاریکی رہتی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اُلٹے قدموں چلنے لگی۔ سوچنے لگی کہ ایسا کس نے کیا ہے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک ویران اور غیر آباد مکان کی چھت سے محلے کا کوئی آدمی اس تختے کے سہارے آیا ہو کیونکہ دوسرے مکانوں کی چھتیں ذرا دور تھیں اور وہ تختہ دوسرے مکان کی چھتوں کو نہیں ملا سکتا تھا۔

وہ پیچھے کی طرف چلتی ہوئی چارپائی کے قریب آ گئی۔ اسی وقت ایک سایہ ہولے ہولے سے اس کے سر پر آیا۔ وہ پانچ انگلیوں کا سایہ تھا۔ اس کے پیچھے چاردیواری کی چھت سے ایک مردانہ ہاتھ اُتر کر اس کے سر پر سایہ فگن ہو رہا تھا۔

اُس ہاتھ کی انگلیاں موٹی اور کھردری تھیں اور اس انداز میں مڑی ہوئی تھیں جیسے سمیرا کی کھوپڑی کو اپنے شکنجے میں لے کر کرین کی طرح اوپر اٹھا لیں گی۔

وہ ہاتھ ظالم تھا لیکن سہمے ہوئے مجرم کی طرح ہولے ہولے کانپ رہا تھا جیسے کچھ کر گزرنے سے پہلے سوچ رہا ہو یا بلّے کی طرح پنجہ مارنے سے پہلے شکار کو سونگھ رہا ہو۔

سمیرا کی حیران حیران سی آنکھیں دور مرزا صاحب کے مکان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ چاردیواری کی چھت پر بلّے کو تلاش کرنے کے لئے چارپائی پر چڑھ گئی۔ رات کے سناٹے میں چارپائی کی کراہیں ابھریں۔ وہ سیدھی کھڑی ہو کر چھت کے برابر آئی پھر اُسے عین نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہی اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ وہ چیخ نچلی منزل تک پہنچ سکتی تھی لیکن نچلی منزل سے بلند ہونے والے زور

دار قہقہوں نے اُسے کچل کر رکھ دیا۔

پھر وہ دہشت سے گونگی ہوگئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بلّے کی آنکھوں کو تکنے لگی۔ اگرچہ وہ انسانی آنکھیں تھیں لیکن انہیں دیکھ کر وہ یہی محسوس کر رہی تھی کہ کسی بلّے کو دیکھ رہی ہے۔

وہ چھت پر اوندھا پڑا ہُوا تھا۔ اس سے پہلے کہ سمیرا پیچھے ہٹ جاتی اس نے اپنی بھاری بھرکم ہتھیلیوں کے درمیان اس کے چہرے کو جکڑ لیا تھا۔ دونوں کے درمیان گہری اور طویل خاموشی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو نگاہوں سے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ بلّے کی طرح سیاہ نہیں تھا مگر سیاہ لباس میں تھا چہرے پر ایک دن کا شیو بڑھا ہُوا تھا جو اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا۔ ہونٹ پتلے اور سفاک تھے۔ نتھنوں سے سانس ایسے خارج ہو رہی تھی جیسے غرا رہا ہو۔ سمیرا نے ہوش سنبھالنے کے بعد کتنے ہی چہرے اور کتنی ہی شخصیتیں دیکھی تھیں لیکن ایسی مکمل ظالمانہ اور مردانہ شخصیت کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ اجنبی سے سہم گئی تھی یا بری طرح متاثر ہوگئی تھی۔

ایک بات اور تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر چھت پر سے غائب ہو جانے والا بلا یاد آ جاتا تھا۔ اجنبی کی آنکھیں نیلی تھیں۔ چاند سیدھا اس کی آنکھوں میں اتر رہا تھا اور وہ ریڈیم ڈائل کی طرح چمک رہی تھیں۔

سمیرا کے دل سے دہشت ذرا کم ہوگئی۔ وہ اُسے نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانا بھول گئی۔ جس مضبوطی سے اس نے چہرے کو جکڑ رکھا تھا وہ جبر اور وہ مضبوطی بھلی لگ رہی تھی۔

پھر اجنبی کا ایک ہاتھ اُس کے حسین چہرے سے پھسلتا ہُوا گردن کی اُجلی، شفاف اور چکنی جلد پر آ گیا۔ اس کی کھردری انگلیاں گردن کے خم پر کانپ رہی تھیں۔ ٹھیک اسی جگہ اس کی ایرانی بلی کا گوشت ادھیڑا گیا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ کو اجنبی کی نیلی آنکھیں بڑے پیار سے تک رہی تھیں۔

نچلی منزل سے پھر قہقہے بلند ہوئے اور چھت تک آتے آتے سسکیوں کی طرح مرجھا گئے۔

''تت۔ تم کون ہو؟'' سمیرا نے پوچھا۔

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ لیٹے ہی لیٹے کھسکتا ہُوا چھت کے سرے تک آیا اور وہاں سے نیچے اُتر کر سمیرا کے برابر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایسا قد آور اور بھاری بھرکم تھا کہ

چار پائی اس کے بوجھ سے کراہ رہی تھی۔

اس نے سمیرا کے چہرے کو دوبارہ اپنی ہتھیلیوں میں لے کر درد بھرے لہجے میں کہا۔

''میں سمی کو ڈھونڈ رہا ہوں، وہ نہیں ملتی۔''

''سمی کون؟''

''میری بلی!'' اجنبی نے جواب دیا۔

سمیرا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ''تم، تم بھی بلی سے پیار کرتے ہو؟''

''ہاں!''

''مجھے بھی بچپن سے بلیاں پالنے کا شوق ہے۔ میرے پاس ایک بہت ہی خوبصورت ایرانی بلی تھی۔ ابھی شام کو کسی ظالم بلّے نے اُسے مار ڈالا..........''

''مار ڈالا!'' اجنبی بڑبڑایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں اُداسی تھی، پچھتاوا تھا۔

''تمہاری بلی کیسی تھی؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''وہ بہت خوبصورت تھی۔ بالکل تمہاری جیسی تھی۔ نرم اور نازک، اور اس کے بال ایسے ہی ریشم کی طرح ملائم تھے۔''

وہ اس کی ریشمی زلفوں سے کھیلنے لگا۔ پھر کھردری انگلیاں تمتماتے ہوئے رخساروں پر اتر گئیں۔ وہ آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور اس کے چہرے کو انگلیوں سے ٹٹول کر یقین کر رہا تھا کہ وہ اس کی گمشدہ سمی ہے۔

سمیرا اس کے لمس سے کانپ رہی تھی۔ وہ خوفزدہ بھی تھی اور خواب زدہ بھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھولے بسرے خواب کی تعبیر دیکھ رہی ہے۔ اس نے اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے یا خود کو بہلانے کے لئے پوچھا۔

''تمہاری سمی کب گم ہوئی تھی؟''

''بہت دن ہوگئے۔ اس وقت میں بچہ تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چومتے تھے، چاٹتے تھے، گھاس پر یا مٹی میں لوٹتے تھے ہم ہمیشہ ایک ہی پیالے میں دودھ پیتے تھے، پھر وہ مجھ سے جدا ہوگئی۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر سمیرا کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''میں ایک مدت سے اسے تلاش کر رہا ہوں۔ تمہیں دیکھتے ہی میرے دل نے کہا کہ میری سمی مل گئی ہے۔''

''مم۔ مگر میں سمی کیسے ہو سکتی ہوں؟ وہ بلی تھی۔ میں، میں بلی نہیں ہوں۔''

"تم بلی ہو۔" وہ غرایا۔

سمیرا لرز گئی۔ وہ اب تک دوسروں پر حکم چلاتی آئی تھی لیکن وہ اجنبی اپنی بات منوانے کے لئے غرا رہا تھا۔ اس وقت اُسے واجد یاد آیا جو اس کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہا کرتا تھا حالانکہ عورت ایک لچکتی ہوئی شاخ ہوتی ہے، جو جھکنا چاہتی ہے اگر کوئی جھکانے والا ٹکرا جائے۔

اجنبی اس کے چہرے پر جھک رہا تھا۔ اس کی پیشانی کو، آنکھوں کو، رخساروں کو اور گردن کو سونگھ رہا تھا.......... کوئی چومتا ہے اور وہ سونگھ رہا تھا۔

سمیرا کی آنکھیں بند تھیں۔ اس لئے سونگھنے کے انداز کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ صرف اس کی گرما گرم سانسوں کو اپنے وجود کے باہر اور اپنے وجود کے اندر محسوس کر رہی تھی۔ پھر اُسے اجنبی کی سرگوشی سنائی دی۔

"میری سونگھنے کی حس بہت تیز ہے۔ تمہیں سونگھ کر دعوے سے کہتا ہوں کہ تم میری سمی ہو۔ میری سمی ہو............"

اس کے ہونٹ گردن کی ملائم جلد پر تھم گئے۔ اس کے پیار کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ سمیرا نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا اور اپنی سہیلیوں سے سنا تھا اور تصورات میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ اجنبی ان سے مختلف تھا۔ مختلف تھا، عجیب تھا مگر اس پر نشہ طاری کر رہا تھا اور اسے کیف و مستی اور رنگ ترنگ کی ان دیکھی دنیا میں لے جا رہا تھا۔ مدہوشی اور مستی کے عالم میں سمیرا کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ چومنے سے پہلے سونگھتا کیوں ہے اور زبان نکال کر بلّے کی طرح چاٹتا کیوں ہے؟ بہت سی باتیں وقت گزرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔

اور ابھی وقت گزر رہا تھا۔ آسمان پر چاند تھا اور چاند پر بادل جھپٹ رہے تھے اور بڑھ بڑھ کر اسے دبوچ رہے تھے۔ اگر بادل ایک لباس ہے جو چاند کی عریانی کو ڈھانپ لیتا ہے تو وہ بادل گزر گیا تھا اور چاند بے لباس ہو گیا تھا۔ بادل کتنی ہی شکلیں بدل کر آتے ہیں۔ سیاہ بادل سیاہ بلّے کی طرح جھپٹتے ہیں اور چاند کے اجلے بدن پر پنجے مارتے، سونگھتے، چاٹتے اور دانت گڑوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

پھر وقت گزر گیا۔

چھت پر مکمل خاموشی چھا گئی۔ نچلی منزل سے آخری بار قہقہے بلند ہوئے۔ وہ بڑے بے جان قہقہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مہمان ہنستے ہنستے تھک گئے ہیں اور محض اخلاقاً واجد کو

لطیفہ گوئی پر داد دے رہے ہیں۔ پھر واجد اپنا فرض پورا کرنے کے بعد سیڑھیاں چڑھتا ہُوا چھت پر آ گیا۔

"سمیرا اب تم کہاں ہو؟ کہیں گولی نہ چلا دینا۔ میں تمہارا واجد ہوں۔" وہ بولتا ہُوا چارپائی کی طرف آیا پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس کے پیچھے سمیرا کی ماں بھی آئی تھی۔ اس نے بیٹی کو دیکھا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ چارپائی پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا تھا، زلفیں بکھری ہوئی تھیں، منی بلاؤز پھٹا ہُوا تھا۔ ریشمی ساڑھی گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور خون...... خون کا ایک ننھا سا دھبہ اس کی گردن پر نظر آ رہا تھا۔

بیٹی کا یہ حشر دیکھ کر ماں نے چیخ کر کہا۔ "ہائے میری بچی کو کیا ہو گیا؟"

وہ سمجھ گئی تھی کہ کیا ہو گیا ہے لیکن واجد کے سامنے اور آئے ہوئے مہمانوں کو سمجھانے کے لئے اس نے اپنے ننھیال کا وہی پرانا قصہ چھیڑ دیا کہ کس طرح ایک بدروح جوان لڑکیوں کا خون چوس لیا کرتی تھی۔

وہ بڑبڑا رہی تھی اور بیٹی کا لباس درست کر رہی تھی۔ سینے پر ساڑھی کا پردہ کر کے پھٹے ہوئے بلاؤز کو چھپا رہی تھی۔ سمیرا نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا پھر خاموشی سے چاند کو تکنے لگی۔ واجد اپنے والدین اور انکل وغیرہ کو آوازیں دیتا ہُوا نیچے گیا تو اس کی ماں نے پوچھا

"کون تھا وہ؟ سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم ہمیں بدنام کرنے کے لئے چھت پر آئی تھیں؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا وہ تھکے ہوئے انداز میں اُٹھی اور چارپائی پر بیٹھ کر اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے جوڑا باندھنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کے سب اوپر آ گئے اور سمیرا کو غور سے دیکھتے ہوئے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے اور خود ہی جوابات دینے لگے کیونکہ وہ خاموش تھی اور اس کی خاموشی سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ جوان لڑکی پر کسی کا سایہ پڑ گیا ہے۔ وہ دہشت زدہ ہے، اس لئے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکے گی۔

وہ اس بھیڑ سے گھبرا کر چارپائی سے اُٹھ گئی۔ زینے کی طرف جانے سے پہلے اُس نے مرزا صاحب کے مکان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی منڈیروں کو ملانے والا لکڑی کا تختہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مکان تاریک تھا، ویران تھا۔ وہاں زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر بھی اس کی بے چین نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

اس کے ڈیڈی نے قریب آ کر کہا۔ ''بیٹی! نیچے چلو، وہاں کیا دیکھ رہی ہو؟ بلّے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ یہاں نہیں آئے گا۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی مرزا صاحب کی چھت سے ایک سایہ اچھل کر منڈیر پر آیا۔ وہ کالا بلا تھا۔ سمیرا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ منڈیر پر چلتا ہوا دوسری چھت کی طرف جا رہا تھا۔ آخری سرے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اتنی بھیڑ میں وہ کسے دیکھ رہا ہے لیکن سمیرا کو ریڈیم ڈائل کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ کو گردن کے اس حصے پر رکھ لیا جہاں خون کا ننھا سا دھبہ تھا۔ بلا چھلانگ لگا کر دوسری چھت پر گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سمیرا گردن کے ننھے سے زخم کو سہلا رہی تھی۔

☆======☆======☆

منگنی ٹل گئی۔

واجد نے سوچا تھا کہ آج کا کام کل پر ٹل گیا ہے۔ کل ضرور ہو جائے گا مگر کل اور پرسوں بھی گزر گیا۔ سمیرا کو اُس رات ہلکا سا بخار آیا تھا۔ مہمان سمجھ دار تھے۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ اس کے ڈیڈی نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلانا چاہا مگر اُس کی ممی نے فون کرنے سے روک دیا۔ وجہ یہ تھی کہ سمیرا کے بدن کو ساڑھی سے ڈھانپتے وقت اس نے کئی جگہ دانتوں کے نشانات دیکھے تھے۔ یہ نشانات ڈاکٹر کو پوری رام کہانی سنا دیتے اور ممی اپنے ننھیال کی پُر اسرار کہانی کو پُر اثر بنانا چاہتی تھیں۔ اس نے سمیرا کے ڈیڈی کو تنہائی میں سمجھایا تو فوراً ہی ان کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ بھی قائل ہو گئے کہ جن حضرات عاشق مزاج ہوتے ہیں اور کسی کنواری دوشیزہ کو چھت پر تنہا دیکھ کر ہزار جان سے عاشق ہو جاتے ہیں۔

واجد اور اس کے والدین نادان نہیں تھے۔ جن وانس کے عشقیہ انداز کو اچھی طرح سمجھتے تھے مگر وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ سمیرا ان کی بہو بن کر اپنے باپ کی تمام دولت اور جائیداد لے کر آنے والی تھی۔ مٹی کی کوری ہانڈی پھوٹ سکتی ہے مگر سونے کی ہانڈی میں کبھی سوراخ نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو سونے کی چمک دمک میں چھپ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ لڑکیوں پر جنات عاشق ہوں تو بدنامی نہیں ہوتی۔ صرف تشویش ہوتی ہے۔

اس رات سے سمیرا کا مزاج بالکل بدل گیا۔ وہ چپ چپ سی رہنے لگی۔ دوسرے

دن وہ چھت پر جانے لگی تو اُس کی ماں نے روک دیا۔

''میں بلّے کو دیکھنے جا رہی ہوں۔'' اس نے جانے کے لئے ضد کی۔

''بلّے سے انتقام لینا ضروری نہیں ہے۔'' اس کے ڈیڈی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب تم چھت پر نہیں جاؤ گی۔''

''ڈیڈی۔ میں انتقام نہیں لینا چاہتی۔ اُس نے میری بلی کو نہیں مارا ہے۔ وہ تو بہت اچھا ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔ مم۔ میں۔ میں اُسے چاہتی ہوں۔ اُسے پالنا چاہتی ہوں۔''

اُس کے ڈیڈی نے کہا۔ ''اگر تم اسے پالنا چاہتی ہو تو واجد اسے پکڑ کر لے آئے گا۔ مگر تم چھت پر نہیں جاؤ گی۔''

واجد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''انکل۔ وہ آسانی سے گرفت میں نہیں آئے گا۔ آپ نے کل رات اُسے دیکھا ہے۔ اتنے بڑے قد کا بلا میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔''

''اسے بلا نہیں، باگڑ بلا کہو۔'' سمیرا کی ممی نے ناگواری سے کہا۔ ''اسے تو دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے اس لڑکی کو اس میں کون سی خوبصورتی نظر آ گئی ہے۔''

''اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔'' سمیرا نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

شام تک اُس نے کئی بار واجد سے پوچھا۔ ''وہ بلا نظر آیا؟''

''نہیں۔ میں کئی بار چھت پر جا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے اب وہ نہیں آئے گا۔''

''کیوں نہیں آئے گا؟'' وہ غصے سے بولی۔ ''تم لوگ نہیں چاہتے کہ میری پسند کی کوئی چیز میرے پاس رہے۔ میں خود ہی چھت پر جا کے دیکھوں گی۔''

''تم نہیں جاؤ گی۔'' اس کی ممی نے کہا۔ ''کیا تم یہ نہیں سوچتیں کہ جوان لڑکیاں بار بار چھت پر جائیں تو محلے والے بدنام کرتے ہیں۔''

''میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس سے بدنامی ہو۔ نہ جانے آپ سب میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ کل رات میں چھت پر تنہا تھی صرف وہ بلا میرے ساتھ تھا۔''

واجد کی ماں نے کہا۔ ''بیٹی۔ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میں بلّے اور انسان کے فرق کو خوب سمجھتی ہوں۔ تم میری بھتیجی ہو، اور ہونے والی بہو ہو۔ میں تمہاری اس غلطی پر پردہ

ڈال سکتی ہوں۔ مگر بار بار ایسی غلطیاں کرو گی تو..........''

''بس آنٹی!'' اُس نے بات کاٹ کر کہا۔ '' آپ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہی ہیں۔ میں اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے آپ کے بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ مجھے بہو بنا کر مجھ پر احسان کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔''

یہ کہہ کر وہ طنطناتی ہوئی کاریڈور کی طرف چلی گئی۔ سب ہی سمجھ گئے کہ وہ چھت پر جا رہی ہے۔ وہ صرف اپنے ڈیڈی کی بات مانتی تھی اور ڈیڈی اس وقت موجود نہیں تھے اس لئے کوئی اسے روک نہ سکا۔ واجد نے اپنی ماں سے کہا۔

''ممی۔ آپ نے بغیر کسی ثبوت کے اُس پر اتنا بڑا الزام کیوں لگایا؟ کل سے میں کئی بار چھت پر گیا ہوں اور اسے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ آس پاس کی چھتوں سے کوئی شخص ہماری چھت پر نہیں آ سکتا تھا۔ صرف مرزا صاحب کے مکان کی چھت ذرا قریب ہے مگر وہ مکان پچھلے ہفتے سے ویران پڑا ہے۔ وہاں سے کسی آدم زاد کی نہیں، ایک بلّے کی ہی توقع کی جا سکتی ہے اور سمیرا بھی کل سے صرف اُس باگڑ بلّے کو ہی پوچھ رہی ہے۔ اُسے پوچھنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔''

سمیرا کی ممی بھی واجد کی تائید کرنے لگی۔ تینوں آپس میں بحثیں کرتے رہے۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچ کر مطمئن ہو گئے کہ پچھلی رات سمیرا کے پاس صرف باگڑ بلا آیا تھا۔ وہ جس حالت میں چارپائی پر پائی گئی تھی اُسے نظر انداز کر دیا گیا۔

ایک گھنٹے بعد اُس کے ڈیڈی آئے۔ چھت پر گئے اور بیٹی کو سمجھا بجھا کر نیچے لے آئے۔

وہ رات خاموشی سے گزر گئی۔ دوسری رات بھی گزر گئی۔ اب وہ بلّے کو تلاش کرنے چھت پر نہیں جاتی تھی۔ نہ اُس کا ذکر کرتی تھی اور نہ ہی واجد کو لفٹ دیتی تھی۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا اس لئے وہ بے چارہ سخت پریشان تھا۔ اُس سے تنہائی میں مل کر اُسے قائل کرنا چاہتا تھا کہ اس سے بہتر جوانمرد جیون ساتھی اسے نہیں ملے گا مگر سمیرا اسے اپنی تنہائی تک پہنچنے ہی نہیں دیتی تھی۔

تیسری رات وہ جاگتا رہا۔ ایک بجے کے بعد جب گھر کے تمام افراد سو گئے تو وہ چپکے سے اس کی خوابگاہ کے دروازے پر آیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ پتہ نہیں وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ اتنی رات کو دستک دینا مناسب نہیں تھا اور اس سے ملنا بھی ضروری تھا۔ وہ

دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ وہ روشنی میں سونے کی عادی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

اسی وقت ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اگرچہ آواز بہت ہی دھیمی دھیمی سی تھی۔ مگر وہ سمیرا کی ہنسی کو پہچانتا تھا پہلے تو وہ مسکرایا کہ چلو موڈ اچھا ہے، حسینہ مان جائے گی۔ پھر یہ خیال آیا کہ وہ اتنی رات کو تنہا اپنے کمرے میں کیوں ہنس رہی ہے؟ کس بات پر ہنس رہی ہے؟ وہ پاگل تو نہیں ہے کہ تنہا ہنستی رہے۔

وہ پھر دروازے پر آ گیا اور گھٹنے ٹیک کر کی ہول سے ایک آنکھ لگا کر کمرے کے اندر دیکھنے لگا۔ اندر روشنی میں کمرے کا صرف وہ حصہ نظر آ رہا تھا جہاں ایک الماری رکھی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے دیوار پر سائے نظر آ رہے تھے۔ بیڈ لیمپ کی روشنی، پلنگ پر سونے والوں کی پرچھائیاں دیوار پر پھینک رہی تھی۔ لیمپ چونکہ پلنگ کے سرہانے تھا اس لئے پرچھائیاں پھیل کر کچھ عجیب سی انسانی اور غیر انسانی شکلیں بنا رہی تھیں۔ وہ دیوار کی سطح پر کبھی پھول رہی تھیں کبھی پچک رہی تھیں۔ کبھی ایک سے دو ہو جاتی تھیں اور کبھی گڈمڈ ہو کر دو سے ایک بن جاتی تھیں۔

پھر رات کی خاموشی میں بلّے کی غراہٹ سنائی دی۔ ''غاؤں.......... اوں ....اوں.........''

اس کے جواب میں سمیرا کی آواز سنائی دی۔ ''میاؤں۔ میاؤں!''

واجد حیرانی سے سن رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں آواز کے مطابق پرچھائیوں کی شکلیں بنا رہی تھیں اور وہاں دیوار پر بلّے اور بلی کے خاکے بنتے اور بگڑتے جا رہے تھے۔ وہ دونوں کبھی لڑتے اور کبھی لپٹ جاتے تھے۔ کوئی زبر ہوتا تھا، کوئی زیر ہو جاتی تھی۔ وہ ٹیڑھے میڑھے، پھولنے، پچکنے والے لچکیلے سائے خود اُلجھ رہے تھے اور دیکھنے والے کو الجھا رہے تھے۔

واجد کچھ سمجھ رہا تھا، کچھ نہیں سمجھ رہا تھا، خود کو سمجھا رہا تھا کہ وہ محض سائے ہیں، سچائی نہیں ہے۔ سچائی شاید یہ ہے کہ سمیرا جاگ رہی ہے اور ایک طرف بیٹھی بلّے بلی کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہی ہے یا پھر وہ آسیبی چکر ہے۔ ننھیال والی کہانی کے کردار پرچھائیوں کی صورت میں بیڈروم کی دیوار پر اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔

وہ دروازے سے ہٹ کر روشندان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پرچھائیاں اسے اختلاج

میں مبتلا کر رہی تھیں۔ جب تک وہ اصلی کرداروں کو نہ دیکھ لیتا اُسے سکون نہ ملتا۔ وہ صوفوں کے درمیان سے ایک میز اُٹھا کر لے آیا۔ روشندان کے نیچے میز کو رکھنے کے بعد اس نے میز پر ایک کرسی رکھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسا تماشہ دیکھنے والا ہے جو اس کے مزاج کے خلاف ہو سکتا ہے۔ وہ جلد سے جلد روشندان تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی جلد بازی میں وہ کرسی میز پر اُلٹ گئی۔ رات کے سناٹے میں کھٹاک کی زوردار آواز گونجی اور وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز سن کر اس کے انکل، آنٹی یا والدین وہاں آ سکتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ گھر والے گہری نیند سو چکے تھے۔ وہ آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

اُس نے مطمئن ہو کر کرسی سیدھی کی پھر میز پر چڑھ کر کرسی پر آیا۔ اس پر سیدھے کھڑے ہونے کے بعد روشن دان اس کے سر سے ایک فٹ کی اونچائی پر رہ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر روشن دان پر رکھے اور اپنے بازوؤں کی قوت سے اوپر کی جانب اُٹھنے لگا۔ نیچے اس کے پاؤں کرسی سے اوپر اُٹھ رہے تھے اور روشندان نزدیک آ رہا تھا۔ کمرہ آہستہ آہستہ نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ نگاہیں سمیرا کے پلنگ تک پہنچتیں، کوئی اندر سے اچانک ہی اچھل کر روشن دان پر آ گیا۔

سیاہ رنگ۔ غراہٹیں۔ دو گھورتی اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ باگڑ بلا خواب گاہ میں ہو گا اور اس پر جھپٹنے کے لئے روشندان تک پہنچ جائے گا۔ اچانک ہی اسے عین نگاہوں کے سامنے دیکھ کر روشندان پر واجد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دھڑام دھڑام کی آواز کے ساتھ وہ کرسی اور میز کو لئے دیئے قالین پر پہنچ گیا۔

رات کے سناٹے میں ہلچل سی مچ گئی۔

دور اور نزدیک کے کمروں سے آوازیں آنے لگیں۔

''کون ہے۔ یہ کیسی آوازیں ہیں۔ کسی نے باہر کا دروازہ بند کیا تھا یا نہیں؟''

کمروں کے دروازے کھلنے لگے۔ سب ہی بولتے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں پہنچے۔ واجد نے فوراً صفائی پیش کی کہ وہ کسی ایسی ویسی نیت سے ایک جوان لڑکی کے کمرے میں جھانکنے نہیں گیا تھا۔ بلکہ اُس جوان لڑکی کی خوابگاہ میں ''کچھ'' ہو رہا تھا اور اس ''کچھ'' کا پتہ چلانے کے لئے وہ روشن دان تک گیا تو اُسے وہی کل رات والا باگڑ بلا نظر آ گیا۔

''بلا اس کمرے میں کیسے پہنچ گیا؟'' سمیرا کی ممی نے تشویش کا اظہار کیا۔ پھر سب ہی

دروازے پر آ گئے۔ اس کے ڈیڈی نے دستک دیتے ہوئے آواز دی۔

''سمیرا! بیٹی، دروازہ کھولو۔''

واجد نے اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لئے کہا۔ ''انکل! میں نے سمیرا کی آواز سنی ہے۔ وہ میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔''

''اُس کا دماغ چل گیا ہے۔''

''میں تو کہتی ہوں، اُس پر کالے بلے کا سایہ پڑ گیا ہے۔'' اُس کی ممی نے کہا۔

اسی وقت دروازہ کھل گیا۔

سمیرا ایک چادر میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے گردن سے نیچے اپنے تمام جسم کو چادر سے کیوں چھپا رکھا تھا؟ یہ سوال کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ دیکھنے والے سمجھ سکتے تھے کہ وہ بے لباس ہے یا پھر کچھ چھپا رہی ہے جیسے ایک رات اس کی ممی نے اس کے پھٹے ہوئے بلاؤز کو اور دانتوں کے نشانات کو دوسروں سے چھپایا تھا۔

اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ رخساروں پر ایسی سرخی تھی جیسے وہ ان دیکھی آگ پر پک رہی ہو۔ آنکھوں میں ایسا کرب تھا جیسے کوئی رنگین اور سہانا خواب اپنے کلائمکس تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا ہو۔

وہ سب کمرے میں پہنچے تو سب کی نگاہیں بلّے پر مرکوز ہو گئیں۔ پلنگ پر ساڑھی پڑی ہوئی تھی اور بلا اُس پر بیٹھا ہوا آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ واجد کو دیکھتے ہی غرایا۔ واجد سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پاس ہی فلاور اسٹینڈ پر گلدان رکھا ہوا تھا۔ اس نے گلدان اُٹھا کر بلّے کو مارنے کی دھمکی دی۔ بلا پلٹ گیا۔ وہ دوڑتا ہوا اُچھل کر الماری کے اوپر آیا۔ پھر وہاں سے دوسری طرف کے روشندان پر چلا گیا۔ سمیرا نے جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر اسے پکارا۔

''وہاں نہ جاؤ۔ واپس آ جاؤ۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آ جاؤ۔ میرے پاس آؤ۔ واجد گلدان رکھ دو، چلے جاؤ یہاں سے۔ تم میرے بلّے کو بھگا رہے ہو۔ چلے جاؤ............''

واجد نے گلدان رکھ دیا لیکن بلا واپس نہیں آیا۔ روشندان کے راستے باہر چلا گیا۔

سمیرا غصے سے پھٹ پڑی۔

''آپ لوگ کیوں آئے ہیں یہاں؟ کیا دیکھنے آئے ہیں؟ اگر اسے بھگا کر آپ لوگ

خوش ہو گئے ہیں تو پلیز اب یہاں سے چلے جائیے مجھے سکون سے سونے دیجئے۔‘‘

’’وہ بلا یہاں کیسے آ گیا؟‘‘ اس کی ممی نے پوچھا۔

’’میں چھت پر نہیں جا سکتی تھی۔ اس لئے وہ یہاں آ گیا۔ کیا ایک بلّے کو بھی ساتھ رکھنے میں آپ کی بدنامی ہے؟‘‘

’’بدنامی کی بات نہیں ہے۔ وہ کالا کلوٹا بلا ایسا بھیانک ہے کہ اسے دیکھتے ہی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ بند کمرے میں تھا، تمہارے پلنگ پر تھا۔ تعجب ہے کہ تم اُس بھیانک صورت والے سے ڈرتی کیوں نہیں ہو؟‘‘

’’ڈرنے کی کوئی بات ہو تو ڈرا جائے۔ مجھے تو اُس کے بغیر نیند نہیں آتی۔ وہ کل بھی میرے ساتھ تھا۔ پرسوں بھی میرے ساتھ رہا اور میں سکون سے گہری نیند سوتی رہی۔‘‘

وہ سب حیرانی سے اُس کا منہ تکنے لگے۔ حیرانی اس بات کی نہیں تھی کہ بلا روز آتا ہے بلکہ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کیا ہر رات اس کی ساڑھی اسی طرح پلنگ پر پڑی رہتی ہے اور وہ بلا اسے بے لباس دیکھتا ہے؟ وہ جانور ہی سہی مگر بلا تھا۔ بلی ہوتی تو کوئی اس کمرے میں جھانکنے نہ آتا۔ اس کی ممی نے کہا۔

’’مجھے اس بلّے سے وحشت سی ہوتی ہے۔ وہ آئے گا تو اُسے بھگا دوں گی۔‘‘

’’ممی۔ وہ آپ کے پاس کبھی نہیں آئے گا۔ میں اسے اپنے کمرے میں بند رکھوں گی۔ نہ وہ کسی کے سامنے جائے گا اور نہ ہی کوئی اسے دیکھ سکے گا۔ پھر تو آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔‘‘

اس کی ممی نے اس کے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ ڈیڈی نے کہا۔ ’’تین بج رہے ہیں۔ یہ شریف آدمیوں کے سونے کا وقت ہے۔ ابھی میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ سمیرا سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد شادی کا فیصلہ کرے۔ شادی کے بعد وہ بلا تو کیا ہاتھی بھی پال سکتی ہے۔ چلو اب سونے دو۔‘‘

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلے گئے۔ ان کے پیچھے سب ہی جانے لگے۔ واجد نے قریب آ کر اس سے کہا۔ ’’سمیرا۔ تم مجھ سے شادی کا فیصلہ کر چکی تھیں، پھر تم مجھ سے ناراض کیوں ہو گئی ہو؟‘‘

سمیرا نے روشندان کی طرف دیکھا۔ وہاں وہ بلا پھر نظر آیا۔ وہ واجد کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ سمیرا نے کہا۔ ’’میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ یہ بلا تم سے ناراض ہے۔ اگر تم تھوڑی دیر

اور یہاں رہ گئے تو یہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ اس لئے تم چلے جاؤ۔ جو کچھ کہنا ہے وہ صبح کہنا ہے۔ ابھی میں کچھ نہیں سنوں گی۔‘‘

وہ مایوسی سے سر جھکا کر خواب گاہ سے باہر آ گیا۔ اس نے باہر آ کر کمرے کی جانب دیکھا۔ وہ باگڑ بلا روشندان سے کود کر الماری پر پہنچ گیا تھا۔ پھر وہاں سے کود کر وہ نیچے قالین پر آیا اور سمیرا کی جانب بڑھنے لگا۔

سمیرا نے دروازے کو بند کر دیا۔

☆======☆======☆

واجد نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ دروازے کے پیچھے وہ بلا، وہ رقیبِ رُوسیاہ اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا ہے اور اگلے دو بازو پھیلا کر سمیرا کو اپنی آغوش میں لے رہا ہے۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر بند دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔

پھر وہ کمرہ دن رات اندر سے بند رہنے لگا۔ گھر کی عورتیں بلّے سے ڈرتی تھیں یا نفرت کرتی تھیں۔ اس لئے کوئی اس کی خوابگاہ تک نہیں جاتا تھا۔ گھر کی صفائی کرنے والی ملازمہ نے بھی وہاں جانے سے انکار کر دیا کیونکہ بلا اسے دیکھ کر یوں غرایا تھا جیسے اس پر چھلانگ لگا دینا چاہتا ہو۔ سمیرا نے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے کمرے کی صفائی خود کر لیا کرے گی۔ اسے کسی ملازمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے رہنے سہنے کے طور طریقے بدلتے جا رہے تھے پہلے وہ نازنخروں کی پالی ایک تنکا اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر نہیں رکھتی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا ٹرے میں رکھ کر اپنے کمرے میں لے جاتی تھی اور اپنی خوراک سے زیادہ کھانا لے جاتی تھی۔ سب ہی سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ بلّے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ روزانہ ایک سیر گوشت اور دو سیر دودھ کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ مکھن، تازہ پھل اور سُوکھے میوے بھی اس کمرے میں ہضم ہو جاتے تھے۔

یہی باتیں سوچنے پر مجبور کرتی تھیں کہ وہ باگڑ بلا آدمی ہے یا جانور؟ بلّے گوشت کھا سکتے ہیں۔ دودھ پی سکتے ہیں۔ مگر پھل، میوے اور مکھن وغیرہ کو سونگھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ اگر وہ سب کچھ سمیرا کھاتی ہے تو تنہا اتنی چیزیں کھا کر کیسے ہضم کر لیتی ہے؟ جو باتیں عقل تسلیم نہیں کرتی ان پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے؟

اس کے ڈیڈی، انکل اور واجد اپنے اپنے اطمینان کے لئے ایسے وقت اس کے کمرے میں گئے جب وہ دن کا یا رات کا کھانا کھا چکی تھی۔ دروازہ ہمیشہ اندر سے بند رہتا

تھا۔ دستک دینے پر کھلتا تھا۔ جب وہ کمرے سے نکلتی تو دروازے کو باہر سے لاک کر دیتی یعنی کوئی اس کی عدم موجودگی میں کمرے کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ یوں بھی بڑے گھروں میں باپ، بیٹے، بیٹیاں اجازت کے بغیر کسی کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے ہیں لیکن سمیرا دروازے کو لاک کر کے کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لیتی تھی اور انہیں شبہ میں مبتلا کرتی تھی۔ بہرحال اس کے ڈیڈی وغیرہ نے اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تھا۔ وہ کھانے سے فارغ ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے سنٹر ٹیبل پر رکھی ہوئی تمام پلیٹیں ایسے صاف ہو گئی تھیں جیسے بلی بلّے کی طرح زبان سے چاٹ کر صاف کی گئی ہوں۔ ایک آدھ پھل اور کچھ میوے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ بھی ختم ہونے والے تھے۔ میز پر بیٹھا ہوا بلا ایک بڑے سے پیالے میں منہ ڈالے زبان نکال کر سپڑ سپڑ کی آواز پیدا کرتا ہوا دودھ پی رہا تھا۔

اس کے ڈیڈی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”سمیرا! تمہاری خوراک بہت کم تھی۔ مگر اب یہ تمام چیزیں کیسے کھا لیتی ہو؟ بلا زیادہ سے زیادہ گوشت کھا سکتا ہے یا دُودھ پی سکتا ہے۔“

”میری خوراک بڑھ گئی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”جب سے یہ بلا آیا ہے میں اس کے ساتھ ہنستی کھیلتی اتنا کھا لیتی ہوں کہ خوراک کا اندازہ ہی نہیں ہوتا اور یہ تو اچھی بات ہے ڈیڈی۔ کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ میں پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گئی ہوں۔“

اولاد کی صحت بنتی رہے تو ماں باپ یقیناً خوش ہوتے ہیں۔ اس کے ڈیڈی نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ ”میں بہت خوش ہوں بیٹے! لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تم دن رات کمرے میں بند رہو۔ تمہیں گھر والوں کے ساتھ ہنسنا بولنا چاہئے۔ تفریح کے لئے باہر جانا چاہئے۔ تم نے بلّے کی خاطر سوشل لائف کو بھلا دیا ہے۔“

”ڈیڈی! کچھ دنوں میں یہ مجھ سے اچھی طرح مانوس ہو جائے گا تو میں اسے لے کر باہر نکلا کروں گی۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔“

اس کے ڈیڈی کو اطمینان ہو گیا کہ لڑکی اچھا کھا رہی ہے، صحت مند ہوتی جا رہی ہے۔ بچپن سے بلیاں پالنے کا شوق ہے۔ لہٰذا ایک بلّے سے بہل رہی ہے تو اس میں تشویش و تردّد کی بات نہیں ہے۔ ان کا اطمینان دیکھ کر گھر والے بھی مطمئن ہو گئے۔

پھر ان کی لاڈلی بیٹی نے ایک دن فرمائش کی کہ اسے سمیرا نہ کہا جائے بلکہ سَمی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

”یہ سَمی بھی کوئی نام ہے؟“ اس کی ممی نے کہا۔

"نام نہیں عرفیت ہے۔ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ سمی کہنے سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نازک بدن اور ملائم بالوں والی ایرانی بلی ہوں۔"

سب حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تکنے لگے۔ وہ انسان کی اولاد خود کو بلی محسوس کر کے خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی ممی نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتی آ رہی ہوں کہ اس پر منحوس بلے کا سایہ پڑ گیا ہے۔ مگر میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ دیکھ لینا یہ لڑکی ایک دن پاگل ہو جائے گی۔"

اس کے ڈیڈی نے کہا۔ "سمیرا مذاق کر رہی ہے۔ خود کو بلی محسوس کرنے سے وہ بلی تو نہیں بن جائے گی۔"

سمیرا نے باپ کی طرف انگلی اٹھا کر یاد دہانی کرائی۔ "ڈیڈی! مجھے سمیرا نہیں سمی کہیے..........."

"اچھا بیٹی! تم سمی ہو۔ آج سے میری سمی بیٹی ہو۔"

بیٹی کی بڑی سے بڑی ضد پوری کی جاتی تھی۔ پھر وہ ضد کیسے پوری نہ ہوتی۔ باپ نے سمی کہا تو دوسرے بھی اسے سمی کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔

یہ سچ ہے کہ عورت کو عورت ہی سمجھتی ہے۔ سمیرا کے بدلتے ہوئے رنگ و روپ کو اس کی ممی اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ سمیرا پہلی جیسی سمیرا نہیں لگتی تھی۔ جسم پہلے سے زیادہ بھر گیا تھا اور اُبھر گیا تھا۔ چہرے پر کلی کی تازگی نہیں تھی بلکہ کھلے ہوئے پھول کی شگفتگی آ گئی تھی۔ گداز بازو، اُمڈتا ہُوا سینہ اور پھیلتے ہوئے کولہے بتا رہے تھے کہ وہ کسی کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ مگر اپنا شبہ ظاہر کرنے کے لئے کوئی ثبوت نہ تھا۔ سمیرا دن رات کمرے میں رہتی تھی یا ڈرائنگ روم میں آ کر اپنے ڈیڈی وغیرہ سے باتیں کرتی تھی۔ نہ وہ کسی بوائے فرینڈ سے ملنے جاتی تھی اور نہ ہی کوئی اس سے ملنے آتا تھا۔ واجد سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔ ایسی صورت میں اس کی ممی یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ کنواری لڑکی کا بدن کس آگ میں تپ کر کندن بنتا جا رہا ہے۔

پھر ایک ماہ کے عرصے میں کچھ چھوٹی موٹی چوریوں کا انکشاف ہُوا۔ واجد کی الماری سے ایک پتلون اور ایک شرٹ غائب ہو گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ پھر یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ نہ جانے وہ کپڑے کس لانڈری میں دے کر بھول گیا ہے لیکن دوسرے ہفتے پھر ایک جوڑا غائب ہو گیا۔ گھر والوں کو پتہ چلا تو سب نے یہ رائے قائم کی کہ یہ کسی ملازم کا

کام ہے۔ تمام ملازموں کو بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کی گئی مگر گمشدہ کپڑے برآمد نہ ہوئے۔ پھر ایک صبح سمیرا کے ڈیڈی باتھ روم میں شیو کرنے گئے تو شیو کرنے کا تمام سامان غائب تھا۔ اس چوری کے بعد بھی ملازموں کی شامت آئی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ گھر کے تمام مرد محتاط ہو گئے اور اس تاک میں رہنے لگے کہ دیکھیں آئندہ کون ان کی چیزیں چرا کر لے جاتا ہے۔

ایک ہفتے بعد رات کے دس بجے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ ملازم نے آ کر بتایا کہ ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ آیا ہے۔ سمیرا کے ڈیڈی فوراً ہی دروازے پر پہنچے۔ انسپکٹر نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔ "یہ آپ کا مکان ہے؟"

"جی ہاں!"

"آپ کا نام؟"

"کلیم احمد!" سمیرا کے باپ نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟"

"جی ہاں کلیم صاحب! آپ نے اپنے ہاں ایک پاگل کو چھپا رکھا ہے۔"

"پاگل؟" کلیم احمد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے ہاں کوئی پاگل نہیں ہے۔ میں نے کسی کو نہیں چھپایا ہے۔"

انسپکٹر نے جیب سے ایک تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ شخص آپ کے مکان میں موجود نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔" اُس نے تصویر دیکھنے کے بعد کہا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "وہ جو پچھلی گلی کی طرف آپ کے مکان کی تیسری کھڑکی ہے، اس کمرے میں کون رہتا ہے؟"

"وہ میری بیٹی کا کمرہ ہے۔" کلیم احمد نے جواب دیا۔ پھر اچانک ہی اُس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بہت سے مبہم شبہات، یقین کی حد کو چھونے لگے۔ اب کیوں اور کیسے کے سوالات ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ مثلاً سمیرا دن رات کمرے کو اندر سے بند کیوں رکھتی ہے؟ اپنی خوراک سے زیادہ کیسے کھاتی ہے اور کیسے ہضم کر لیتی ہے؟ کیا اُس نے اپنے کمرے میں کسی کو چھپا رکھا ہے؟

کلیم احمد کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہُوا۔ اُس نے بیٹی کے کمرے میں جا کر پلنگ کے

نیچے یا باتھ روم میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھا تھا کہ پھل فروٹ، مکھن اور ایک سیر گوشت ہضم کرنے والا کوئی شخص وہاں ہو سکتا ہے۔

وہ سوچ رہا تھا اور انسپکٹر اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے پوچھا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"آں!" کلیم احمد نے چونک کر کہا۔ "آپ یہ تصویر مجھے دیں۔ میں اپنی صاحبزادی کو دکھاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے اس پاگل آدمی کو کہیں دیکھا ہو۔"

انسپکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کی صاحبزادی اسے اپنے کمرے میں دیکھ رہی ہیں۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے پچھلی گلی میں گشت کرنے والے سپاہی نے اس پاگل کو اُس کمرے کی کھڑکی کے پاس دیکھا ہے۔ ایک لڑکی جو غالباً آپ کی صاحبزادی ہیں، وہ کھڑکی کھول کر پھلوں کے چھلکے باہر پھینک رہی تھیں۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ سپاہی نے گلی سے گزرتے وقت اس پاگل کو کمرے میں دیکھا ہے ہو سکتا ہے کہ اسے دھوکا ہوا ہو مگر ہم تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔ آپ سمجھدار ہیں، قانون کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے پاس آپ کے مکان کی تلاشی کا اجازت نامہ نہیں ہے اس لئے میں آپ سے اجازت طلب کر رہا ہوں۔ اس میں آپ کی صاحبزادی کی بھلائی ہے کیونکہ وہ پاگل نوجوان لڑکیوں کے لئے بے حد خطرناک ہے۔"

کلیم احمد نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر مُردہ لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ آیئے۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آئے۔ گھر کی عورتیں انسپکٹر اور سپاہیوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ کلیم احمد نے انہیں تسلی دی۔

"پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تم سب اوپر جاؤ۔ میں جب تک نہ بلاؤں، یہاں کوئی نہ آئے............"

عورتیں اوپر جانے لگیں اور وہ انسپکٹر کے ساتھ سمیرا کے کمرے کے دروازے پر آ کر دستک دینے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ سمیرا نے حیرت سے انسپکٹر کو دیکھا۔ پھر سنبھل کر بولی۔

"کیا بات ہے؟ ڈیڈی آپ یہاں پولیس لے کر کیوں آئے ہیں؟"

کلیم احمد نے جواب دیا۔ "یہ ایک پاگل کی تلاش میں ہیں۔ انہیں شبہ ہے کہ وہ پاگل

تمہارے کمرے میں ہے۔ تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ انہیں تلاشی لینے دو۔"

وہ خاموشی سے ایک طرف ہو گئی۔ انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی بلا اچھل کر الماری پر چلا گیا۔ پھر وہاں سے روشندان میں پہنچ گیا۔ انسپکٹر آنکھیں سکیڑ کر اُسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بلّے نے بھی اُسے غرا کر دیکھا۔ پھر روشندان سے باہر چلا گیا۔ انسپکٹر نے پلٹ کر سمیرا سے پوچھا۔

"کیا یہ آپ کا پالتو بلا ہے؟"

"جی ہاں!"

"کیا یہ آپ کو نقصان نہیں پہنچاتا ہے؟"

"جی نہیں۔" سمیرا نے کہا۔ "نقصان پہنچانے والے جانور پالے نہیں جاتے۔"

"پالے جاتے ہیں۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ "شیر اور چیتے بھی پالے جاتے ہیں۔ آپ نے سپیروں کو نہیں دیکھا جو سانپوں سے کھیلتے ہیں۔"

سمیرا چپ ہو گئی۔ جواب نہ دے سکی۔ انسپکٹر کے حکم پر سپاہی پلنگ کے نیچے جھانک رہے تھے۔ الماری کھول کر دیکھ رہے تھے۔ وہ باتھ روم میں بھی گئے مگر جس پاگل کی تلاش تھی، وہ نہ ملا۔ انسپکٹر نے پریشان ہو کر روشندان کی جانب دیکھا۔ پھر سمیرا سے پوچھا۔

"کیا آپ بتائیں گی کہ وہ بلا کتنی مدت سے آپ کے پاس ہے؟"

کلیم احمد کو اطمینان ہو گیا تھا کہ بیٹی بدنامی سے بچ گئی ہے۔ اُس نے انسپکٹر سے کہا۔

"آپ ایک پاگل آدمی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ آپ نے میری بیٹی کے کردار پر شبہ کیا ہے۔ بہر حال میں نے اور میری بیٹی نے قانون کا احترام کیا ہے۔ اب کسی پالتو جانور کے متعلق آپ کو سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔ آیئے، ہم باہر چلیں۔"

انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ کمرے سے باہر جانے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر روشندان کی جانب دیکھا۔ اس کے باہر آتے ہی سمیرا نے دروازے کو بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر انسپکٹر نے کہا۔ "کلیم صاحب! میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا تلاشی لینے کے بعد بھی آپ مطمئن نہیں ہیں؟"

"نہیں! میں کچھ اور الجھ گیا ہوں اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اُسے سن کر شاید آپ

بھی الجھن میں مبتلا ہو جائیں۔"

"آپ کچھ نہ کہہ کر بھی مجھے اُلجھا رہے ہیں۔" کلیم احمد نے پریشان ہو کر کہا۔ پھر صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ "تشریف رکھئے۔"

انسپکٹر نے سپاہیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ پھر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ کلیم احمد بھی پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد انسپکٹر نے پاگل کی تصویر نکال کر کلیم احمد کو دیتے ہوئے کہا۔

"اس تصویر کو دیکھئے۔ یہ ایک نہایت ہی خوبرو نوجوان ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آج سے نصف صدی پہلے بھی یہ اسی طرح نوجوان تھا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" کلیم احمد نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ ممکن نہیں ہے لیکن اکثر لوگ مافوق الفطرت واقعات سناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایسے واقعات دیکھے ہیں، جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ میں بھی ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ پاگل اپنے باپ کا ہمشکل ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے اس کے باپ کو جوانی میں دیکھا گیا تھا اور اب اس کے ہمشکل بیٹے کو دیکھ کر یہ قیاس آرائی کی جارہی ہے کہ وہ پچاس برس سے جوانی کی عمر گزارتا چلا آرہا۔ کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہے؟"

"واقعی یہ جاہلوں کی سی باتیں ہیں۔" کلیم احمد نے تائید کی۔

انسپکٹر نے کہا۔ "اب میں آپ کو ایسے واقعات سناتا ہوں جو چالیس برس پہلے رُونما ہوتے رہے۔ اُن دنوں کریم آباد کے علاقہ میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں ہر دوسرے تیسرے دن ایک نادیدہ بلا آتی ہے اور کسی کتے یا بلی کا خون چوس کر چلی جاتی ہے۔"

کلیم احمد ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کریم آباد سمیرا کی ممی کا ننھیال تھا اور اس کی ممی بارہا اپنے ننھیال کے یہ قصے سنا چکی تھی۔ اس نے انسپکٹر سے کہا۔ "بعد میں وہ بلا جوان لڑکیوں کے پیچھے پڑ گئی تھی۔"

انسپکٹر نے چونک کر پوچھا۔ "کیا آپ نے بھی یہ واقعات سنے ہیں؟"

"جی ہاں۔ کریم آباد میری بیگم کا ننھیال ہے۔ ان دنوں میری بیگم بہت چھوٹی تھیں اور اپنی نانی وغیرہ سے یہ باتیں سنا کرتی تھیں۔"

"ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کریم آباد کے تھانے میں ان واقعات کا باقاعدہ ریکارڈ

موجود ہے۔ پولیس نے تفتیش شروع کی تھی لیکن وہ بلا کچھ عرصے کے لئے لاپتہ ہوگئی۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد اس علاقے میں ایک اجنبی نوجوان آیا۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس سلسلے میں نہ اُس اجنبی نے زبان کھولی اور نہ ہی پولیس دوسرے ذرائع سے کچھ معلوم کرسکی۔ وہ اجنبی اسی تصویر والے پاگل کا ہم شکل تھا۔

"آپ نے یہ تصویر دیکھی ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہ اس تصویر سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ رات کو بلّے کی آنکھوں کی طرح چمکتی ہیں۔ وہ قد آور اور صحت مند ہے اور ایسی ظالمانہ، حاکمانہ اور مردانہ شخصیت کا مالک ہے کہ صنفِ مخالف یعنی عورتیں ایک ہی نظر میں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

"اُن دنوں بھی یہی عالم تھا۔ عورتیں اس پر جان دیتی تھیں۔ پہلے پہل جب وہ نظر آیا تو ایک پھٹی ہوئی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ کھانے پینے اور رہنے کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ پھر اس کے جسم پر اچھے کپڑے نظر آنے لگے اور وہ ایک مکان کرائے پر لے کر میراں بی بی کے کوچے میں رہنے لگا۔ ان دنوں ہمارا ملک آزاد نہیں تھا اور نہ ہی عورتیں اتنی آزاد تھیں کہ کھلم کھلا اسے بوائے فرینڈ بنا لیتیں۔ مگر ہزار پردے اور پابندیوں کے باوجود کتنی ہی عورتیں تھیں جو اپنی خواہشات کے چور دروازے رکھتی تھیں، اس سے چوری چھپے ملتی تھیں اور اسے عمدہ لباس اور نقدی وغیرہ دیا کرتی تھیں۔

اس دوران تین عورتوں کی گردن پر داہنے جبڑے کے نیچے زخم کے نشانات دیکھے گئے۔ تینوں زخم ایک جیسے تھے اور ایک جگہ تھے۔ اُن سے پوچھنے پر وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکیں۔ ایک نے کہا کہ وہ رات کو فرش پر سو رہی تھی، کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہوگا۔ دوسری نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ وہ اس کے خاوند کے دانتوں کے نشانات ہیں۔ کیف و مستی کے عالم میں ایسے نشانات پڑ ہی جاتے ہیں۔ تیسری نے بیان دیا کہ رات اس نے خواب میں ایک سیاہ بلّے کو دیکھا تھا۔ وہ بلا اس کی گردن میں دانت گڑو کر خون چوس رہا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو سچ مچ گردن کے اس حصے میں زخم نظر آیا تھا۔"

کلیم احمد اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اسے سمیرا کی گردن کا زخم یاد آ رہا تھا اور اب یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ انسپکٹر سمیرا سے کالے بلّے کے متعلق کیوں سوال کر رہا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔

"وہ عورتیں اپنے گناہ کو اور اپنے گناہگار کو چھپانا چاہتی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے

اُلٹے سیدھے بیانات دیئے تھے حالانکہ وہ ایک جان لیوا خطرے سے کھیل رہی تھیں۔ دن بہ دن وہ زرد پڑتی جا رہی تھیں۔ ان کے جسم سے خون کی مقدار کم ہوتی جا رہی تھی پھر بھی وہ خوبرو اجنبی ان کے لئے جان سے زیادہ عزیز تھا اور وہ اس کا نام اپنی زبان تک نہیں آنے دیتی تھیں۔

کچھ عرصہ بعد ایک جوان لڑکی بیمار ہو کر ہسپتال آئی۔ معائنہ کے دوران اس کی گردن پر زخم کا نشان پایا گیا۔ اس لڑکی پر سختیاں کی گئیں تو اس نے سب کچھ اُگل دیا۔ اُس نے اجنبی کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اب وہ گردن کی پشت پر نشان چھوڑ جاتا ہے تاکہ لانبے بالوں کے نیچے وہ نشان چھپا رہے اور عام حالات میں کسی کو نظر نہ آئے۔

''اجنبی کو حراست میں لے لیا گیا۔ اُس کا بیان آج بھی کریم آباد کے تھانہ میں ریکارڈ کے طور پر موجود ہے۔ اُس نے کہا۔

''میں کون ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ میں اپنے ماں باپ اور عزیز و اقارب کسی کو نہیں پہچانتا۔ میں صرف اپنی سمی کو پہچانتا ہوں۔''

''سمی؟'' کلیم احمد چونک کر انسپکٹر کا منہ تکنے لگا۔ سمیرا خود کو سمی کہتی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کر کلیم احمد اور گھر کے سب ہی لوگ اسے سمی کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ ان کی بیگم کے ننھیال میں ہونے والے واقعات کی کڑیاں سمیرا کی زندگی سے آ کر مل رہی تھیں۔

انسپکٹر اس اجنبی کا بیان دہرا رہا تھا۔

''میں صرف اپنی سمی کو پہچانتا ہوں! وہ میری بلی ہے۔ کہیں لاپتہ ہو گئی ہے۔ میں اُسے تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ آہ! ایک زمانہ تھا۔ جب ہم ہنستے کھیلتے تھے۔ پیار سے میاؤں میاؤں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو چومتے چاٹتے تھے۔ غصہ سے میاؤں میاؤں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے تھے۔ لگاوٹ سے میاؤں میاؤں کرتے تھے اور ایک دوسرے سے لپٹ کر گھاس پر یا مٹی میں لوٹتے تھے اور ایک پیالے میں دودھ پیا کرتے تھے۔ میاؤں میاؤں۔ میاؤں میاؤں..........''

اس کے بیان سے ظاہر تھا کہ وہ نیم پاگل ہے۔ اسے ایک ماہر نفسیات اور دماغی امراض کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا گیا۔ دوسرے دن رپورٹ آئی کہ اجنبی عام حالات میں نارمل ہے لیکن جوان لڑکیوں کو پا کر وحشی بن جاتا ہے۔ بچپن میں اسے کسی بلی سے بے حد محبت تھی۔ کسی بلے نے اس کی گردن میں دانت گڑو کر اسے مار ڈالا۔ تب سے وہ لڑکیوں

کے نرم و نازک جسم میں سمی کو تلاش کرتا ہے اور اسے نہ پا کر ایک بلے کی طرح بھنبھوڑ ڈالتا ہے۔ یہ جب تک سمی کو نہیں بھولے گا اس وقت تک ایک نارمل سماجی زندگی نہیں گزارے گا۔

ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے دماغی مریضوں کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا لیکن ایک ہفتے کے بعد ہی وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے خوامخواہ پُراسرار خون آشام درندہ سمجھا گیا ہے۔ میں ڈاکٹر کی رائے سے متفق ہوں کہ وہ ایک دماغی مریض تھا جیسے یہ پاگل نوجوان ہے۔''

انسپکٹر نے تصویر کی جانب اشارہ کیا اور اُسے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''وہ نصف صدی پہلے کا اجنبی اور یہ پاگل نوجوان دونوں ہم شکل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں باپ بیٹے ہیں اور بیٹے کو اپنے باپ سے یہ دماغی مرض ورثے میں ملا ہے۔ یہ پاگل بھی یہی کہتا ہے کہ یہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ یہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ یہ نہیں جانتا اسے بھی گمشدہ سمی کی تلاش ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' کلیم احمد نے کہا۔ ''چہرے مہرے اور عادات کے لحاظ سے باپ بیٹے میں بھی اتنی گہری مماثلت نہیں ہو سکتی۔ کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ وہی اجنبی لگتا ہے جو کریم آباد کے مینٹل ہسپتال میں بھیجا گیا تھا۔''

''یعنی آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ آج بھی اسی طرح جوان ہے جیسے پچاس برس پہلے تھا۔ بہرحال یہ اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔ میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔ اب میں اس پاگل کے متعلق آپ کو بتا رہا ہوں۔ اس شہر کی ایک دولت مند بوڑھی بیوہ شمشاد بیگم پچھلے ماہ کی دو تاریخ کو یہ شکایت لے کر تھانے میں آئی کہ ایک نوجوان اس کی جوان بیٹی کو پاگل بنا رہا ہے۔ شمشاد بیگم کا بیان کچھ یوں ہے۔

''ایک رات اس کی بیٹی ماہ جبین ایک شادی کی تقریب سے واپس آ رہی تھی۔ راستے میں کار خراب ہو گئی۔ بوڑھا ڈرائیور کار کی خرابی دُور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بونٹ کے پاس سے سر اُٹھا کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر ایک خوبرو نوجوان مہ جبین کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو گہری خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا ڈرائیور نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ اُس نے یہی سمجھا کہ وہ بی بی جی کا کوئی بوائے فرینڈ ہے۔ وہ دونوں ذرا سی دیر میں بے باک ہو گئے تھے۔ مہ جبین اس کی آغوش میں تھی وہ اسے چوم رہا تھا۔ یا سونگھ رہا تھا۔

راستہ سنسان تھا، رات اندھیری تھی۔ کوئی ان کی بے حیائی کو دیکھنے والا نہ تھا۔ ڈرائیور بھی منہ پھیر کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ دس منٹ کے بعد وہ دونوں کار سے باہر آئے۔ مہ جبین نے ڈرائیور سے کہا۔ ''کوٹھی یہاں سے قریب ہے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ تم گاڑی لے کر آجانا..........''

''یہ کہہ کر وہ دونوں راستے کے کنارے کنارے جانے لگے۔ مہ جبین کے قدم یوم لڑکھڑا رہے تھے جیسے وہ گہرے نشہ میں ہو۔ وہ اجنبی نوجوان کا سہارا لے کر چل رہی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد ڈرائیور گاڑی لے کر کوٹھی پہنچا تو مہ جبین وہاں نہیں تھی۔ شمشاد بیگم اور گھر کے دوسرے لوگ پریشان ہوگئے۔ اُسے تلاش کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد وہ اپنی کوٹھی کے پائیں باغ میں ملی۔ اس حالت میں ملی کہ اس کا لباس تار تار تھا۔ اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کئے گھاس کے سبز ملائم بستر پر آرام سے سو رہی تھی اور اس کی گردن پر داہنے جبڑے کے نیچے خون کا دھبہ نظر آرہا تھا۔''

کلیم احمد بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلنے لگا۔ وہ سوچ کے زینے طے کرتا ہُوا چھت پر پہنچ گیا تھا اور اپنی بیٹی کو اسی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر وہی واقعات سنا رہا تھا جو سمیرا کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ یعنی دوسرے دن سے مہ جبین بھی اپنے کمرے تک محدود ہوگئی تھی۔ دروازہ اندر سے بند کر کے کھانا کھاتی تھی اور اپنی خوراک سے زیادہ کھاتی تھی۔ اس کی ماں اور بھائیوں نے اس کے کمرے کے کونے کونے میں دیکھا مگر وہاں کسی دوسرے شخص کا وجود نہیں تھا۔ صرف ایک سیاہ رنگ کا بلا تھا۔

کچھ دنوں بعد ماہ جبین خود کو سمی کہنے لگی۔ گھر والوں نے محسوس کیا کہ رفتہ رفتہ اس کا ذہنی توازن بگڑ رہا ہے۔ بعض اوقات وہ گفتگو کے دوران میاؤں میاؤں کی آوازیں نکالتی تھی۔ ایک دن اس کی ماں نے چھپ کر دیکھا۔ وہ دودھ سے بھرے ہوئے پیالے میں منہ ڈال کر ایک بلی کی طرح زبان نکال کر سپڑ سپڑ کی آواز پیدا کرتی ہوئی دودھ پی رہی تھی۔

اسی دن اس کے گھر والے اسے ایک ماہر نفسیات اور دماغی امراض کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر اسے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ اس نے مہ جبین کے سامنے بلے بلیوں سے دلچسپی ظاہر کی اور انہیں گفتگو کا موضوع بنا کر اس کے ذہن کو کریدنے لگا۔ باتوں

ہی باتوں میں مہ جبین کھل گئی اور اسے بتانے لگی کہ وہ ایک اجنبی نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ اس نوجوان کو سمی کی تلاش ہے۔ لہٰذا وہ اپنے محبوب کے لئے سمی بن کر ایک بلی کی طرح حرکتیں کرتی ہے۔ اب رفتہ رفتہ یہ اس کی عادت ہوگئی ہے۔ جس قدر وہ بلی کی سی حرکتیں کرتی ہے اسی قدر وہ خود کو اپنے محبوب کے قریب پاتی ہے۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''وہ نوجوان کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ جب وہ سامنے آتا ہے تو میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔''

''یہ تو جانتی ہو کہ وہ تمہارے کمرے میں کیسے آتا ہے؟''

''میں یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کیسے آتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ میں بلّے کو اپنے ساتھ رکھوں۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اسے کھلاتی پلاتی ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بلا باتھ روم میں جاتا ہے اور واپس نہیں آتا۔ باتھ روم سے میرا اجنبی محبوب چلا آتا ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بلا تمہارے اجنبی محبوب کے روپ میں چلا آتا ہے۔''

''ہاں، میں یہی سمجھتی ہوں کیونکہ جب تک وہ میرے پاس رہتا ہے، بلا نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی میرے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو وہ باتھ روم میں واپس چلا جاتا ہے یا پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ ایک بار وہ میرے پلنگ کے نیچے چھپ گیا تھا میرے بھائی نے جھک کر دیکھا تو وہاں پلنگ کے نیچے بلا بیٹھا ہُوا تھا۔''

ڈاکٹر اسے سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کا ذہنی توازن پھر ڈگمگا رہا ہے۔ اُس نے کہا۔

''مس مہ جبین! تم تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی ہو۔ ایسی بے تکی باتیں کرو گی تو لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے۔''

''وہ تو سمجھ رہے ہیں۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ میں اس کے پیار کی خاطر پاگل کہلانے کے لئے تیار ہوں۔ وہ مجھے بلی سمجھتا ہے میں بھی خود کو عورت نہیں سمجھتی۔ میں بلی ہوں۔ میں سمی ہوں۔ میاؤں۔ میاؤں..........''

وہ بلی کی آوازیں نکال کر ہنسنے لگی۔ دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نے کمرے سے باہر آکر شمشاد بیگم کو مشورہ دیا کہ مہ جبین کو بلّے اور بلیوں سے دور رکھا جائے۔ ہوسکے تو اسے شہر سے

دور لے جائیں اور کبھی اسے تنہا نہ چھوڑیں۔ اگر وہ بلیوں جیسی حرکت کرے تو اسے نرمی سے سمجھا دیا جائے کہ وہ عورت ہے بلی کبھی نہیں بن سکتی۔

مہ جبین کے بھائیوں نے گھر پہنچتے ہی بلّے کو مار بھگایا۔ مہ جبین اپنے بھائیوں کو بلی کی طرح نوچتی کھسوٹتی رہی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ دوسری صبح انہوں نے شہر سے دور جانے کا پروگرام بنایا۔ آدھی رات کے بعد مہ جبین بلّے کی تلاش میں پائیں باغ کی طرف گئی۔ اس کے بھائی اس کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے پائیں باغ میں اس اجنبی نوجوان کو دیکھا جسے بوڑھا ڈرائیور دیکھ چکا تھا۔ وہ سب اس نوجوان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ قد آور اجنبی چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اُس نے ذرا سی دیر میں اس کے بھائیوں کی اچھی طرح مرمت کر دی۔ چیخ وپکار سن کر تمام ملازم وہاں پہنچ گئے۔ دشمنوں کی تعداد بڑھتے دیکھ کر وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ دوسری صبح شمشاد بائی اس نوجوان کی شکایت کرنے تھانے پہنچ گئی‘‘۔ اتنا کہہ کر انسپکٹر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے کہا۔ ’’شمشاد بیگم کی شکایات سن کر میں نے اُس سے پوچھا۔ کیا مہ جبین کی گردن پر زخم کا نشان ہے؟‘‘

شمشاد بیگم نے جواب دیا۔ ’’پہلی بار میں نے اس کے داہنے جبڑے کے نیچے زخم دیکھا تھا۔ اس کے بعد پھر وہاں زخم نظر نہیں آیا۔ پھر ایک دن دوپہر کو وہ اپنے پلنگ پر اوندھے منہ سو رہی تھی۔ اس کے بال تکیئے پر پھیلے ہوئے تھے۔ تب میں نے اس کی گردن کی پشت پر تازہ زخم دیکھا۔ وہ اجنبی کوئی درندہ ہے۔ میری بیٹی کا خون چوستا ہے۔ میں اسے کیا الزام دوں۔ اپنا ہی سکہ کھوٹا ہے۔ مہ جبین خون کی کمی پوری کرنے کے لئے روزانہ تازہ پھل، میوے، دودھ، دہی، مکھن اور گوشت اور کھانے کی ہر وہ چیز استعمال کرتی ہے جس میں زیادہ غذائیت ہوتی ہے اور خون بڑھتا ہے۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ وہ لڑکی ایک درندے کے لئے اپنے جسم میں خون کی مقدار بڑھاتی رہتی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’وہ درندہ نہیں ہے، ایک دماغی مریض ہے ایسا ہی ایک کیس شیام نگر میں ہو چکا ہے۔ اسے پاگل خانہ بھیج دیا گیا تھا۔ چھ ماہ پہلے وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اُسے تلاش کرنے کے لئے اس کی تصویریں تمام تھانوں میں بھیج دی گئی ہیں۔‘‘

میں نے ایک فائل سے اس کی تصویر نکال کر شمشاد بیگم کو دکھائی۔ اس کے بیٹوں نے پہچان لیا کہ وہ وہی نوجوان ہے جو مہ جبین سے پچھلی رات ملنے آیا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ گھر کی چار دیواری میں مہ جبین کی کڑی نگرانی کریں لیکن باہر گھومنے پھرنے کی

آزادی دے دیں۔ وہ اجنبی باہر کی آزاد فضا میں جب اس سے ملنے آئے گا میں اسے گرفتار کر لوں گا۔‘‘

پھر ایسا ہی ہُوا۔ دوسرے ہی دن وہ نیشنل پارک میں مہ جبین سے ملنے آیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اسے گرفتار کر کے شیام نگر پاگل خانے میں پہنچا دیا۔ اس کی ایک تصویر کریم آباد کے تھانے میں بھی گئی تھی۔ وہاں سے ایک بوڑھا تھانیدار پچاس برس پرانا ریکارڈ لے کر آیا۔ اس ریکارڈ میں اسی نوجوان کے ایک ہم شکل کی تصویر تھی۔

یہ مسئلہ ابھی تک حل نہ ہو سکا کہ وہ دو مختلف شخصیتیں ہیں یا ایک ہی شخص ہے جو نصف صدی سے جوانی کی عمر گزارتا آ رہا ہے۔ ان دونوں میں جو باتیں مشترک ہیں وہ ہیں۔ کسی کی تلاش اور کالے بلّے کی موجودگی۔ کلیم صاحب! آپ کی صاحبزادی کے کمرے میں کالے بلّے کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ پاگل یہاں آتا ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو آپ ابھی اُس کمرے میں جائیں اور اپنی صاحبزادی کی گردن کی پشت کو ایک نظر دیکھیں، آپ کو ثبوت مل جائے گا۔‘‘

کلیم احمد نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ’’آپ بھی میرے ساتھ آئیں۔ مجھے اب کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُس بلّے کو شوٹ کر دوں گا۔‘‘

وہ دونوں ڈرائنگ روم سے نکل کر کاریڈور میں آئے۔ کاریڈور کے دوسری طرف سمیرا کا کمرہ تھا۔ اس وقت اس کمرے کا دروازہ توقع کے خلاف کھلا ہُوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے پر آئے۔ پھر ٹھٹک کر کمرے کے اندر دیکھنے لگے۔

وہاں سمیرا نہیں تھی۔ بلا بھی نہیں تھا۔ واجد ایک کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ منہ پر ایک پٹی چپکی ہوئی تھی اور وہ پورا زور صرف کرتے ہوئے رسیاں توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کے قریب آئے انسپکٹر رسیاں کھولنے لگا۔ کلیم احمد نے اس کے منہ پر سے رسی ہٹائی اور اس نے کہا۔ ’’انکل! وہ ایک اجنبی کے ساتھ بھاگ رہی ہے۔ آپ لوگ ڈرائنگ روم میں تھے، بھاگنے کا راستہ نہ تھا اس لئے وہ دونوں چھت کی طرف گئے ہیں۔‘‘

انسپکٹر کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔ ’’کلیم صاحب! جلدی آیئے۔ مجھے چھت پر

جانے کا راستہ بتایئے۔''

کلیم احمد اور واجد، انسپکٹر کے ساتھ دوڑتے ہوئے زینے کی طرف جانے لگے۔ واجد ڈینگیں مار رہا تھا کہ اس نے بڑی دلیری سے اجنبی کا مقابلہ کیا تھا اور سمیرا کو فرار ہونے سے روک رہا تھا مگر اجنبی دھوکے سے اُسے باندھ کر چلا گیا۔ انسپکٹر جانتا تھا کہ دیوہیکل اجنبی کے سامنے واجد بچہ ہے۔ وہ ایک ہی ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ کر اسے رسیوں سے باندھ کر چلا گیا ہوگا۔

وہ واجد کی بکواس سنتے ہوئے چھت پر آئے۔ مرزا صاحب کے مکان کی چھت سے اس چھت کی منڈیر تک لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہُوا تھا۔ وہ اجنبی سمیرا کو دونوں بازوؤں میں اٹھائے اُس تختے پر چل رہا تھا کلیم احمد کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اگر اجنبی کے قدم ذرا بھی ڈگمگاتے تو اس کے ساتھ سمیرا بھی بلندی سے گہری پستی میں چلی جاتی۔ دونوں کی ہڈیاں پسلیاں چُور ہو جاتیں۔ انسپکٹر نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا لیکن خاموش کھڑا تھا۔ اگر وہ للکارتا تو اجنبی کے قدم لڑکھڑا جاتے۔ اس لئے وہ چپ چاپ اس پاگل کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دونوں بخیریت مرزا صاحب کی چھت پر پہنچ گئے اور سمیرا اس کے بازوؤں سے اتر گئی تو انسپکٹر للکارتے ہوئے منڈیر کے قریب آیا۔

''خبردار، بھاگنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ گولی ماردوں گا۔''

اجنبی جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ البتہ سمیرا اس کے سامنے ڈھال بن کر آ گئی اور چیخنے لگی۔ ''نہیں! تم اسے نہیں مار سکتے، میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ یہ مجھے بھگا کر نہیں لے جا رہا ہے یہ مجرم نہیں ہے۔ تم اس پر گولی نہیں چلا سکتے۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ خطرناک مجرم ہے، تم نہیں جانتیں۔ یہ اب تک دو لڑکیوں کو برباد کر چکا ہے۔ تیسری تم ہو۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے اس نے کیا گل کھلائے ہیں۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔''

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر سینہ تانے کھڑی رہی۔ اجنبی اچانک بیٹھ گیا۔ منڈیر کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔ ''تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکو گے، خیریت چاہتے ہو تو سامنے آجاؤ.........''

انسپکٹر کی دھمکی کا اثر نہ ہُوا۔ وہ سامنے نہیں آیا۔ سمیرا ایک بیک قہقہے لگانے لگی۔ ''انسپکٹر! اب جتنی گولیاں چلانا چاہو چلاؤ۔ وہ جا چکا ہے۔ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔'' وہ

کہہ رہی تھی اور جھوم جھوم کر قہقہے لگا رہی تھی۔

انسپکٹر تھوڑی دیر تک اجنبی کو آوازیں دیتا رہا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ منڈیر پر چڑھ گیا۔ پھر لکڑی کے تختے پر چلتا ہُوا دوسری چھت پر سمیرا کے پاس آ گیا۔ وہاں سمیرا کا ایک ہینڈ بیگ اور سوٹ کیس رکھا ہُوا تھا۔ بھاگنے کی مکمل تیاری تھی مگر بھاگنے والا ساتھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ہاتھ میں ریوالور لئے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھلی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس اجنبی کے لئے کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ پھر بھی وہ نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا یا غائب ہو گیا تھا۔

اسی وقت چھت کے ایک دور افتادہ گوشے سے ایک سایہ اچھل کر منڈیر پر آیا۔ پھر اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ سوچتا، کچھ سمجھتا اُس نے پلٹ کر اپنی ریڈیم ڈائل جیسی آنکھوں سے اپنی سمی کو دیکھا۔ پھر چھلانگ لگا کر دوسری چھت پر چلا گیا۔ دوسری چھت سے تیسری چھت پر۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

☆======☆======☆

انسپکٹر کا نظریہ بدل گیا۔ اجنبی اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہُوا تھا جسے عقل تسلیم نہیں کرتی، وہ واقعہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اجنبی کو منڈیر کے پیچھے چھپتے اور بلّے کو اچھل کر منڈیر پر آتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اگر سمجھ میں آجاتا تو وہ بلّے کو کبھی اتنی آسانی سے بھاگنے نہ دیتا۔ بہرحال اب اسے محض ایک پاگل کی نہیں، سیاہ بلّے کی بھی تلاش تھی۔

سمیرا کی ممی نے جو کہانی سنائی تھی وہ اپنی ہی آپ بیتی بن گئی تھی۔ پچاس برس پہلے کا پُراسرار اجنبی اس کی ننھیال سے چلتا ہُوا اس کی بیٹی کی خوابگاہ تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بلا جوان لڑکی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ سب ہی کے دلوں پر دہشت طاری ہوگئی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے یہ سوچ کر کلیجہ کانپ جاتا تھا کہ وہ بلا اچانک ہی کہیں سے آئے گا اور ان کی گردنوں پر سوار ہو کر سارا خون چوس لے گا۔

سمیرا پر کڑی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ اس کی خوابگاہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا جاتا تھا۔ دن کو گھر کی عورتیں اس کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رات کو ایک لیڈی کانسٹیبل اس کی خواب گاہ میں جاگتی رہتی تھی۔ انسپکٹر کو یقین تھا کہ وہ بلا اپنی سمی کے پاس ضرور آئے گا۔

سمیرا گھر والوں کی لعن طعن سننے کے باوجود اُس کا انتظار کر رہی تھی اور اپنے اطراف اتنا سخت پہرا دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ اپنی ممی اور آنٹی سے لڑتی جھگڑتی تھی، کبھی لیڈی کانسٹیبل کو برا بھلا کہتی تھی اور کبھی کھانے کی پلیٹیں اُٹھا کر پھینک دیتی تھی۔ ایک ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کی گئیں، اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہُوا۔ وہ میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اِدھر سے اُدھر جاتی تھی۔ بلی کی طرح کھانے کے برتن میں منہ ڈال کر کھاتی تھی۔ گھر والے سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ کہتی۔

''ذرا ہاتھ لگا کر دیکھنا۔ اب میری دُم نکلنے والی ہے۔ پھر میں پوری بلی بن جاؤں گی۔''

اس سے سب ہی عاجز آ گئے تھے۔ ایک دن وہ دیوانہ وار بلے کو پکارتی ہوئی باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ واجد نے اسے پکڑ لیا وہ اسے مارنے اور ناخنوں سے نوچنے کھسوٹنے لگی۔ اس کی ممی اور آنٹی نے بھی اسے پکڑنا چاہا۔ وہ ان پر بھی جھپٹنے اور پنجے مارنے لگی۔ بڑی دیر تک وہ ان سے لڑتی رہی، چیختی چلاتی رہی۔ پھر چکرا کر گر پڑی۔

واجد اسے اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا گیا۔ اس کے ڈیڈی وغیرہ کو بھی اطلاع دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے آ کر اس کا معائنہ کیا۔ ایک انجکشن لگایا۔ کچھ دوائیں لکھ کر دیں پھر یہ خبر سنائی کہ سمیرا ماں بننے والی ہے۔

یہ خبر ایک دھماکے کی طرح کانوں میں گونجی۔ ابھی تک سمیرا اور اجنبی کے تعلقات کا علم صرف گھر والوں کو تھا یا تھانے والوں کو۔ انسپکٹر نے کلیم احمد کو یقین دلایا تھا کہ وہ انہیں بدنامی سے بچائے گا مگر اب وہ آنے جانے والے رشتہ داروں سے کنواری ماں کا پیٹ نہیں چھپا سکتے تھے۔

اس کی ممی نے مشورہ دیا کہ حمل ضائع کر دیا جائے مگر سمیرا اڑ گئی کہ محبت کی نشانی کو ضائع نہیں کرے گی۔ ماں نے اسے مارا پیٹا، باپ نے زہر کھا کر مر جانے کی دھمکی دی۔ اگر وہ صحیح الدماغ ہوتی تو اس پر مار پیٹ اور دھمکیوں کا اثر ہوتا۔ شام کو لیڈی کانسٹیبل اور انسپکٹر آئے تو انہیں بھی پتہ چل گیا کہ سمیرا کے پاؤں بھاری ہیں۔ حمل ضائع کرنا غیر قانونی فعل ہے لہٰذا قانون نے بھی سمیرا کی حمایت کی۔ البتہ انہیں مشورہ دیا کہ بدنامی سے بچنے کی خاطر وہ کچھ عرصہ کے لئے ایسی جگہ چلے جائیں جہاں انہیں کوئی جانتا نہ ہو۔

انسپکٹر نے یہ سوچ کر مشورہ دیا تھا کہ سمیرا گھر کی چار دیواری سے باہر نکلے گی تو وہ بلایا

پاگل اجنبی اس سے ضرور ملنے کی کوشش کرے گا۔ گھر والوں نے بھی سوچا کہ اس ماحول سے دور آب و ہوا کی تبدیلی سے سمیرا کے ذہن پر اچھا اثر پڑے گا اور وہ بدنامی سے بھی بچے رہیں گے۔

وہ دوسرے ہی دن ایک پہاڑی مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرین کے ذریعے ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ انسپکٹر بھی ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ سفر کے دوران بلا نظر نہیں آیا۔ رات کو واجد اور انسپکٹر اسٹیشن پر اتر گئے۔ وہاں سے ٹیکسیوں میں بیٹھ کر نصیر آباد پہنچ گئے۔ انہیں کسی حد تک اطمینان ہو گیا تھا کہ بلا سینکڑوں میل پیچھے رہ گیا ہے۔ اب وہ سمیرا تک نہیں پہنچ سکے گا۔ وہاں انہوں نے آٹھ ماہ کے لئے ایک کاٹج کرائے پر حاصل کر لیا۔ انسپکٹر انہیں کاٹج میں چھوڑ کر پولیس اسٹیشن گیا۔ وہاں کے پولیس انسپکٹر سے ملاقات کی اور پاگل اجنبی کی فائل اس کے سامنے رکھ کر اسے تمام تفصیلات بتانے لگا۔

نصیر آباد کا بوڑھا انسپکٹر رحمان علی ذہین اور تجربہ کار تھا اس نے فائل کا مطالعہ کیا۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان انسپکٹر کی باتیں سنیں۔ پھر سر ہلا کر کہنے لگا۔

''بعض اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ اس فائل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پچاس برس سے جوانی کی عمر گزارتا چلا آ رہا ہے۔ پھر آپ نے بھی اُسے آدمی سے بلے کے روپ میں آتے دیکھا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، میں اس لڑکی کی پوری طرح حفاظت کروں گا۔''

''ایک بات اور ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''وہ لڑکی حاملہ ہے۔''

''حاملہ ہے؟'' انسپکٹر رحمان علی نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُس ہونے والے بچے کا باپ وہ بلا یا پاگل اجنبی ہے؟''

''جی ہاں۔ پچھلے تین ماہ سے اس بلے کے سوا کوئی دوسرا شخص اس لڑکی کے قریب نہیں گیا۔ ہم نہیں جانتے کہ حقیقتاً اس کا وجود انسانی ہے یا حیوانی لیکن یہ یقین سے کہتے ہیں کہ وہ اسی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

رحمان علی نے ایک سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے کش لیتا ہُوا سوچنے لگا۔ پھر اُس نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہوں! اگر وہ ماں بننے والی ہے تو وہ پاگل ضرور اس کے پاس آئے گا۔ آپ اس شہر سے جلد ہی واپس چلے جائیں۔ وہ آپ کو پہچانتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بدک کر واپس چلا جائے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آئے۔ پھر جیپ میں بیٹھ کر کاٹیج پہنچ گئے۔ رحمان علی نے کلیم احمد سے ملاقات کی اسے یقین دلایا کہ وہ سمیرا کو بلے کے آسیب سے بچالے گا۔ پھر اس نے مشورہ دیا کہ سمیرا پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سونا چاہے تو کوئی اعتراض نہ کرے۔ اگر وہ تنہا تفریح کے لئے نکلے تو اسے کوئی نہ روکے۔ پولیس کے آدمی سادہ لباس میں اس کی حفاظت کریں گے۔

دوسرے دن انسپکٹر واپس چلا گیا۔ رحمان علی نے ایک میٹرنٹی ہوم میں سمیرا کا نام درج کرایا اور لیڈی ڈاکٹر کو سمجھا دیا کہ یہ ایک پولیس کیس ہے۔ سمیرا کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے اور پولیس کی طرف سے جو ہدایتیں ملیں ان پر فوراً عمل کیا جائے۔

☆======☆======☆

رحمان علی کی بدولت سمیرا آزاد ہوگئی۔ وہ ہر رات اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتی تھی اور رات گئے تک بستر پر کروٹیں بدل بدل کر روشن دان کی جانب دیکھتی رہتی تھی۔ دن کو کاٹیج کے باہر جاتی تھی۔ کلیم احمد اور واجد اس کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ وہ تنہا دور تک اونچے نیچے راستوں میں بھٹکتی رہتی تھی لیکن دور دور تک اس کا پاگل محبوب یا کوئی سیاہ رنگ کا بلا نظر نہیں آتا تھا۔

دو ماہ گزر گئے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے برف پگھلنے لگی۔ میدانی علاقوں سے لوگ گرمیاں گزارنے کیلئے وہاں آنے لگے۔ نصیر آباد کی رونق بڑھ گئی تھی۔ ہر روز نئے نئے چہرے نظر آتے تھے۔ کاٹجوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں رنگین آنچل لہراتے تھے اور سریلے قہقہے گونجتے رہتے تھے لیکن سمیرا کے دل و دماغ پر اداسی مسلط تھی۔ وہاں سب آرہے تھے۔ وہ نہیں آرہا تھا۔

دو ماہ اور گزر گئے۔ اب وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے لگی تھی لیکن پیٹ چھپائے نہیں چھپتا تھا۔ وہ ایک نئے وجود کا بوجھ اٹھائے تھوڑی دور تک چلتی تھی اور تھک کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دن وہ اسی طرح ایک کاٹیج کے سامنے تھک کر بیٹھ گئی۔ اس کے ایک طرف کاٹیج تھا، دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانے پر آگئے تھے۔ گردن کی پشت ننگی ہوگئی تھی۔ وہ بلے کو یاد کر رہی تھی اور ایک ہاتھ سے گردن کی پشت کو سہلا رہی تھی۔ وہاں جو زخم تھا، وہ بھر گیا تھا۔ مگر اس زخم کا نشان دور سے بھی نظر آتا تھا۔

تھوڑی دیر اسے اپنے پیچھے غراہٹ سی سنائی دی جیسے کوئی بلی غرا رہی ہو۔ اُس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے غرا کر پوچھا۔

''کون ہو تم؟ تمہاری گردن پر یہ نشان کیسا ہے؟''

سمیرا نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''یہ پیار کی نشانی ہے۔ تم کون ہو، اپنا نام بتاؤ؟''

''میرا نام سمی ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

سمیرا اچھل کر کھڑی ہوگئی اور اچانک غرا کر بولی۔ ''تم جھوٹ بولتی ہو، میرا نام سمی ہے۔''

''جھوٹی ہو تم! تمہاری ماں۔ تمہارا باپ۔ سمی میرا نام ہے۔ صرف میں اُس کی سمی ہوں۔'' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر پنجے مارنے کے لئے آگے بڑھی۔

سمیرا نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئیں، ایک دوسرے کو پنجے مارنے لگیں۔ ان کے لڑنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دو بلیاں ایک دوسرے پر جھپٹ رہی ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے بال پکڑ کر جھٹکے دے رہی تھیں۔ اسی وقت سامنے کے ایک کاٹج سے ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان مرد دوڑتے ہوئے اور اس لڑکی کو پکارتے ہوئے آگئے۔

''مہ جبین! یہ کیا کر رہی ہو۔ چھوڑ دو اسے۔ کیوں اس سے جھگڑا کر رہی ہو؟''

نوجوان نے قریب آ کر مہ جبین کو پکڑ لیا۔ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

''بھائی جان! یہ جھوٹی ہے۔ اپنا نام سمی بتاتی ہے۔''

شمشاد بیگم نے کہا۔ ''اس کا نام سمی ہو گا۔ جبھی اپنا نام سمی بتا رہی ہے۔ یہ تمہاری طرح پاگل نہیں ہے۔ چلو کاٹج میں جاؤ۔'' اس کا بھائی اسے پکڑ کر کاٹج میں لے گیا۔ شمشاد بیگم نے سمیرا سے کہا۔

''معاف کرنا بیٹی۔ یہ لڑکی کبھی کبھی بہک جاتی ہے۔ یوں ہی پاگلوں جیسی حرکتیں کرتی ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے پر ہم آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے اسے یہاں لائے ہیں۔''

شمشاد بیگم بہت کچھ کہہ رہی تھی لیکن سمیرا نہیں سن رہی تھی۔ وہ مہ جبین کو کاٹج کے برآمدے میں دیکھ رہی تھی۔ لڑائی کے دوران اس نے مہ جبین کے بالوں کو ایک بار زور سے جھٹکا دیا تھا۔ تب اس کی گردن ننگی ہوگئی تھی اور تب اُس نے ایک تازہ زخم دیکھا تھا۔ سمیرا کو زخم کی پہچان تھی اور مہ جبین کی گردن کا زخم بتا رہا تھا کہ بلا اس کے ساتھ پچھلی رات گزار کر گیا ہے۔

اُس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ غصہ اس بات کا تھا کہ بلے نے دوسری لڑکی کو سمی بنا لیا ہے اور اسے بھول گیا ہے۔ وہ شمشاد بیگم کو نظر انداز کر کے اپنے کاٹج کی طرف چلی گئی۔

عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے مگر سوکن کا وجود برداشت نہیں کرتی۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ پھر مہ جبین کے کاٹج کے قریب آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ بلا اس کی سوکن سے ضرور

ملنے آئے گا۔''

اور وہ آ گیا۔

اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ انسان کے روپ میں تھا اور کاٹج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سمیرا اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''سمی تم؟ تم یہاں............؟'' اس نے حیرانی سے کہا اور خوش ہو کر اپنے بازو پھیلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

سمیرا پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''بس۔ مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ تم ہرجائی ہو۔ تم نے مجھے بھلا کر اس کاٹج والی کو اپنی سمی بنا لیا ہے۔''

''میں تمہیں نہیں بھلا سکتا۔ تم میری مجبوریوں کو سمجھو وہاں تمہارے چاروں طرف اتنا سخت پہرا تھا کہ میں تمہارے پاس نہیں آ سکتا تھا مگر میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا ہوں، تم سے ملنے کے لئے بے چین رہتا ہوں۔''

''یہ بے چینی اب وہ کاٹج والی دور کر رہی ہے۔''

''تم طعنے نہ دو۔'' اُس نے غرا کر کہا اور اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اتنے دنوں کی جدائی کے بعد وہ آغوش ملتے ہی سمیرا پگھل گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ تم عورت نہیں ہو، بلی ہو۔ عورت یہ سوچتی ہے کہ مرد دوسری کے پاس کیوں گیا۔ بلیاں نہیں سوچتیں۔ تم بھی نہیں سوچو گی۔ بولو، تم بلی ہو، میری سمی ہو۔''

''ہاں۔ میں بلی ہوں۔ تمہاری سمی ہوں۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

''سچ؟'' اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ہاں۔ تین ماہ کے بعد تمہاری محبت کی نشانی میری گود میں کھیلے گی۔''

اجنبی کی آنکھیں خوشی سے کچھ اور زیادہ چمکنے لگیں۔ وہ محبت سے اسے سونگھنے لگا۔ ''تم واقعی سمی ہو۔ میری سمی ہی میرے بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔ میرے دل میں تمہاری محبت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اب میں تم سے ملنے آیا کروں گا۔ یہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا ہے۔ ہاں، مگر تمہارے گھر والے جانتے ہیں۔''

''تم ان کی پرواہ نہ کرو۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتی ہوں۔ تم روشندان سے آ سکتے ہو۔''

‘‘اچھا۔ میں آؤں گا۔ مگر یاد رکھو کہ تم بلی ہو اور مجھے دوسری بلی کے پاس جانے سے نہیں روکو گی۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ ابھی مجھ سے زیادہ اس بچے کو تمہارے خون کی ضرورت ہے۔’’

‘‘اچھا۔ میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گی۔ مگر تم میرے پاس روز آؤ گے نا؟’’

‘‘ہاں۔ روز آیا کروں گا۔ تم میرے ہونے والے بچے کی ماں ہو۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم جاؤ۔ میں آدھی رات کے بعد آؤں گا۔’’

وہ تھوڑی دور تک اسے چھوڑنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

پندرہ منٹ کے بعد رحمان علی کا اسسٹنٹ اس کے دفتر میں سمیرا کے متعلق رپورٹ سنا رہا تھا کہ وہ کہاں کہاں گئی اور کس سے ملتی رہی۔ ملنے والوں میں وہ پاگل اجنبی بھی تھا جس کی تصویر اور مکمل ہسٹری ایک فائل کی صورت میں میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے رپورٹ سنانے کے بعد کہا۔ ‘‘جناب! میں آپ کے حکم سے مجبور تھا۔ ورنہ وہ پاگل مجرم مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی سے اسے گرفتار کر سکتا تھا۔’’

‘‘ہوں!’’ رحمان علی نے کہا۔ ‘‘تم اسے گرفتار کرنے کے بعد کیا کرتے؟ جیل خانے یا پاگل خانے بھیج دیتے۔ پچھلے پچاس برسوں میں ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ وہ ہمیشہ فرار ہو جاتا ہے۔ تم اسے گرفتار کرو گے تو پھر یہی ہوگا اور ہمیں اوپر سے کوئی ایسا حکم نہیں ملا ہے کہ ہم اسے شوٹ کر دیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔ تب ہی یہ برسوں پرانا قصہ تمام ہوگا۔’’

‘‘تو پھر آپ مجھے اجازت دیں، میں ایک ہی گولی میں قصہ تمام کر دوں گا۔’’

رحمان علی نے سر ہلا کر کہا۔ ‘‘تمہارا نشانہ سچا ہے لیکن نشانہ اگر چُوک گیا تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اسے ایسی جگہ گھیرنا ہوگا جہاں سے وہ نکل نہ سکے اور جہاں ہم اسے نہ ماریں، وہ خود ہی موت کے منہ میں چلا جائے۔’’

اس کے اسسٹنٹ نے حیرت سے پوچھا۔ ‘‘یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ کیسے مرے گا؟’’

اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ پھر ایک کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ‘‘سمیرا اسے مارے گی۔’’

☆======☆======☆

جس کمرے میں سمیرا کی زچگی ہوئی اس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ میٹرنٹی

ہوم کی لیڈی ڈاکٹر بوکھلائی ہوئی تھی۔ اُس نے وہاں کام کرنے والی آیاؤں کو اُس کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا اور وہ بڑی بے چینی سے انسپکٹر رحمان علی کا انتظار کر رہی تھی۔

رحمان علی، لیڈی ڈاکٹر کا فون ریسیو کرنے کے پندرہ منٹ بعد ہی وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔ ‘‘کیا بات ہے؟ آپ فون پر گھبرائی ہوئی تھیں۔’’

‘‘جی! جی ہاں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کیا آپ بتائیں گے کہ بچے کا باپ کون ہے۔’’

رحمان علی نے جواب دیا۔ ‘‘باپ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ پولیس کیس ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو بتائی نہیں جا سکتیں۔ مگر آپ یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟’’

‘‘جی! میں کیا بتاؤں۔ آپ چل کر دیکھ لیجئے۔ وہ بچہ عجیب الخلقت ہے۔ سر بلی کا ہے اور دھڑ انسان کا........’’

رحمان علی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

بلا اور سمیرا! حیوان اور انسان۔ وہ اجنبی بلا بھی تھا اور انسان بھی۔ سمیرا عورت بھی تھی اور ذہنی طور سے بلی بھی۔ لہٰذا وہ بچہ دوغلی نسل کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

رحمان علی نے پوچھا۔ ‘‘وہ بچہ زندہ ہے؟’’

‘‘ہاں! جب میں نے اسے پالنے میں ڈالا تو وہ زندہ تھا۔ اب نہیں کہہ سکتی۔ کیا پوزیشن ہے۔’’

‘‘اچھا! میں جا کر دیکھتا ہوں۔ ضرورت ہوئی تو آپ کو بلا لوں گا۔’’

وہ سمیرا کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اُس نے رسٹ واچ کو دیکھا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ وہ اجنبی اپنے بچے کے لئے کسی وقت بھی سمیرا کے پاس آ سکتا تھا۔ رحمان علی دروازہ کھول کر کمرے میں آ گیا۔ سمیرا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

‘‘بیٹی! تم نے مجھے پہچانا؟ میں ایک بار تمہارے کالج میں آیا تھا۔ تمہارے ڈیڈی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔’’

سمیرا نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ‘‘مجھے یاد نہیں ہے۔ میرا حافظہ کمزور ہو گیا ہے۔’’

رحمان علی نے پالنے کے پاس آ کر بچے کو دیکھا۔ ‘‘آدھی بلی، آدھا انسان۔ اُس نے سمیرا سے پوچھا۔ ‘‘یہ بچہ تمہیں پسند ہے؟’’

‘‘یہ میرا بچہ ہے اور آپ مجھ سے ہی میری پسند پوچھ رہے ہیں۔ یہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔’’

''ہاں! بچہ کیسا ہی ہو۔ ایک ماں اسے اپنی بہترین تخلیق سمجھتی ہے اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بچے پر جھک گیا اور اسے چھو کر دیکھنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں خاموش تھیں۔ وہ ساکن اور سرد ہو چکا تھا۔ رحمان علی نے چور نظروں سے سمیرا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ممتا کا نور تھا۔ وہ فخر سے مسکرا رہی تھی کہ اس کے ڈیڈی کا ایک دوست اس کی تخلیق کو چھو کر دیکھ رہا ہے۔ رحمان علی نے اسے نہیں بتایا کہ بچہ مر چکا ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ بہت حسین ہے۔ کیوں نہ ہو۔ حسین عورت کی تخلیق حسین ہوتی ہے۔ یہ نہایت ہی سکون سے سو رہا ہے۔ تم ابھی اسے پیار نہ کرنا۔ اسے ہاتھ لگاؤ گی تو نیند میں خلل پڑے گا۔ بچوں کو زیادہ سے زیادہ سونے کا موقع دینا چاہئے۔''

''اچھی بات ہے۔'' وہ پالنے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''جب تک یہ سوتا رہے گا۔ میں اسے دور ہی دور سے دیکھ کر خوش ہوتی رہوں گی۔''

اتنے میں ایک لیڈی کانسٹیبل سادہ لباس میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لانبا سا چاقو تھا۔ رحمان علی نے انجان بن کر پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

''میں یہاں آیا کا کام کرتی ہوں۔ یہاں یہ چاقو رکھنے کے لئے آئی ہوں۔''

''اس چاقو کی کیا ضرورت ہے؟'' رحمان علی نے پوچھا۔

لیڈی کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''جناب! یہ ایک قسم کا ٹوٹکا ہے۔ زچہ اور بچہ کے پاس لوہے کا ٹکڑا یا لوہے کی کوئی چیز رکھی جاتی ہے۔ اس سے ہزار بلائیں کٹ جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں اپنے سرہانے چاقو رکھتی ہیں۔ صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ لوہا زچہ اور بچے کی حفاظت کرتا ہے اور بلاؤں کو قریب آنے سے روکتا ہے۔''

رحمان علی نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں! مجھے یاد آیا۔ میری گھر والی بھی یہی کرتی ہے۔ بیٹی! تم بھی یہ چاقو اپنے پاس رکھو۔ اللہ نے چاہا تو تمہارا یہ بچہ ہر بلا سے محفوظ رہے گا۔''

سمیرا نے چاقو لے کر کہا۔ ''آپ لوگ کتنے اچھے ہیں۔ میرے بچے کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کی یہ محبت اور یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

''احسان کی کیا بات ہے۔ تم میری بیٹی ہو۔ تمہاری اور اس بچے کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اب تم آرام کرو۔ میں جاتا ہوں۔''

وہ باہر چلا گیا۔ لیڈی کانسٹیبل نے سمیرا کو بتایا کہ چاقو تکیے کے نیچے رکھا جاتا ہے۔

سمیرا نے اسے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ لیڈی کانسٹیبل بھی باہر آ گئی اور دروازے کو باہر سے بند کرنے لگی۔ رحمان علی نے قریب آ کر کہا۔ ''تم اسی جگہ رہنا۔ اگر کمرے کے اندر کوئی ہنگامہ ہو تو کسی کو اندر نہ جانے دینا۔''

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں آیا۔ دوسری طرف سمیرا کا کمرہ تھا۔ دونوں کے درمیان ایک کھڑکی کھلتی تھی جو اس وقت مصلحتاً بند رکھی گئی تھی۔ رحمان علی نے جیب سے ریوالور نکال کر اُسے چیک کیا۔ کمرے کی لائٹ آف کی اور اندھیرے میں چلتا ہُوا کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

افسرانِ اعلیٰ کی طرف سے اُس پاگل کو گولی مارنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا اس لئے وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف سمیرا کی حفاظت کرنا چاہتا تھا حالانکہ سمیرا کو بظاہر اس بلے سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ مگر وہ بوڑھا خرانٹ پولیس انسپکٹر بہت دور تک سوچنے، دیکھنے اور عمل کرنے کا عادی تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوسرے کمرے سے ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ رحمان علی نے ہولے سے کھڑکی کی چٹخنی گرائی اور ایک پٹ کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ دوسرے کمرے کے روشندان میں سیاہ بلا نظر آ رہا تھا۔ سمیرا ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی تھی۔

''تم آ گئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ یہاں آؤ، دیکھو یہ ہمارا بچہ ہے۔ کتنا خوبصورت ہے۔ مگر ابھی اسے پیار نہ کرنا۔ یہ ابھی سو رہا ہے۔''

بلا اپنی چمکیلی آنکھوں سے بچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمیرا کے پاس آنے کی بجائے اچانک چھلانگ لگا کر پالنے پر آ گیا۔ پھر اُس نے بچے کی گردن کو دانتوں سے دبوچ لیا۔

سمیرا نے چیخ کر کہا۔ ''کیا کرتے ہو۔ اُسے دانتوں سے نہ پکڑو۔ تم انسان کیوں نہیں بنتے؟ میں آج تک تمہارے لئے بلی بنتی رہی۔ آج تم میرے بچے کے لئے انسان بنو۔ دانتوں سے نہ پکڑو، اسے ہاتھوں سے اٹھا کر سینے سے لگاؤ.........''

یہ کہتے کہتے اُس نے ایک چیخ ماری، بچے کی گردن سے لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ بستر سے اچھل کر پالنے کے قریب آئی اور بلے کی گردن پکڑ کر اسے جھنجھوڑنے لگی۔

بلے نے بچے کو چھوڑ کر اُس پر حملہ کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے لگے۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

''کمینے! بدذات۔ اب میں سمجھ گئی کہ تو بچے کا انتظار کیوں کر رہا تھا۔ تو اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ آخر ہے ناں، بلا۔ اپنے ہی بچے کو کھانے والا۔ مگر اب میں تجھے اپنے بچے کے پاس نہیں جانے دوں گی۔ تو میرا خون پیتا آیا ہے مگر میرے بچے کا خون نہیں پی سکے گا۔ تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو انسان کے روپ میں آ جا۔ انسان بن جا...........''

لیکن وہ انسان کے روپ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کو کھانے کے لئے آیا تھا اور بلا بن کر ہی اپنے فطری تقاضے کو پورا کر سکتا تھا۔ وہ سمیرا کی طرف سے پلٹ کر پھر پالنے پر آیا۔ سمیرا نے پلٹ کر تکیے کے نیچے سے اس کھلے ہوئے چاقو کو نکال لیا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے گھوم کر پالنے کے پاس آئی اور پوری قوت سے چاقو کے چمکتے ہوئے پھل کو اس کے سیاہ جسم میں پیوست کر دیا۔

چاقو دوسری بار اُٹھا۔ دوسری بار پیوست ہُوا۔ چاقو، ایک لوہے کا ٹکڑا۔ برسوں پرانا عقیدہ۔ ایک بلا کو کاٹ رہا تھا۔

بلا دم توڑتے ہوئے نقاہت سے غرا رہا تھا۔ گھور کر سمیرا کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ ساکت ہو گیا۔ سمیرا کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر گر پڑا۔ اس نے اپنے مُردہ بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

رحمان علی نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ وہاں سے پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتا ہُوا کمرے سے باہر آیا۔ بند دروازے کے پاس لیڈی ڈاکٹر اور دوسری عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ سمیرا کی چیخ و پکار سن کر وہ سب پریشان نظر آ رہی تھیں۔ رحمان علی نے ریوالور جیب میں رکھا اور سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سب مہربانی کر کے یہاں سے چلی جائیں۔''

لیڈی کانسٹیبل نے کہا۔ ''وہ رو رہی ہے۔ کیا میں اس کے پاس جا سکتی ہوں؟''

''تھوڑی دیر بعد جانا۔ اُسے جی بھر کے رو لینے دو۔ وہ ایک بھٹکی ہوئی محبوبہ کے آنسو نہیں ہیں۔ وہ اپنے عاشق کے لئے نہیں رو رہی ہے۔ وہ ایک ماں ہے اور اپنے بچے کی موت پر آنسو بہا رہی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ بوڑھا خرانٹ پولیس انسپکٹر سگریٹ سلگانے لگا۔

☆===== ختم شد =====☆